

زر کا تحقیقی مطالعہ

شرعی نقطۂ نظر سے

ڈاکٹر مولانا عصمت اللہ صاحب

ادارۃ المعارف کراچی



زر کا تحقیقی مُطالعہ

شرعی نقطۂ نظر سے

ڈاکٹر مولانا عصمت اللہ صاحب

ادارۃ المعارف کراچی

زر کا تحقیقی مطالعہ

شرعی نقطۂ نظر سے

ڈاکٹر مولانا عصمت اللہ صاحب



ادارۃ المعارف کراچی ۱۴

باہتمام : محمد مشتاق شنتی

طبع جدید : رمضان ۱۴۳۰ھ - ستمبر ۲۰۰۹ء

مطبع : شمس پرنٹنگ پریس کراچی

ناشر : اِدَارَۃُ المَعَارِف کراچی ۱۴

ملنے کے پتے :

اِدَارَۃُ المَعَارِف کراچی ۱۴

فون: 021-35049733 ، 021- 35032020

موبائل: 0300 - 2831960

❀ مکتبہ معارف القرآن کراچی ۱۴ ❀ دارالاشاعت، اُردو بازار کراچی

❀ ادارۂ اسلامیات، انارکلی، لاہور

فہرستِ مضامین

باب دوم

عنوان	صفحہ نمبر

عنوان	صفحہ نمبر

عنوان	صفحہ نمبر

باب چہارم
بیعِ صَرف

عنوان	صفحہ نمبر

باب پنجم

عنوان	صفحہ نمبر

عنوان	صفحہ نمبر

باب ششم

قدرِ زَر (Value) ۲۷۲

عنوان	صفحہ نمبر

بابِ ہفتم

عنوان	صفحہ نمبر

بابِ ہشتم

صفحہ نمبر	عنوان

عنوان	صفحہ نمبر

عنوان	صفحہ نمبر



تقریظ

شیخ الاسلام
حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب
دامت برکاتہم

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ، وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ
الْکَرِیْمِ وَعَلٰی آلِہٖ وَصَحْبِہٖ اَجْمَعِیْنَ، وَعَلٰی کُلِّ مَنْ تَبِعَھُمْ
بِاِحْسَانٍ اِلٰی یَوْمِ الدِّیْنِ

عزیز گرامی مولانا عصمت اللہ صاحب کی کتاب ''زر کا تحقیقی مطالعہ'' دراصل اُن کا پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے، اور میری نگرانی میں لکھا گیا ہے۔ مولانا اس کی تالیف کے دوران مجھ سے مشورے بھی کرتے رہے ہیں، اور میں نے اُسے تقریباً باستیعاب دیکھا ہے۔ ماشاء اللہ انہوں نے ''زر'' سے متعلق فقہی مسائل ومباحث کو بہت خوبی سے اس کتاب میں جمع فرمایا ہے، اور پیچیدہ مسائل پر فاضلانہ بحثیں کی ہیں۔ اس موضوع پر کام کرنے کے لئے زر سے متعلق عملی صورتِ حال کو بھی مدِ نظر رکھنا تھا، اور اس سے پیدا ہونے والے مسائل کا خالص فقہی بنیادوں پر جائزہ بھی لینا تھا، ماشاء اللہ فاضل مؤلف نے دونوں پہلوؤں سے پوری احتیاط اور بالغ نظری کے ساتھ تحقیقی کام کیا ہے، اور اُمید ہے کہ اِن شاء اللہ ان کی یہ تالیف اہلِ علم کے لئے نہایت مفید ثابت ہوگی اور تحقیق ونظر کے

دروازے کھولے گی۔

اللہ تعالیٰ ان کی اس محنت کو اپنی بارگاہ میں قبول فرما کر اسے نافع بنائیں، اور یہ ان کے لئے ذخیرۂ آخرت ثابت ہو، آمین، وَمَا تَوْفِيْقِىْ اِلَّا بِاللّٰهِ۔

بندہ

محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۷/رجب ۱۴۳۰ھ

دارالعلوم کراچی ۱۴

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

مقدمہ

موضوع کا تعارف اور اس کی اہمیت

اس میں شک نہیں کہ اسلام ایک عالمگیر اور ہمہ گیر دستورِ حیات ہے، یہ وہ دِین ہے جو ہر زمانے کے حالات اور تقاضوں سے مطابقت رکھتا ہے، اور جملہ شعبہائے زندگی کے اَحکام کو جامع ہے، اور ہر شعبۂ زندگی سے متعلق اسلام میں ہدایات موجود ہیں۔

انسانی معاشرے میں باہمی لین دین (Dealing) کے لئے ''زَر'' (Money) کی حیثیت ریڑھ کی ہڈی کی سی ہے، بلکہ باہمی معاملات کا مدارِ اصلی زَر ہی ہے۔ ''زَر'' کے استعمال کا سلسلہ مختلف شکلوں میں زمانۂ قدیم سے چلا آرہا ہے، اسلام سے قبل بھی، اور اِسلام کے بعد بھی، مختلف ادوار میں زَر کی شکلیں بدلتی رہیں، اور اس کی قدر و قیمت (Value) میں تغیرات اور اُتار چڑھاؤ ہوتا رہا، جس کی وجہ سے زَر کی بہت ساری صورتیں اور قسمیں وجود پذیر ہوئیں، جس کے نتیجے میں بہت سے نت نئے مسائل نے جنم لیا، اور جنم لے رہے ہیں۔

کچھ عرصے سے پورے عالم اور خاص طور پر پاکستان میں ''اِقتصاد'' کو اِسلامی سانچے میں، اور اس کو سود جیسی لعنت سے پاک کرنے کی کوششیں ہورہی ہیں، اور اس سلسلے میں پاکستان کی عدالتِ عالیہ فیصلہ بھی دے چکی ہے۔ جس پر عنقریب عمل درآمد متوقع ہے،

اس سے اس موضوع کی اہمیت ونزاکت اور بڑھ گئی ہے۔

اس موضوع پر اُردو یا انگریزی زبان میں جو کام ہوا ہے، وہ مختصر اور عدمِ جامعیت کی بناء پر نہ ہونے کے برابر ہے، علمائے عرب نے زَر پر اگرچہ خاصا تحقیقی کام کیا ہے، اور اس کے مختلف اَحکام اور اَقسام کو ذِکر کیا ہے، لیکن بہت سارے اَحکام میں ان کی آراء میں اختلافِ رائے پایا جاتا ہے، جس کی وجہ سے حتمی نتائج تک پہنچنا بسا اوقات دُشوار ہو جاتا ہے، اس کے علاوہ زَر کی مختلف صورتوں کے اَحکام منتشر طریقے سے کتابوں میں مذکور ہیں، اور بعض صورتیں ایسی ہیں جو ہنوز تحقیق طلب ہیں، مثلاً: زَر کی حقیقت (Nature)، بونڈز کی مختلف اَقسام کے شرعی اَحکام، مختلف تمسکات کا شرعی جائزہ، بنک چیک کی شرعی حیثیت، اور اس پر قبضے کی شرعی حیثیت، اس زمانے میں اِفراطِ زَر سے پیدا شدہ مسائل کے بارے میں غور اور ان کا شرعی حل، خاص طور جہاں اِفراطِ زَر تقریباً کساد کی حد تک پہنچا ہو، جیسا کہ افغانستان وغیرہ میں یہ مسئلہ درپیش ہے، اور ان جیسے متعدّد مسائل، جیسا کہ آگے تفصیل سے اِن شاء اللہ تعالیٰ اندازہ ہوجائے گا، اس لئے اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ اس موضوع پر ایک ایسا تحقیقی مقالہ لکھا جائے جو قومی زبان میں ہو، اور عام فہم و جامع ہو نیز جن مسائل میں اختلافِ رائے پایا جاتا ہے، قرآن وسنت اور اس سے مستفاد اُصول کی روشنی میں ان کی ترجیح تلاش کی جائے۔

اس اہمیت کے پیشِ نظر اس موضوع کو ایم فل۔ پی ایچ ڈی کے لئے منتخب کیا گیا ہے، تاکہ قرآن وحدیث کی روشنی میں اس موضوع کا تفصیلی تجزیاتی تحقیقی مطالعہ کیا جائے اور متعلقہ مسائل کو ایسے انداز میں مرتب کیا جائے کہ مزید تحقیق کرنے والوں کے لئے مشعلِ راہ ثابت ہو۔

یہ مقالہ مقدمہ، آٹھ ابواب اور اِختتامیہ پر مشتمل ہے۔

باب اوّل

زَر-تعارف وحقیقت

زَر (Money) کی تعریف فقہائے کرام کے نزدیک

عربی زبان میں ''زَر'' کو ''نقد'' کہتے ہیں، جس کی جمع ''نقود'' ہے۔

قدیم فقہی عبارات اور نصوص پر غور کرنے سے جو بات سامنے آتی ہے، وہ یہ ہے کہ ان کی رُو سے زَر (نقد) کا اِطلاق اس درجہ عموم کے ساتھ نہیں ہے، جس درجہ عموم کے ساتھ ماہرینِ اِقتصاد (Economists) کے ہاں اس کا اِطلاق ہوتا ہے، چنانچہ فقہائے کرام کی عبارات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ہاں ''زَر'' کے اِطلاق میں تین نظریات ہیں:

پہلا نظریہ

زَر سے مراد مطلقاً سونا چاندی ہے، یعنی خواہ ڈھلے ہوئے سکے کی شکل میں ہو، جیسا کہ دِرہم و دِینار یا ڈلی وغیرہ کی شکل میں ہو۔[1]

(۱) تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق الزیلعی (الامام فخر الدین عثمان بن علی الزیلعی الحنفی)، بیروت دارالکتب العلمیة، طبع اول ۲۰۰۰ء: "یعنی اذا وجد معدن ذهب او فضة وهو المراد بالنقد او حدید الخ" (۲/۹۳)۔

ـــــــــ فتح القدیر شرح الهدایة، ابن الهمام، (الامام محمد بن عبد الواحد بن الهمام) کوئٹہ مکتبہ رشیدیہ، فی باب الربا: "کما فی انا ء ین من جنس واحد حدید او ذهب او فضة احدهما اکثر وزنا من الآخر،

(باقی اگلے صفحے پر)

دُوسرا نظریہ

زَر سے مراد صرف ڈھلا ہوا سکہ مراد ہے، یعنی دِرہم و دِینار، لہٰذا سونے یا چاندی کے برتن یا ڈلی یا کسی اور شئ کو جو سونے یا چاندی سے بنی ہوئی ہو، اس کو زَر نہیں کہا جائے گا۔ (۲)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) ففی الانا ء ین من غیر النقدین یجوز بیع احدهما بالآخر الخ"(۱۵۸/۶)۔

______ تحفة المحتاج الهيتمي، (العلامة ابن الحجر الهيتمي الشافعي) : والنقد ای الذهب والفضة ولو غير مضروبين، وتخصيصه بالمضروب مهجور في عرف الفقهاء الخ"(۲۷۹/۴)

(۲) تحرير الفاظ التنبيه النووی،(محی الدين يحی بن شرف النووی) دمشق، دارالقلم ، طبع اول ۱۴۰۸ھ

"النقد" الدراهم والدنانير " (ص۱۱۴)

______ القاموس الفقهي لغة واصطلاحا،سعدی ابو حبيب، :"العملة من الذهب والفضة ويقال لهما النقدان (ج) نقود"

فتح القدير، ابن الهمام،في باب الصرف : "وانما قال : من جنس الا ثمان ولم يقتصر علی قوله : "بيع ثمن بثمن " ليدخل بيع المصوغ بالمصوغ او النقد الخ"(۲۵۹/۶)۔

اس عبارت میں '' مصوغ'' کو'' نقد'' سے الگ کر دیا ہے، جس کا صاف مطلب یہی ہے کہ نقد کا اطلاق صرف درھم و دینار پر ہوتا ہے۔

______ حاشية الدسوقي علی الشرح الكبير،الدسوقي،(محمد عرفه الدسوقی) ، بيروت دارالفكر :" وحرم ــــ ای الربا ــ في نقد ذهب وفضة ولو قال: "في عين" كان اولی لان النقد خاص بالمسكوك الخ"(۲۸/۳)

______ احكام الا وراق النقدية الجعيد،(ستر بن ثواب الجعيد،) الطائف،مكتبة الصديق،،طبع اول، ۱۴۱۳ھ :"وقد اعترض الا سنوی علی احد تراجم المنهاج ــــ باب زكوة النقد ــــ بما يفهم منه موافقته لهٰذا الفريق اذيقول : اعلم ان النقد هو المضروب من الذهب والفضة خاصة فلو عبر المصنف بهما كم عبر الخ" (ص۳۲)

اس مسئلہ میں سونے یا چاندی کے برتن پر بھی '' نقد'' کا اطلاق کیا گیا، اور اس جگہ یہی ثابت کرنا مقصود ہے۔

ان دونظریوں کی رُو سے زَرکا اِطلاق فلوس(Pices) یا دُوسری اشیاء پرنہیں ہوگا۔

تیسرا نظریہ

اصل زَراگرچہ سونا، چاندی ہے، لیکن اس کا اِطلاق سونے چاندی کے علاوہ دیگر اشیاء پر بھی ہوسکتا ہے، چنانچہ اس نظریے کے مطابق ''زَر'' کا اِطلاق ''فلوس''(Pices) پر بھی ہوسکتا ہے۔[1]

اور جب فلوس پر اس کا اِطلاق دُرست ہے، تو دُوسری اشیاء پر پر بھی اس کا اِطلاق ممنوع نہیں ہوگا، بشرطیکہ ان میں وہ شرائط پائی جائیں، جو ''زَر'' کے اِطلاق کے لئے ضروری ہے۔

غرضیکہ فقہائے کرام کے نزدیک زَرکا اطلاق تین طریقوں سے ہوتا ہے، صرف دِرہم ودِینار پر اس کا اِطلاق، زَرکا یہ اِطلاق بہت ہی محدود اور سب سے اَخص ہے، سونے

---

(۱) بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع الکاسانی (العلامة علاء الدین ابوبکر الکاسانی)، کراچی، ایچ ایم سعید، طبع اول ۱۳۲۸ھ : "وجه قوله: (ای الامام محمد بعدم جواز بیع الفلوس بجنسها متفاضلا ـــ عصمت) ان الفلوس اثمان، فلا یجوز بیعها بجنسها متفاضلا کالدراهم والدنانیر۔"(۱۸۵/۵)،

ـــــــ المغنی والشرح الکبیر، ابن القدامة،(عبدالله بن قدامة) السعودیة، مکتبة الریاض، ۱۴۰۳ھـ : "فان احمد قال: لا اری السلم فی الفلوس لانه یشبه الصرف وهذا قول محمد بن الحسن وابی ثور، لانها ثمن فجازت الشرکة بها کالدراهم والدنانیر"۔ (۱۲۵/۵)

ـــــــ احکام الاوراق النقدیة الجعید،(ستر بن ثواب الجعید) "ابن وهب عن اللیث بن سعد عن یحی بن سعید وربیعه انهما کرها الفلوس بالفلوس بینهما فضل او نظرة، وقالا : انها صارت سکة مثل سکة الدنانیر والدراهم "۔(ص۴۳)،

ـــــــ مجموع الفتاوی ابن تیمیه،(شیخ الاسلام احمد بن تیمیه)،السعودیه، مطابع الریاض،طبع اول، ۱۳۸۳ھـ "والاظهر المنع من ذلك فان الفلوس النافقة یغلب علیها وتجعل معیارا لاموال الناس "۔(۴۶۸/۲۹)

چاندی پر اس کا اِطلاق، خواہ سونا یا چاندی کسی بھی شکل (Shape) میں ہو، اس میں پہلے کی نسبت عموم پایا جاتا ہے، اور تیسرا اِطلاق سب سے عام ہے، کیونکہ اس کی رُو سے زَر کا اِطلاق فلوس پر بھی ہو سکتا ہے۔

یاد رہے کہ فلوس سونے یا چاندی کے نہیں ہوتے، بلکہ تانبے وغیرہ کے ہوتے ہیں، تفصیل بابِ دوم میں ملاحظہ فرمائیں!

زَر کا تیسرا اطلاق ماہرینِ اقتصاد (Economists) کے موقف کے زیادہ قریب ہے، ذیل میں تفصیل دی گئی ہے۔

زَر کی تعریف ماہرینِ اِقتصاد کے نزدیک

جسٹس مفتی محمد تقی عثمانی صاحب ''زَر'' کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''جو چیز عرفاً آلہ مبادلہ کے طور پر اِستعمال ہوتی ہو، اور وہ قدرِ زَر کا پیمانہ ہو، اور اس کے ذریعے مالیت کو محفوظ کیا جاتا ہو، اسے ''زَر'' کہتے ہیں۔''(۱)

پروفیسر کراؤتھر (Prof. Crowther) زَر کی تعریف یوں کرتے ہیں:

''زَر سے مراد وہ شیٔ ہے، جو آلہ مبادلہ کی حیثیت سے مقبولِ عام ہو، اور جو ساتھ ہی ساتھ معیارِ قدر اور ذخیرۂ قدر کا فرض بھی سرانجام دے۔''(۲)

ڈاکٹر عدنان خالد ترکمانی اپنی کتاب میں زَر کی تعریف ان الفاظ کے ساتھ کرتے ہیں:

"النقد عبارة عن كل شيء يلقى قبولا عاما كوسيط للتبادل ومقياس للقيمة مهما كان ذلك الشيء وعلى اى حال يكون"

---

(۱) اسلام اور جدید معیشت وتجارت، ادارۃ المعارف کراچی ۱۴۔ طبع اوّل ۱۴۱۹ھ۔

(۲) تعارف زَر و بنکاری، شیخ مبارک علی، ریسرچ سکالر اوسلو یونیورسٹی ناروے، رہبر پبلشرز کراچی طبع اوّل ۱۹۹۱ء۔

"زر" ہر اس شئ کو کہتے ہیں، جو آلہ مبادلہ کی حیثیت سے مقبولِ عام ہو، اور معیارِ قیمت ہو، وہ شئ کچھ بھی ہو، اور کسی بھی حالت میں ہو۔"(۱)

کیول کرشن اپنی کتاب میں زر کی تعریف یوں کرتے ہیں:

"Money may be defined as the means of valuation and of payments : as both the unit of account and the generally accepted medium of exchange"(2)

اس تعریف کا حاصل بھی تقریباً وہی ہے، جو مذکورہ بالا تعریفات میں ذکر ہوا۔

تعریفِ زر کے اجزا یا خصوصیات (Features)

ان تعریفات سے معلوم ہوتا ہے کہ زر کے چار اہم اجزا یا خصوصیات ہیں:

①- زر کا آلہ مبادلہ ہونا۔

②- مقبولِ عام ہونا۔

③- پیمانہ قدر ہونا۔

④- مالیت محفوظ کرنے کا ذریعہ ہونا۔

ہر جزء کی مختصر تشریح ذیل میں ملاحظہ ہو:

①- زر آلہ مبادلہ ہے:- ہر انسان کو زندگی میں مختلف اشیاء کی ضرورت پڑتی ہے، لیکن ہر چیز ہر ایک کے پاس ہونا ضروری نہیں، ایک چیز ایک شخص کے پاس ہے، تو دوسرے کے پاس نہیں، اور دوسرے کے جو چیز ہے، وہ اس کے پاس نہیں، اس وقت ایک دوسرے سے تبادلے کی کیا صورت ہوگی؟ سامان کو ذریعہ تبادلہ بنانا مشکل ہے، کیونکہ ہر

(۱) السياسة النقدية والمصرفية في الاسلام التركماني(الدكتور عدنان خالد التركماني) بيروت ، موسسة الرسالة،طبع اول ۱۴۰۹ھ

(2) Modren Economic Theory. Dewett. Kewal Krishan India Delhi, Eighteen revised edition, 1983. P:409

آدمی کو ہر سامان کی ہر وقت ضرورت نہیں ہوتی، اور نہ ہر ایک کا ہر سامان پر راضی ہونا ضروری ہے، اس کے لئے اللہ تعالی نے سونے چاندی کو ذریعۂ تبادلہ (Medium of Exchange) کے طور پر پیدا فرمایا، اور ہر اِنسان کے دِل میں ان دونوں کی محبت وعظمت اس طرح ڈالی کہ ہر آدمی اس کو قبول کرنے پر طبعی طور پر بھی مجبور ہے، چنانچہ شروع سے لے کر آج تک یہ قابلِ قدر رہے، اور معنوی حیثیت سے اب تک یہی ذریعۂ تبادلہ ہے، گو صورۃً اس میں تعمیم کی گئی، اور زَر کا مفہوم وسیع تر ہوتا گیا۔

۲- زَر مقبولِ عام ہو:- زَر بننے والی شئ کے لئے ضروری ہے کہ اس میں قبولیتِ عامہ کا وصف موجود ہو، یعنی ہر شخص اسے کسی حیل وحجت کے بغیر قبول کر کے اس کے عوض مطلوبہ شئ دینے کے لئے تیار ہو۔

۳- زَر پیمانۂ قدر ہو:- سامان کی قیمتوں کا معیار کیا ہو؟ اگر اس کے لئے کوئی معیار اور پیمانہ مقرّر نہ ہو، تو ہر آدمی اپنے اندازے اور مفاد کے مطابق قیمتوں کا تقرر کرے گا، جس سے نزاع کی صورت پیدا ہوگی، مثلاً اگر زَر نہ ہوتا، تو ایک اُونٹ کی قیمت سامان اور دیگر اشیاء سے کیا ہو؟ اس کا فیصلہ بہت مشکل ہوتا، زَر نے اس مشکل کو نہایت آسان کر دیا، اب زَر پیمانہ اور معیار (Measure of value) قرار دیا گیا، اُونٹ کی قیمت اب زَر سے لگنی چاہئے، نہ کہ سامان سے، اور اس میں اب کوئی نزاع یا مشکل درپیش نہیں ہوگی۔

۴- مالیت محفوظ رکھنے کا ذریعہ ہو:- اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی کے پاس کوئی جنس رکھی ہوئی ہو، تو اس کی قیمت کم وبیش ہوتی رہتی ہے، نیز ضروری نہیں کہ ہر وقت اس کا کوئی خریدار مل جائے، اس لئے اس کی مالیت مکمل طور پر محفوظ نہیں، اس کے بجائے اگر زَر رکھ لیا جائے، تو عام حالات میں اس سے مالیت محفوظ رہتی ہے یعنی غیر معمولی حالات سے قطع نظر، اس کی ذاتی قیمت یکساں رہتی ہے، نیز اس سے کوئی بھی چیز جب چاہیں خرید

جا سکتی ہے۔[1]

خلاصۂ بحث یہ کہ:-

①- ''زر'' کا اِطلاق سونے اور چاندی پر متفق علیہ ہے، اور اس میں کسی کا اختلاف نہیں، نہ فقہائے کرام کا اور اِقتصادیین کا۔

②- ایک موقف یہ ہے کہ سونے یا چاندی جب دِرہم یا دِینار کی شکل میں ہو، تو زر ہے، ورنہ نہیں۔

③- ایک موقف یہ ہے کہ اس سلسلے میں عموم پایا جاتا ہے کہ سونا چاندی کسی بھی شکل میں ہوں، وہ زر کے حکم میں داخل ہیں۔

④- ایک موقف کے مطابق اس میں کچھ زیادہ عموم اور توسع پایا جاتا ہے، جن میں زر کا اِطلاق فلوس پر بھی کیا گیا ہے۔

⑤- اِقتصادیین (Economists) کے ہاں ''زر'' کا مفہوم اور بھی وسیع ہو گیا، اور ان کے ہاں زر ہر اس شیٔ سے عبارت ہے، جس میں مذکورہ خصوصیات پائی جائیں۔

---

(۱) احکام الاوراق النقدیة والتجاریة فی الفقه الاسلامی

تعارف زر و بنکاری

ـــــ اسلام اور جدید معیشت و تجارت۔

ـــــ مقدمة فی النقود والبنوك، الدکتور محمد زکی شافعی، بیروت، دارالنهضة العربیة، طبع هفتم۔

جدید فقہی مباحث، قاسمی (مولانا مجاہد الاسلام قاسمی)، کراچی ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ، جلد دوم۔

The Theory of Money and Credit.Mises, ,Ludwig Von Mises

ـــــ السیاسة النقدیة والمصرفیة فی الاسلام، الترکمانی (الدکتور عدنان خالد الترکمانی)، بیروت مؤسسة الرسالة، ۱۴۰۹ھ۔

ـــــ تطور النقود فی ضوء الشریعة الاسلامیة، الحسنی (الدکتور احمد حسن احمد الحسنی)، جدہ، دارالمدنی، طبع اول، ۱۴۱۰ھ۔

۴- بعد کے بیشتر علمائے اسلام بھی زَر کے مذکورہ مفہومِ عام پر متفق ہو گئے، اور اَحکامِ شرعیہ میں اس عموم کا اعتبار کیا، جیسا کہ آگے تفصیلات سے اِن شاء اللہ تعالیٰ واضح ہو جائے گا۔

زَر کی حقیقت (The Nature of Money)

زَر کی حقیقت سے مراد اس کی "طبیعت" (Nature) ہے، یہ بہت ہی اہم مسئلہ ہے، کیونکہ سود کو جائز قرار دینے کے لئے جو حیلے بہانے تراشے جاتے ہیں، ان میں سے ایک حیلہ یہ بھی ہے کہ "زَر" کے ساتھ "شئ" (Commodity) جیسا معاملہ کیا جائے، لہٰذا جس طرح کسی شئ مثلاً کتاب یا دُکان یا مکان کو بیچا جاتا ہے، اور اس کی قیمت باہمی رضامندی سے کچھ بھی مقرّر کی جاسکتی ہے، اسی طرح زَر کا معاملہ بھی ہے، کہ اس کی قیمت خواہ کچھ بھی لگائی جائے، خواہ قیمتِ اسمیہ (Face Value) سے زیادہ ہی کیوں نہ ہو، جائز ہے، اور یہ کوئی سود نہیں ہے، اسی طرح جب ایک مکان یا دُکان کو کرایہ پر دیا جاسکتا ہے، اور اس پر کرایہ وصول کیا جاسکتا ہے، یہی حال زَر کا بھی ہونا چاہئے کیونکہ زَر بھی تو ایک شئ ہے۔

خلاصہ یہ کہ زَر ان حضرات کے نزدیک من جملہ اشیاء (Commodities) میں سے ہے، جو حکم معاملات (Transactions) میں دیگر اشیاء کا ہے، وہی حکم زَر کا بھی ہوگا، اور جو سلوک دیگر اشیاء کے ساتھ کیا جاتا ہے، وہی سلوک زَر کے ساتھ بھی ہوگا۔

یہ حضرات اشیاء کو دو قسموں میں تقسیم کرتے ہیں:

① شئ صَرفی (Consumption Goods)

② شئ پیداوار (Production Goods)

شئ صَرف کا مطلب یہ ہے کہ اس کو صَرف کر کے اس سے براہِ راست انسانی حاجت پوری ہو، مثلاً اس کو کھایا جائے، یا پیا جائے، یا اس کو پہنا جائے، وغیرہ۔

شئ پیداوار کا مطلب یہ ہے کہ وہ محلِ تجارت (Tradable) ہو، اس کی خرید

وفروخت ہو، اس کو اجارہ(Leasing) اور کرایہ پر دیا جائے، اور اس سے منافع(Profit) حاصل ہو۔

جو لوگ زر کو ''شئ'' مانتے ہیں، ان کے نزدیک زر دوسری قسم میں داخل ہے، یعنی ان کے نزدیک زر شئ پیداوار(Production Goods) ہے۔

لہٰذا دیگر اشیائے پیداوار کی طرح زر میں کمی بیشی کے ساتھ خرید وفروخت جائز ہوگی، نیز اس کو قرض دے کر اس پر سود(Interest) لینا درست ہوگا، گویا کہ زر ان کے ہاں محلِ تجارت ہوا اور اس میں اخلاقی یا شرعی طور پر کوئی قباحت نہیں ہوگی۔ [1]

''زر'' کی حقیقت اور طبیعت (Nature) سے متعلق مذکورہ موقف یا نظریہ

---

(۱)

The Historic Judgment on Interest,Usmani, (,Justice Muhammed Taqi Usmani,)Karachi, Idaratul_Ma,araf,1st edition,2000 A.D ,P:93

"The commodities are classified into the commodities of first order which are normally termed as 'consuption goods' and the commodities of the higher order wich are called 'production goods'. Since money , having no intrinsic utility, could not be included in 'consupion goods' most fo the economists had no; option but to put it under the categery of production goods."

The Theory of Money and Credit, Ludwig Von Mises, ,Liberty Clissics Indianapolis , 9180, P: 95,Ch:5Part:one

"It is usual to divede economic goods into the two classes of those wich satisfy human needs directly and those which only satisfy them indirectly:that is'consuption goods , or goods of the first order, and production goods ,or goods of the higher order ."

Introducion to Economic Principles, Dr.A.N Agarawala,,Katab Mahal 1983.

"Robertson defines money as a commodity which is used to denote any thing which is widely accepted in payment for goods or in discharge of other kinds of business obligation."

ـــــــ الربا خطرہ وسبل الخلاص منہ ـ الحماد،(الدکتور حمد بن عبد العزیز الحماد) مصر ، مطبعة المدنی، طبع اول ۱۴۰۳ھ (ص۲۸)۔

ـــــــ جهاد فی رفع بلو الربا الشیخ(محمد خاطر محمد الشیخ)، مصر، مطابع الاهرام التجاریة، القاهرة،(ص۲۲)

(Theory) اس قدر کمزور اور بے بنیاد ہے، کہ اس کو نہ صرف علمائے اسلام نے رَدّ کیا ہے، بلکہ خود بیشتر ماہرینِ معاشیات بھی اس کی نفی کرتے ہیں۔

ہم اس مقالے میں میں پہلے ماہرینِ معاشیات کی طرف سے اس نظریے کا اِبطال (Negation) پیش کریں گے، اور اس کے بعد علمائے اسلام کی متعلقہ آراء بیان کریں گے۔

مذکورہ موقف اہلِ اقتصاد کی نظر میں

Kewal Krishan Dewett اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:۔[1]

"How money differs from goods? Goods are mainly of two types: the consumer goods, and producer or capital goods. It cannot be consumed as such.There was a time when some commodities served as money and there are exceptional circumstances in modern time too, e.g,in Germany in 1945 when htere was hyper inflation ,cigarattes served as money .But normally is not an ordinary consumer good...

Money cannot also be regarded as a capital good.Capital goods like machines and raw materials help in the manufacture of goods by their physical transformation....It performs entirely a different function. Money is an exchange good, and useful only in an exchange economy."

خلاصہ اس عبارت کا یہ ہے کہ اشیاء دو قسم کی ہیں: اشیائے صَرفی اور اشیائے سرمایہ یا پیداوار، ''زر'' پہلی قسم میں عام حالات میں داخل نہیں ہوسکتا، کیونکہ زر اس طرح خرچ نہیں کیا جاسکتا کہ اس سے براہِ راست کوئی انسانی ضرورت پوری ہو، اسی طرح زر اشیائے سرمایہ میں سے بھی نہیں ہوسکتا، اشیائے سرمایہ مثلاً مشینری یا خام مال ذاتی طور پر دُوسرے مال بنانے میں مدد دیتا ہے، لیکن زر میں یہ خاصیت موجود نہیں، اس کا وظیفہ

(1) Modren Economic Theory,P:409

بالکل مختلف ہے، زَر صرف شیٔ مبادلہ ہے، اور مبادلے کا ذریعہ ہے۔

پروفیسر محمد منظور علی اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:۔[1]

''زَر یعنی نوٹ اور اس کے سکے براہِ راست صَرفی شیٔ (Consumer Good) نہیں ہے، یعنی زَر کسی انسانی حاجت کو براہِ راست پورا نہیں کرتا، کیونکہ یہ کھانے یا پہنے یا رہنے کے کام نہیں آتا، مثلاً آپ سونے کے سکے یا کاغذ کے نوٹ یا بنک چیک کو نہ کھا سکتے ہیں، نہ بدن پر پہن سکتے ہیں، ......کوئی صَرفی شی صرف دو حالتوں میں زَر بن سکتی ہے، یا تو قدیم طرز کی پس ماندہ سوسائٹی میں یا پھر غیر معمولی حالات میں، جنگِ عظیم کے بعد جب جرمنی کو شکست ہوئی، تو وہاں سگریٹ نے زَر کا مرتبہ حاصل کرلیا تھا، ....

''زَر'' اشیائے سرمایہ سے بھی مختلف ہے، کیونکہ زَر کے فرائض اشیائے سرمایہ کے فرائض سے بالکل مختلف ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ زَر صرف اس لئے کارآمد ہے کہ اسے آلۂ مبادلہ کی حیثیت حاصل ہے۔''

Ludwig Von Mises نے اپنی کتاب[2] میں اس نظرویے کی تردید میں باقاعدہ ایک باب (Chapter) باندھا ہے، جو ۱۳ صفحات پر مشتمل ہے، اس باب کا عنوان ہی یہی ہے، عنوان ملاحظہ ہو:۔

Money an economic good "Money neither a production good nor a consuption good"

''یعنی زَر نہ شیٔ سرمایہ ہے، اور نہ ہی شیٔ صَرفی ہے۔''

اس باب میں صاحبِ کتاب نے مفصل بحث کی ہے، اور دلائل بیان کئے ہیں،

---

(۱) کتاب معاشیات ص (۱۱۶)، پروفیسر محمد منظور علی طبع ۱۹۸۲ء علی کتاب خانہ

(۲) The Theory of Money and Credit ,P:95

لیکن آخر میں جو نتیجہ نکالا ہے، اور اس کو اِنصاف پر مبنی قرار دیا ہے، وہ یہ ہے کہ اشیاء کی تقسیم ثنائی نہیں، بلکہ ثلاثی ہے، یعنی اشیاء کو بجائے دو میں تقسیم کرنے کے تین قسموں میں تقسیم کرنا چاہئے:-

۱-وسائلِ پیداوار۔

۲-اشیائے صَرف۔

۳-ذریعہ مبادلہ۔

اور یہ کہ اگر اس نظریے کو اَپنایا جائے (یعنی یہ کہ زَرشئ پیدوار میں داخل ہے)، اور اس کے ساتھ اشیاء کا معاملہ کیا جائے، تو یہ آدم سمتھ (Adam Smith) کے بقول ''مردہ ذخیرہ'' (Dead Stock) ہوگا، جو کسی کام کا نہیں۔[1]

اس کے علاوہ معیشت پر لکھی ہوئی بیشتر کتابوں میں ''زَر'' کی جو تعریف اور زَر کے جو وظائف (Functions) بیان کئے گئے ہیں، ان میں اس بات کا ذِکر نہیں کہ زَرشئ پیداوار بھی ہے، بلکہ ان سب نے زَر کو آلہ مبادلہ (Media of Exchange) کہا ہے۔

مذکورہ موقف اہلِ اسلام کی نظر میں

مذکورہ نظریے کو جس طرح اہلِ اِقتصاد نے باطل اور بے بنیاد قرار دیا ہے، جیسا کہ اس کی تفصیل ذِکر ہوئی، اسی طرح اس نظریے کا اِبطال اہلِ اسلام کی عبارات سے بھی ہوتا ہے، علمائے اسلام میں سے کسی نے اس نظریے کی تائید نہیں کی ہے، ان علماء وفقہاء کی عبارات میں اگرچہ صراحۃً اس نظریے کی تردید نہیں کی گئی ہے، لیکن انہوں نے زَر کی جو حقیقت (Nature) بیان فرمائی ہے، اس سے خود بخود مذکورہ موقف کی تردید ہو جاتی ہے،

---

(1) The theory of Money and Credit :
"This is the compete justification the suggfestion put farword by Knies that economic goods should be divided into means of production, objects of consuption,and media of exchange".P:502
"Regarded from this point of view , these goods what Adam Smith called them "dead stock,which produces nothing." P:102

گو بعض نے صراحت بھی ہے۔

جسٹس مفتی محمد تقی عثمانی صاحب نے سود سے متعلق سپریم کورٹ آف پاکستان کے لئے جو مشہور فیصلہ لکھا ہے، اور جس نے ایک تاریخی حیثیت حاصل کی ہے، یعنی "The Historic Judgment on Interest" اس میں انہوں نے اس نظریے کی اسلامی اور اقتصادی نقطۂ نظر سے تفصیل سے تردید فرمائی ہے۔[1]

انہوں نے اسلامی نقطۂ نظر سے ''زر'' (Money) اور ''شئ'' (Commodity) میں تین بنیادی فروق بیان فرمائے ہیں، جن کا خلاصہ درج ذیل ہے:

۱- زر براہِ راست انسانی ضرورت وحاجت کو پورا نہیں کرسکتا، زر اشیاء (Commodities) اور خدمات (Services) کے حصول کے لئے استعمال کیا جاتا ہے، جبکہ شئ براہِ راست انسانی ضرورت کو پورا کرسکتی ہے۔

۲- اشیاء کے مختلف معیار ہوتے ہیں، (کوئی شئ مہنگی ہوتی ہے، اور کوئی شئ سستی ہوتی ہے۔) جبکہ زر کی سوائے اس کیفیت کی اور کوئی کیفیت نہیں کہ وہ پیمانۂ قدر اور آلۂ مبادلہ ہے، اس لئے ایک قیمت کے زر کی تمام اکائیاں (Units) آپس میں سو فیصد مساوی ہوتی ہیں، ایک ہزار کا پُرانا نوٹ اور نیا نوٹ معیار میں برابر ہیں۔

۳- اشیاء میں خرید وفروخت کے معاملات (Transactions) انہی خاص اشیاء کے ساتھ خاص ہوتے ہیں، جن پر یہ معاملات واقع ہوئے ہوں، ایک خاص کار کی طرف اشارہ کر کے اگر ''الف'' اس کو ''ب'' کے ہاتھ فروخت کرے، اور ''ب'' اس پر راضی ہوکر اس کو خریدے، تو خریدار ''ب'' اسی خاص کار کی وصولی کا حق دار ہوگا، خریدار کو دُوسری کار لینے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا، جبکہ زر کسی معاملے میں متعین کرنے سے متعین نہیں ہوتا، اگر ''الف''، ''ب'' کو کوئی خاص نوٹ دِکھا کر اس سے کوئی چیز خریدے، تو ''الف''، ''ب'' کو اس خاص نوٹ کی بجائے دُوسرا نوٹ بھی دے سکتا ہے، اور ''ب'' اس کو لینے پر مجبور ہوگا،

(1) P:90

بشرطیکہ وہ نوٹ اسی قیمت کا ہو۔

لہٰذا ان بنیادی فروق کے ہوتے ہوئے زَر کے ساتھ اشیاء والا معاملہ نہیں کیا جائے گا، بلکہ زَر کو اپنی طبعی صفت کے پیشِ نظر صرف آلۂ مبادلہ تک محدود رکھا جائے گا۔

شیخ الاسلام علامہ ابنِ تیمیہؒ نے کئی صدیاں قبل زَر کی طبیعت یوں بیان فرمائی ہے:-[1]

"والدراهم والدنانير لا تقصد لنفسها، بل هي وسيلة الى التعامل بها، ولهذا كانت اثماناً، بخلاف سائر الاموال فان المقصود الانتفاع بها نفسها۔"

''دَراہم اور دَنانیر مقصود بالذات نہیں، بلکہ یہ باہمی معاملات کا ایک ذریعہ ہیں، اسی وجہ سے یہ ''اثمان'' شمار ہوگئے، بخلاف دیگر اشیاء کے کہ یہ خود مقصود بالذات ہیں۔''

علامہ ابنِ تیمیہؒ نے زَر اور دیگر اشیاء میں بالکل واضح فرق بیان فرمایا، کہ زَر محض ذریعہ مبادلہ ہے، دیگر اشیاء کی طرح مقصود بالذات نہیں، کیونکہ زَر براہِ راست انسانی حاجت کو پورا نہیں کرسکتا۔

علامہ ابنِ قیمؒ نے نہایت واضح انداز میں اس موضوع پر روشنی ڈالی ہے:-[2]

"الا ثمان لا تقصد لا عيانها، بل يقصد بها التوصل الى السلع، فاذا صارت من نفسها سلعة تقصد لا عيانها فسد امر الناس۔"

---

(۱) مجموعة الفتاوى ابن تيميه (شيخ الاسلام احمد بن تيميه)، السعودية، مطابع الرياض، طبع اول ۱۳۸۲ هج (۲۵۱/۱۹)

(۲) اعلام الموقعين عن رب العالمين، ابن قيم الجوزيه (علامه شمس الدين ابو عبدالله محمد بن ابى بكر المعروف بابن قيم الجوزيه المتوفى ۷۵۱هج) مصر، ادارة الطباعة المنيرية، (۱۵۷/۲)

"زر مقصود بالذات نہیں، بلکہ سامان کے حصول کا ذریعہ ہے، اگر زر سامان میں شمار ہوجائے، تو لوگوں کے معاملات فاسد ہوجائیں گے۔"

حضرت امام غزالیؒ نے "زر" کی حقیقت پر بہت مفصل بحث فرمائی ہے، جس کا خلاصہ ان الفاظ میں بیان کیا جاسکتا ہے:

"اللہ تعالیٰ کی من جملہ نعمتوں میں سے ایک بڑی نعمت دراہم ودنانیر کی تخلیق بھی ہے، انہی سے دُنیا کا نظام قائم ہے، یہ دونوں محض پتھر ہیں، ان سے براہِ راست کوئی نفع حاصل نہیں ہوتا، لیکن لوگ ان کے بہت زیادہ محتاج ہیں، کیونکہ ہر انسان کو کھانے، پینے، لباس اور دُوسری حاجات میں بہت سی چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے، اور انسان کبھی حاجت کی ایک چیز سے مستغنی ہوتا ہے، اور کبھی حاجت کی چیز کو اس کو ضرورت ہوتی ہے، مثلاً ایک شخص کے پاس زعفران ہے، اور اس کو ضرورت اُونٹ کی ہے، اور دُوسرے شخص کے پاس اُونٹ ہے، اور اس کو ضرورت زعفران کی ہے، (اب یہ دونوں تبادلہ کرنا چاہتا ہے۔) تو ان کے درمیان معاوضہ بھی ضروری ہے، اور عوض کی مقدار بھی متعین کرنا ضروری ہے، کیونکہ اُونٹ والا اپنا پورا اُونٹ زعفران کے بدلے میں نہیں دے گا، اور اُونٹ اور زعفران میں کوئی مناسبت بھی نہیں، کہ یہ کہا جائے کہ اُونٹ کے برابر زعفران کے بدلے اُونٹ حوالہ کردے، یہی حال دیگر اشیاء کا بھی ہوگا،...... لہٰذا یہ اشیاء جن میں (صورۃً یا وزناً کوئی مناسبت نہیں) کسی ایسے ثالث کی محتاج ہوگئیں جو ان میں فیصلہ کرے، اور صحیح قیمت کو متعین کرے تو اللہ تعالیٰ نے اس مقصد کے لئے سونا چاندی کو پیدا فرمایا، تاکہ یہ دونوں اشیاء کے درمیان "حَکَم" کا کردار ادا کرسکیں، اور ان کی بنیاد پر اَموال کا اندازہ ہوسکے، اور اشیاء کے درمیان ان کا پیمانہ قدر ہونا اسی پر مبنی ہے کہ ان سے خود براہِ راست کوئی غرض وابستہ نہیں، اگر ان سے خود کوئی غرض وابستہ ہوتی تو یہ جس کے مطلب کے ہوتے، اسی کے حق میں ان کو ترجیح ہوتی، اور دُوسرے ان کو نہ لیتے، اور اسی طرح سارا نظام درہم برہم ہوجاتا۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ

نے ان کو اس لئے پیدا فرمایا تا کہ یہ ایک ہاتھ سے دُوسرے ہاتھ میں جائیں، اور اَموال غیر متناسبہ میں مساوات پیدا کریں، اور ان میں یہ حکمت بھی رکھی کہ ان سے دیگر اشیاء حاصل ہو سکیں، اور جس نے بھی دَراہم و دَنانیر میں سود کا معاملہ کیا تو اس نے نعمتِ خداوندی کی ناشکری کی اور ظلم کیا، کیونکہ ان دونوں کی تخلیق اپنے لئے نہیں بلکہ غیر کے لئے ہے کیونکہ یہ دونوں مقصود بالذات نہیں، چنانچہ جب کوئی شخص ان دونوں میں تجارت کرے گا، تو اس نے ان دونوں کو اس حکمت سے ہٹایا، جس کے لئے ان کی تخلیق ہوئی تھی:

"اذطلب النقد لغیر ما وضع له ظلم"

کیونکہ زَر کو ایسی چیز کے لئے لینا جس کے لئے یہ پیدا نہیں ہوا ہے ظلم ہے۔"[1]

گویا کہ زَر کے ساتھ عام اشیاء سا سلوک کرنا، اور اس کو محلِ تجارت (Tradable) بنا دینا ظلم ہے، زَر کے معاملے میں انصاف یہی ہے کہ جس مقصود کے لئے اس کی تخلیق ہوئی ہے، اسی مقصود میں اس کو اِستعمال کیا جائے۔

ایک اہم اِشکال اور اس کا جواب

اِمام غزالیؒ کی مذکورہ عبارت کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ دِرہم یا دِینار محض ایک وسیلہ ہے، اور اشیائے غیر متناسبہ کے درمیان مساوات پیدا کرنے کا ایک معیار اور ثالث ہے، نہ یہ مقصود بالذات ہے، اور نہ ہی محلِ تجارت، چنانچہ ان کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

"فاذا اتجر فی عینهما فقد اتخذهما مقصودا علی خلاف وضع الحکمة"[2]

"جب کوئی شخص ان دونوں کی ذات میں تجارت کرے گا، تو ان کو اس حکمت کے خلاف استعمال کرے گا، جس کے لئے ان دونوں کی

---

(۱) احیاء علوم الدین، الغزالی (الامام ابوحامد محمد بن محمد الغزالی م۵۰۵ھ)، بیروت لبنان، دار المعرفة، (۴/۹۱)۔

(۲) حوالہ بالا ص ۹۲

تخلیق ہوئی ہے۔"

اس پر یہ اعتراض ہوسکتا ہے کہ پھر تو زر کو زر کے مقابلے میں فروخت کرنا بالکل ناجائز ہو، حالانکہ درہم کی بیع دینار یا دینار کی بیع درہم کے ساتھ شرعاً جائز ہے، اور اس میں کمی بیشی بھی درست ہے، اسی طرح درہم کو درہم کے مقابلے میں فروخت کرنا یا دینار کو دینار کے مقابلے میں فروخت کرنا درست ہے، جبکہ دونوں جانب برابر سرابر ہوں، اور ان معاملات کے جواز میں شرعی اعتبار سے کوئی شبہ نہیں۔

اس کا جواب خود امام غزالیؒ نے دیا ہے، چنانچہ ملاحظہ ہو:-

"درہم و دینار کی تخلیق سے اصل مقصد تو ان کے ذریعہ مختلف اشیاء کا حصول ہی ہے، لیکن اس مقصد میں ایک قسم کا زر دوسری قسم سے مختلف ہوسکتا ہے، بایں طور کہ ایک قسم سے دوسری قسم کے مقابلے میں اشیاء کے حصول تک رسائی آسان ہو، مثلاً اگر دینار کے درہم بنائے جائیں، تو درہم دینار کے مقابلے میں زیادہ ہوں گے، اور ان کو تھوڑا تھوڑا کر کے سب ضروریات پوری ہوسکیں گے، پس اگر اس کے مبادلے سے منع کیا جائے، تو مقصود خاص (مبادلہ) میں خلل ہوگا،.......اسی طرح ایک درہم کو اس کے ہم مثل درہم کے ساتھ بیع کو ہم نے جائز قرار دیا کیونکہ اس طرح کرنا ایک لغو اور فضول کام ہے، اور اس میں کوئی عاقل دلچسپی نہیں لیتا، تو ایسے بے رغبت کام کو کیوں منع کریں؟ (یعنی جب اس میں کوئی فائدہ نہیں تو کوئی عقلمند اس کو اختیار بھی نہیں کرے گا، تو اس کو ممنوع قرار دینے کا کوئی فائدہ بھی نہیں، اس لئے مختلف الاجناس زر کو ایک دوسرے کے ساتھ مبادلہ اور ایک درہم کو درہم کے مقابلے میں یا دینار کو دینار کے مقابلے میں

خرید وفروخت کے معاملے کو جائز قرار دیا۔"[1]

اِمام غزالیؒ کے اس جواب کا حاصل یہی نکلتا ہے کہ یہ صورت بھی گویا اصل قاعدے اور ضابطے سے مستثنیٰ نہیں، بلکہ اس میں بھی پیشِ نظر زَر کے "ذریعہ" بننے میں سہولت پیدا کرنی ہے۔

مفتی مصر محمد خاطر اپنے مقالے[2] میں زَر اور دیگر اشیاء میں فرق بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"زَر کو زمین وغیرہ پر قیاس کرنا دُرست نہیں، اور نہ ہی یہ قیاس اَحکامِ شرعیہ اور قواعدِ فقہیہ کے مطابق ہے، کیونکہ زَر "اثمان" ہے، اور اثمان کو کرایہ پر دینا اور ان کا کرایہ لینا دُرست نہیں، اس لئے کہ اِجارہ عقدِ منفعت کا نام ہے، جس میں منفعت حاصل کرنے کے بعد عین کو واپس کرنا ضروری ہوتا ہے، (جبکہ زَر میں یہ بات ممکن نہیں۔) چنانچہ علامہ کاسانیؒ اپنی کتاب "البدائع" میں فرماتے ہیں:۔

"ولا یجوز اجارة الدراهم والدنانیر ولا تبرهما لانه لا یمکن الانتفاع بها الا بعد استهلاك اعیانها، والداخل تحت الاجارة هي المنفعة لا العین"۔

"دَراہم ودَنانیر اوران کے ٹکڑوں کا اِجارہ دُرست نہیں، کیونکہ ان سے اس وقت تک منفعت حاصل نہیں ہوتی، جب تک ان کی ذات

---

(۱) احیاء علوم الدین (۹۲/۴)

(۲) جهاد في رفع بلوی الربا، الشیخ (محمد خاطر محمد الشیخ) مصر، مطابع الاهرام التجاریة۔ (۲۴/۱)

خرچ نہ ہو، حالانکہ اِجارہ کے تحت منفعت داخل ہوتی ہے، نہ کہ عین''۔

ڈاکٹر حمد مصری اپنی کتاب میں[(۱)] اس بات کو مزید وضاحت کے ساتھ یوں بیان فرماتے ہیں:-

''زمین کو کرایہ پر دینے اور زَر کو کرایہ پر دینے میں فرق واضح ہے، (اور دونوں میں دو قسم کا فرق ہے) زمین کو کرایہ پر دینے میں عین باقی رہتا ہے، اور متأجر صرف منفعت حاصل کرتا ہے، اور شرعاً اِجارہ کی حقیقت یہی ہے، (جبکہ زَر میں یہ بات ممکن ہی نہیں) نیز اجارہ میں شئ کا ضمان موجر (Lessor) پر ہوتا ہے، نہ کہ متأجر (Lessee) پر، جبکہ زَر میں شرعاً ضمان مقروض پر ہوتا ہے، نہ کہ مقرض پر۔''

خلاصۂ بحث

زَر (Money) اور شئ (Commodity) میں فرق ہے، اور یہ فرق بیشتر ماہرینِ معاشیات کو بھی تسلیم ہے، اور اہلِ اسلام تو اس پر متفق ہیں، اس لئے زَر کی طبیعت (Nature) دیگر اشیاء سے مختلف ہوگی، اور دونوں کے ساتھ الگ الگ معاملہ ہوگا، اور دونوں کے اَحکام الگ الگ ہوں گے، اور ہر ایک کو اس کا صحیح مقام دیا جائے گا، لہٰذا زَر صرف آلہ مبادلہ کے طور پر اِستعمال ہوگا، اور یہ محلِ تجارت نہیں ہوگا، محلِ تجارت صرف اشیاء ہوں گی، زَر کو محلِ تجارت قرار دینا زَر کے ساتھ ظلم ہے، اور نظام کو درہم برہم کرنے کے مترادف ہے۔

---

(۱) الربا خطره وسبيل الخلاص منه الحماد (الدكتور حمد بن حماد عبد العزيز الحماد، مصر، مطبعة المدني طبع اول ۱۴۰۴ هج (ص۲۸)

زر کی قسمیں

زر کی مختلف حیثیتوں سے مختلف قسمیں بیان کی گئی ہیں، زر کی قسموں کا چونکہ زر کے ارتقاء اور مختلف نظامہائے زر سے گہرا تعلق ہے، اس لئے زر کی اقسام پر تفصیلی روشنی عنوان ''زر کا ارتقاء اور مختلف نظامہائے زر'' کے تحت اِن شاء اللہ تعالیٰ ڈالی جائے گی۔

یہاں اتنی بات سمجھنی ضروری ہے کہ فقہی احکام کے لحاظ سے زر کی دو اہم قسمیں ہیں:-(۱)

① ثمنِ خلقی

② ثمنِ عرفی یا اِصطلاحی

ثمنِ خلقی وہ ثمن یا زر ہے، جس کا ثمن یا زر ہونا عرف یا تعامل پر موقوف نہ ہو، اور

---

(۱) کاغذی نوٹ اور کرنسی کا حکم، عثمانی (جسٹس مفتی محمد تقی عثمانی) کراچی، میمن اسلامک پبلشرز طبع اوّل ۱۹۹۳ء۔

____ تطور النقود فی ضوء الاسلامیة، الحسنی (احمد حسن احمد الحسنی) جدہ، دار المدنی، طبع اول، ص ۵۳

____ اسی کتاب میں شاہ ولی اللہؒ کی معروف کتاب ''حجۃ اللہ البالغہ'' کے حوالے سے مذکور ہے:

"وکان الالیق من بینھا ____ ای المعادن ____ الذھب والفضة لصغر حجمھما وتماثل افرادھما وعظم نفعھما فی بدن الانسان ولتأتی التجمل بھما فکانا نقدین بالطبع وکان غیرھما نقدا بالاصطلاح۔"(ص ۵۳)

____ مجلة مجمع الفقه الاسلامی، الدورة الخامسة، العدد الخامس، الجزء الثالث ۱۴۰۹ھ:

"حتی ان کثیرا من الفقهاء یقولون: ان الذھب والفضة ھما اثمان بحکم الخلقة ای ان الله تعالی خلقھما لیکونا اثمانا۔"(۱۷۰۱)

____ جدید فقہی مباحث، قاسمی (مولانا مجاہد الاسلام قاسمی) کراچی، ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیۃ، (۲/۱۱۷، ۱۶۹)۔

نہ ہی اس کی ثمنیت یا زَر ہونا عرف اور اِصطلاح کی وجہ سے ہو، بلکہ اس کا ثمن ہونا طبعی اور خلقی طور پر ہو، گویا اس کی تخلیق (Creation) ہی ثمن ہونے کے لئے ہوئی ہے۔ جیسا کہ سونا چاندی، خواہ کسی بھی شکل میں ہوں۔

ثمنِ خلقی صرف سونا یا چاندی ہے، سونے اور چاندی کے علاوہ اور کوئی چیز ثمن خلقی نہیں، سونے اور چاندی کے علاوہ جو بھی چیز زَر کے طور پر اِستعمال ہوتی ہے، یا کسی زمانے میں استعمال ہوئی ہے، وہ ثمنِ عرفی یا ثمنِ اِصطلاحی ہی ہے، لہٰذا:-

ثمنِ عرفی یا اصطلاحی وہ زَر یا ثمن ہے، جس میں ثمنیت لوگوں کی باہمی تعامل اور عرف کی وجہ سے پیدا ہوئی ہو، اگر عرف یا رواج نہ ہوتا، تو وہ شی ثمن نہ ہوتی، جیسا کہ آج کل کی کاغذی نوٹ یا کرنسی وغیرہ۔

ایک اہم فائدہ

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ سونا چاندی معدنیات میں سے ہیں، اسی وجہ سے ان دونوں کو ''حجرین'' یعنی پتھر کہا جاتا ہے، تو معدنیات تو اور بھی ہیں، اور بعض ان میں سے نہایت قیمتی بھی ہیں، تو معدنیات میں سے صرف سونے اور چاندی کو کیوں ثمنِ خلقی کہا گیا، یا ثمنِ خلقی کے طور پر اِستعمال کیا گیا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ سونے اور چاندی میں اللہ تعالیٰ نے کچھ ایسی صفات اور خاصیات رکھی ہیں، جو بیک وقت دُوسری دھاتوں یا معادن میں موجود نہیں، بلکہ دُوسرے معادن ان سے محروم ہیں، خواہ کتنے ہی قیمتی معادن ہی کیوں نہ ہوں، اور ان میں سے بعض صفات اور خاصیات درج ذیل ہیں:-

۱- یہ دونوں پتھر آسانی سے پگھلتے ہیں، اور آسانی سے ان کو کوٹا جاسکتا ہے۔

۲- سونا چاندی بآسانی الگ الگ کی جاسکتی ہے، اور دوبارہ بآسانی ملایا جاسکتی ہے۔

۳-سونے یا چاندی سے کوئی بھی شکل آسانی سے بن سکتی ہے۔

۴-سونا یا چاندی میں کبھی بدبو پیدا نہیں ہوتی، اور نہ اس کے ذائقے میں فرق آتا ہے۔

۵- جتنے عرصے تک بھی یہ دونوں پتھر زمین میں مدفون رہیں، تو اس سے ان میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔

۶-سونے یا چاندی کو اللہ تعالیٰ نے ایسی ہیئت اور علامات سے نوازا ہے کہ ان میں کھوٹ وغیرہ کا فوراً پتہ چل جاتا ہے۔

۷-ان دونوں کا حجم چھوٹا ہوتا ہے۔

۸-یہ دونوں انسان کو وہ زینت و جمال بخشتا ہے، جو دُوسرا پتھر نہیں بخش سکتا ہے۔

۹-دُوسرے معادن کی نسبت سونے اور چاندی کی پیداوار بہت کم ہے۔

۱۰-ان کے افراد میں مماثلت پائی جاتی ہے۔[1]

یہ وہ صفات ہیں جو بیک وقت کسی اور دھات میں موجود نہیں، اس لئے ثمنِ خلقی ہونے کا شرف ان دو پتھروں ہی کو حاصل ہوا۔

زَر اور مال میں فرق

زَر "Money" اور مال "Wealth" میں فرق کے سلسلے میں آسان تعبیر یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ ''زَر'' مال کی ایک قسم ہے، یعنی مال عام ہے، اور زَر خاص ہے، جس کی حیثیت مال کے مقابلے میں محض ایک قسم کی ہے، کیونکہ مال کی تعریف علامہ ابنِ نجیم نے یہ فرمائی ہے:-

"المال كل مايتملكه الناس من نقد وعروض وحيوان

---

(۱) مقدمة في النقود والبنوك، الشافعي (الدكتور محمد زكي الشافعي) بيروت، دارالنهضة العربية، طبع هفتم (ص ۳۴)

______ تطور النقود ص۵۳

وغیر ذلک الخ"

''مال ہر اس چیز کو کہتے ہیں جسے لوگ مالک ہوں، خواہ وہ زَر ہو، یا سامان ہو، یا جانور ہو، یا کوئی اور چیز ہو۔''[1]

اور ابنِ منظور نے ''مال'' کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:۔

"المال ماملکته من جمیع الاشیاء"

''مال ان تمام اشیاء کا نام ہے، جن کا تو مالک ہے۔''[2]

زَر اور کرنسی میں فرق

زَر کی تعریف گزشتہ صفحات میں تفصیل کے ساتھ مذکور ہو چکی ہے، کہ جو ذریعۂ مبادلہ ہو، قدر کا پیمانہ ہو، اور مالیت کے تحفظ کا وسیلہ ہو، مگر یہ ضروری نہیں کہ قانونی طور پر بھی اس کو جبری آلۂ تبادلہ قرار دِیا گیا ہو، مثلاً چیک یا اِنعامی بانڈز پر مذکورہ تعریف صادق آتی ہے، لہٰذا یہ زَر تو ہیں، لیکن اگر کوئی شخص اپنے کسی دَین یا قرضے میں چیک قبول کرنے یا بانڈ قبول کرنے سے انکار کرے، تو اس کو اس پر قانوناً مجبور نہیں کیا جا سکتا ہے۔

اور کرنسی وہ زَر ہے کہ جس کو کسی خاص ملک میں قانونی طور پر آلۂ تبادلہ قرار دِیا گیا ہو، جیسے روپیہ، اگر کوئی شخص روپیہ میں ادائیگی کرے، تو قانوناً اسے لینے پر مجبور کیا جائے گا۔

اس سے معلوم ہوا کہ زَر عام ہے، اور کرنسی خاص ہے، مال اُور زَر کے مقابلے

---

(۱) البحر الرائق شرح کنز الدقائق، ابن نجیم (علامه زین الدین بن ابراهیم بن محمد المعروف بابن نجیم الموفی ۹۷۰ ھ)، بیروت، دارالکتب العلمیة، طبع اول ۱۴۱۸ھ

(۲) لسان العرب، ابن منظور (علامه ابن منظور المتوفی ۷۱۱ھ) بیروت، داراحیاء التراث العربی، طبع اول ۱۴۰۸ھ (۲۲۳/۱۳)

______ ردالمحتار الشامی (محمد امین بن عابدین الشامی م ۱۲۵۲ھ) مطبع مذکورہ، طبع اول ۱۴۱۹ھ، (۲۰۶/۳)

______ اقتصادیات النقود، متولی، (الدکتور ابوبکر الصدیق عمر متولی)، قاهرہ، مکتبه وهبه، طبع اول ۱۴۰۳ھ (ص ۱۳)

میں زَر خاص اور مال عام تھا، اور زَر اور کرنسی کے مقابلے میں زَر عام اور کرنسی خاص ہے۔

مال	:	زر	::	زر	:	کرنسی
عام	:	خاص	::	عام	:	خاص

کرنسی کی دو قسمیں

کرنسی کی دو قسمیں ہیں: ایک ایسی کرنسی جس میں ایک خاص حد تک قانوناً ادائیگی کی جاسکتی ہے، اس سے زائد مقدار دی جائے گی تو قانوناً اسے لینے پر مجبور نہیں کیا جائے گا، جیسے چونی، اس کو ''محدود زَر قانونی'' (Limited Legal Tender) کہتے ہیں۔ دُوسری قسم جس میں قانوناً ادائیگی کی کوئی حد مقرّر نہ ہو، اس کو ''غیر محدود زَر قانونی'' (Unlimited Legal Tender) کہتے ہیں، جیسے دھات کا روپیہ وغیرہ۔[1]

زَر کا اِرتقاء (Evolution) اور مختلف نظامہائے زَر

۱- زمانۂ قدیم میں لوگ اشیاء کا تبادلہ اشیاء (Barter) کے ذریعے کرتے تھے، یعنی ایک چیز دے کر اس کے بدلے میں دُوسری چیز لیتے تھے، لیکن اس طرح کے تبادلے میں بہت سے نقائص اور مشکلات تھیں، اور ہر جگہ ہر وقت اس طریقے پر عمل کرنا دُشوار ہوتا

---

(۱) اسلام اور جدید معیشت وتجارت (مفتی محمد تقی عثمانی)، کراچی ۱۴، ادارۃ المعارف، طبع اوّل ۱۴۱۵ھ (ص ۹۵)۔

مراجع اضافیہ:-

Introduction to Economic Principles, by Dr. A.N, Agarawa. P315

معاشیات، حبیب الرحمٰن مکتبہ فریدی اُردو کالج اسپتال روڈ طبع اوّل ۱۹۵۳ء۔

معاشیات، پروفیسر محمد منظور علی لاہور، علمی کتب خانہ، حصہ دوم ص ۱۲۷۔

معاشیات کے ابتدائی اُصول، لاہور قومی کتب خانہ، طبع سوم ۱۹۵۴ء، ص ۲۶۴۔

زَر اور بنک داری، شیخ عطاء اللہ، لاہور، کشمیر بازار، طبع اوّل ۱۹۵۴ء ص ۴۴۔

تطور النقود في ضوء الشريعة الاسلامية ص٦٦، الدكتور احمد حسن احمد الحسني

تھا، اس لئے آہستہ آہستہ لوگوں نے یہ طریقہ ترک کر دیا۔

۲- اس کے بعد ایک اور نظام رائج ہوا، جس کو ''زر بضاعتی کا نظام'' (Commodity Money System) کہا جاتا ہے، اس نظام میں لوگوں نے مخصوص اشیاء کو بطورِ ثمن کے تبادلے کا ذریعہ بنایا، اور عام طور پر ایسی اشیاء کو تبادلے کا ذریعہ بناتے، جو کثیر الاستعمال ہوتی تھیں، مثلاً کبھی اناج اور گندم کو ذریعہ تبادلہ بنایا، اور کبھی نمک اور چمڑے کو اور کبھی لوہے وغیرہ کو تبادلے کا ذریعہ بنایا۔

۳- مگر ان اشیاء کو تبادلے میں استعمال کرنے میں نقل و حمل کی بہت سی مشکلات پیش آتی تھیں، اس لئے آہستہ آہستہ لوگ اس طریقے سے اُکتا گئے، اور جیسے جیسے آبادی بڑھتی گئی، اور لوگوں کی ضروریات میں اضافہ ہونے لگا، اور تبادلہ بھی پہلے کے مقابلے میں زیادہ ہونے لگا، تو لوگوں نے سوچا کہ تبادلے کا جو طریقہ ہم نے اِختیار کیا ہے، اس میں بہت سی مشکلات ہیں، لہٰذا تبادلے کا کوئی ایسا طریقہ ہونا چاہئے جس میں نقل و حمل کم سے کم ہو اور اس پر لوگوں کا اعتماد بھی زیادہ ہو، چنانچہ اس مرحلے پر لوگوں نے سونے اور چاندی کو ذریعہ تبادلہ بنایا، حتیٰ کہ ان دونوں دھاتوں نے اشیاء کی قیمتوں کے لئے ایک پیمانے کی حیثیت اختیار کر لی، اور تمام ممالک اور شہروں میں لوگ ان دھاتوں پر اِعتماد کرنے لگے، اس نظام کو ''نظام زَر معدنی'' (Metalic Money System) کہا جاتا ہے۔

اس تیسرے نظام پر بہت سے تغیرات اور اِنقلابات گزرے ہیں، جن کا خلاصہ درج ذیل ہے:-

① اِبتدا میں لوگ ایسے سونے چاندی کو بطور کرنسی کے استعمال کرتے جو سائز، ضخامت، وزن اور صفائی کے اعتبار سے مختلف ہوتا تھا، کوئی سونا ٹکڑے کی شکل میں ہوتا تھا، کوئی ڈھلے ہونے برتن اور زیور کی شکل میں ہوتا تھا، لیکن تبادلے کے وقت صرف وزن کا اعتبار کیا جاتا تھا۔

② اس کے بعد ڈھلے ہوئے سکوں کا رِواج شروع ہوگیا، بعض شہروں

میں سونے کے ڈھلے ہوئے سکے، اور بعض شہروں میں چاندی کے ڈھلے ہوئے سکے رِواج پاتے گئے، جو ضخامت، وزن اور خالص سونے کے اعتبار سے مساوی ہوتے تھے، اور جن پر دونوں طرف مہر ثبت ہوتی تھی، جو اس بات کی علامت تھی کہ یہ سکے دُرست اور تبادلے کے قابل ہیں، اور اس سکے کی ظاہری قیمت (Face Value) جو اس پر لکھی ہوئی ہوتی تھی، وہ اس سونے اور چاندی کی حقیقی قیمت (Gold or Silver Contents) کے برابر ہوتی تھی، گویا کہ سکے کی شکل میں ڈھلے ہوئے سونے کی قیمت اس ڈلی کے برابر ہوتی تھی، جو سکے کے ہم وزن ہو، اس نظام کو "معیاری قاعدہ زر" (Gold Specie Standard) کہا جاتا ہے، اس نظام کو سب سے پہلے چینیوں نے ساتویں عیسوی قبل مسیح رائج کیا تھا۔

اس نظام کے اندر لوگوں کو یہ آزادی تھی، وہ چاہیں آپس میں لین دین کے لئے سکے استعمال کریں، یا سونے کے ٹکڑے یا سونے کے ڈھلے ہوئے زیورات وغیرہ استعمال کریں، اور ملک سے باہر برآمد ودرآمد کی بھی عام اجازت تھی۔

اور حکومت کی طرف سے یہ عام اجازت تھی کہ جو شخص بھی جس مقدار میں سکے ڈھلوانا چاہے، وہ ڈھال کردے گی، چنانچہ لوگ حکومت کے پاس سونے کے ٹکڑے اور سونے کی ڈھلی ہوئی دُوسری اشیاء لاتے، اور حکومت ان کو سکے بنا کر واپس کردیتی، اور اسی طرح اگر کوئی شخص سکے لاکر اس کو پگھلانے کے لئے کہتا تو حکومت ان سکوں کو پگھلا کر ٹکڑے کی شکل میں اس شخص کو واپس کردیتی۔

(۳) بعض ممالک نے بجائے ایک دھات کے دو دھات یعنی سونے چاندی دونوں کے سکوں کو بطور کرنسی کے رائج کیا، اور ان دونوں کے آپس کے تبادلے کے لئے ایک خاص قیمت مقرّر کردی، اور سونے کو بڑی کرنسی کے طور پر اور چاندی کو چھوٹی کرنسی کے طور پر اِستعمال کیا جانے لگا، اس نظام کو "دو دھاتی نظام" (Bi-Metallism) کہا جاتا ہے۔

لیکن اس نظام میں دُوسری مشکلات پیدا ہوگئیں، وہ یہ کہ سونے اور چاندی کے

سکوں میں آپس میں تبادلے کے لئے جو قیمت مقرّر کی گئی تھی وہ مختلف شہروں میں مختلف ہو جاتی تھی جس کی بناء پر لوگ کرنسی کی تجارت میں دِلچسپی لینے لگے، مثلاً امریکا میں ایک سونے کے سکے کی قیمت پندرہ چاندی کے سکے ہوتی، لیکن بالکل اس وقت میں یورپ میں ایک سونے کے سکے کی قیمت چاندی کے ساڑھے پندرہ سکے کے برابر ہوتی، اس صورتِ حال میں تاجر امریکا سے سونے کے سکے جمع کر کے یورپ میں فروخت کردیتے تاکہ وہاں سے ان کو زیادہ چاندی حاصل ہوجائے اور پھر وہ چاندی کے سکے امریکا لاکر ان کو سونے کے سکوں میں تبدیل کردیتے اور پھر یہ سونے کے سکے دوبارہ جاکر یورپ میں فروخت کردیتے اور اس کے بدلے چاندی لے آتے، لیکن اس تجارت کے نتیجے میں امریکا کا سونا مسلسل یورپ منتقل ہوتا رہا، گویا کہ چاندی کے سکوں نے سونے کے سکوں کو امریکا سے باہر نکال دیا، پھر جب ۱۸۳۴ء میں امریکا نے سونے اور چاندی کے سکوں کے درمیان اس تناسب کو بدل دیا اور سونے کے ایک سکے کو چاندی کے سولہ سکوں کے مساوی قرار دے دئے، تو معاملہ پہلی صورت کے برعکس ہوگیا، اب سونے کے سکے امریکا میں منتقل ہونے شروع ہوگئے اور چاندی کے سکے یورپ منتقل ہونے لگے، گویا کہ سونے کے سکوں نے چاندی کے سکوں کو امریکا سے نکال دیا۔

(۴) سکے چاہے سونے کے ہوں یا چاندی کے اگرچہ سامان اور اسباب کے مقابلے میں ان کی نقل و حمل آسان ہے، لیکن دُوسری طرف ان کو چوری کرنا بھی آسان ہے، اس لئے مال داروں کے لئے ان سکوں کی بہت بڑی مقدار کو ذخیرہ کر کے گھر میں رکھنا مشکل ہوگیا، چنانچہ وہ لوگ ان سکوں کی بہت بڑی مقدار کو سناروں اور صرّافوں (Money Changers) کے پاس بطور امانت کے رکھوانے لگے، اور وہ سنار اور صرّاف ان سکوں کو اپنے پاس رکھتے وقت ان امانت رکھنے والوں کو بطور وثیقہ کے ایک کاغذ یا رسید (Receipt) جاری کردیتے، آہستہ آہستہ جب لوگوں کو ان سناروں پر اِعتماد زیادہ ہوگیا تو یہی رسیدیں، جو ان سناروں نے امانت قبول کرتے وقت بطورِ دستاویز جاری کی تھیں، بیع و شراء میں بطور

ثمن کے استعمال ہونے لگیں، لہٰذا ایک خریدار دُکاندار کو خریداری کے وقت بجائے نقد سکے ادا کرنے کے انہی رسیدوں میں سے ایک رسید اس کو دے دیتا اور دُکاندار ان سناروں پر اِعتماد کی بنیاد پر اس رسید کو قبول کر لیتا۔

اس مرحلے سے کاغذی نوٹ کی ابتدا ہوتی ہے، لیکن ابتدا میں نہ اس کی کوئی خاص شکل وصورت تھی اور نہ ان کی کوئی ایسی قانونی حیثیت تھی جس کی وجہ سے لوگوں کو اس کے قبول کرنے پر مجبور کیا جا سکے، بلکہ اس کے قبول اور رَدّ کرنے کا دارومدار اس بات پر تھا کہ اسے قبول کرنے والا اس کے جاری کرنے والے سنار پر کتنا بھروسہ رکھتا ہے۔

⑤ جب ۱۷۰۰ء کے اوائل میں بازاروں میں ان رسیدوں کا رِواج زیادہ ہوگیا، تو ان رسیدوں نے ترقی کر کے ایک باضابطہ صورت اختیار کر لی، جسے بنک نوٹ کہتے ہیں، کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلے سویڈن کے اسٹاک ہوم بینک نے اسے بطور کاغذی نوٹ کے جاری کیا۔

اس وقت جاری کرنے والے بنک کے پاس ان کاغذی نوٹوں کے بدلے میں سو فیصد اتنی مالیت کا سونا موجود ہوتا تھا، اور بنک یہ التزام کرتا تھا کہ وہ صرف اتنی مقدار میں نوٹ جاری کرے، جتنی مقدار میں اس کے پاس سونا موجود ہے اور اس کاغذی نوٹ کے حامل کو اِختیار تھا کہ وہ جس وقت چاہے بنک جا کر اس کے بدلے میں سونے کی سلاخ حاصل کر لے، اسی وجہ سے اس نظام کو ''سونے کی سلاخوں کا معیار'' (Gold Bullion Standard) کہا جاتا ہے۔

⑥ ۱۸۳۳ء میں جب ''بنک نوٹ'' کا رِواج بہت زیادہ ہونے لگا، تو حکومت نے اس کو ''زرِ قانونی'' (Legal Tender) قرار دے دیا، اور ہر قرض لینے والے پر یہ لازم کر دیا کہ وہ اپنے قرض کے بدلے میں اس نوٹ کو بھی اسی طرح ضرور قبول کرے گا، جس طرح اس کے لئے سونے چاندی کے سکے قبول کرنا لازم ہے، اس کے بعد پھر تجارتی بینکوں کو اس کے جاری کرنے سے روک دیا گیا، اور صرف حکومت کے ماتحت چلنے

والے مرکزی بنک کو اس کے جاری کرنے کی اجازت دی گئی۔

۲ پھر حکومتوں کو زمانۂ جنگ اور امن کے دوران آمدنی کی کمی کی وجہ سے ترقیاتی منصوبوں کی تکمیل میں بہت سی مشکلات پیش آنے لگیں، چنانچہ حکومت مجبور ہوئی کہ وہ کاغذی نوٹوں کی بہت بڑی مقدار جاری کردے، جو سونے کی موجودہ مقدار کے تناسب سے زیادہ ہو، تاکہ اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے اسے استعمال کرے، اس کے نتیجے میں سونے کی وہ مقدار جو ان جاری شدہ کاغذی نوٹوں کی پشت پر تھی وہ آہستہ آہستہ کم ہونے لگی، حتی کہ ابتداء میں ان نوٹوں اور سونے کے درمیان جو سو فیصد تناسب تھا، وہ گھٹتے گھٹتے معمولی تناسب رہ گیا، اس لئے کہ ان نوٹوں کو جاری کرنے والے مرکزی بنک کو اس بات کا یقین تھا، کہ ان تمام جاری شدہ نوٹوں کو ایک ہی وقت میں سونے سے تبدیل کرنے کا مطالبہ ہم سے نہیں کیا جائے گا، اس لئے سونے کی مقدار سے زیادہ نوٹ جاری کرنے میں کوئی حرج نہیں، دُوسرے لفظوں میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ زیادہ مقدار میں نوٹ جاری کرنے کے نتیجے میں بازار میں ایسے نوٹ رائج ہوگئے، جن کو سونے کی پشت پناہی حاصل نہیں تھی، لیکن تجار ایسے نوٹوں کو اس بھروسے پر قبول کرتے تھے کہ ان نوٹوں کے جاری کرنے والے مرکزی بینک کو اس بات پر قدرت حاصل ہے کہ وہ تبدیلی کے مطالبے کو پورا کردے گا، اگرچہ اس کے پاس موجود سونے کی مقدار اس کے جاری کردہ نوٹوں کے مقابلے میں بہت کم ہے، ایسے کرنسی نوٹوں کو ''زَرِ اِعتباری'' (Fiduciary Money) کہا جاتا ہے۔

دُوسری طرف آمدنی کی مذکورہ بالا کمی اور زیادہ روپے کی ضرورت ہی کی بنیاد پر حکومتیں جو اَب تک معدنی سکوں کے ساتھ معاملات کرتی آئی تھیں، اس بات پر مجبور ہوئیں، کہ وہ یا تو سکوں میں دھات کی جتنی مقدار اِستعمال ہورہی ہے اس کو کم کردے یا ہر سکے میں اصلی دھات کے بجائے ناقص دھات استعمال کریں، چنانچہ اس عمل کے نتیجے میں سکے کی ظاہری قیمت (Face Value) جو اس پر درج تھی، اس سکے کی اصلی قیمت

(Token) "علامتی زر" (Intinsic Value) سے کئی گنا زیادہ ہوئی، ایسے سکوں کو "علامتی زر" (Money) کہا جاتا ہے، اس لئے کہ اس سکے کی معدنی اصلیت اس کی اس ظاہری قیمت کی محض علامت ہوتی ہے جو کبھی اس کی ذاتی قیمت کی ٹھیک ٹھیک نمائندگی کیا کرتی تھی۔

⑧ رفتہ رفتہ زرِ اعتباری کا رِواج بڑھتے بڑھتے اتنا زیادہ ہوگیا کہ ملک میں پھیلے ہوئے نوٹوں کی تعداد میں موجود سونے کی مقدار کے مقابلے میں کئی گناہ زیادہ ہوگئی، یہاں تک کہ حکومت کو اس بات کا خطرہ لاحق ہوگیا کہ سونے کی موجودہ مقدار کے ذریعے ان نوٹوں کو سونے میں تبدیل کرنے کا مطالبہ پورا نہیں کیا جاسکتا، چنانچہ بعض شہروں میں حقیقۃً یہ واقعہ پیش آیا کہ مرکزی بینک نوٹوں کو سونے میں تبدیل کرنے کا مطالبہ پورا نہ کرسکا۔

اس وقت بہت سے ملکوں نے نوٹوں کو سونے میں تبدیل کرانے والوں پر بہت سے کڑی شرطیں لگادیں، انگلینڈ نے تو ۱۹۱۴ء کی جنگ کے بعد اس تبدیلی کو بالکل بند کردیا، البتہ ۱۹۲۵ء میں دوبارہ تبدیلی کی اجازت اس شرط کے ساتھ دی کہ ایک ہزار سات سو پونڈ سے کم کی مقدار کو کوئی شخص تبدیل کرانے کا مطالبہ نہیں کرسکتا، چنانچہ اس شرط کے نتیجے میں عام لوگ تو اپنے نوٹوں کو سونے میں تبدیل کرانے کا مطالبہ کرنے سے محروم ہوئے، اس لئے کہ اس زمانے میں یہ مقدار اتنی زیادہ تھی کہ بہت کم لوگ اتنی مقدار کے مالک ہوتے تھے، لیکن اس قانون کی انہوں نے اس لئے کوئی خاص پروا نہیں کی کہ یہ کاغذی نوٹ زرِ قانونی رہ گئے اور ملکی معاملات میں بالکل اسی طرح قبول کئے جاتے تھے جس طرح اصلی کرنسی قبول کی جاتی تھی اور اس کے ذریعے اندرون ملک تجارت کرکے اس طرح نفع حاصل کیا جاسکتا تھا جس طرح دھاتی کرنسی کے ذریعے تجارت کرکے نفع حاصل کیا جاتا تھا۔

⑨ پھر ۱۹۳۱ء میں برطانوی حکومت نے ان نوٹوں کو سونے سے تبدیل کرانے کی بالکل ممانعت کردی، حتیٰ کہ اس شخص کے لئے بھی جو سترہ سو پونڈ کو سونے میں تبدیل کرنے کا مطالبہ کرے، اور لوگوں کو مجبور کیا کہ وہ سونے کے بجائے صرف ان نوٹوں

پر اکتفا کریں اور اپنے تمام کاروبار اور معاملات میں اسی کا لین دین کریں، لیکن حکومتوں نے آپس میں ایک دُوسرے کے حق کے اِحترام کو برقرار رکھتے ہوئے ایک دُوسرے کے نوٹوں کو سونے میں تبدیل کرنے کے قانون کو برقرار رکھا، چنانچہ اندرون ملک اگرچہ ان نوٹوں کو سونے میں تبدیل کرانے کی ممانعت تھی لیکن ہر حکومت نے یہ التزام کیا تھا کہ اگر اس کی کرنسی دُوسرے ملک میں چلی گئی اور دُوسری حکومت اس کرنسی کے بدلے میں سونے کا مطالبہ کرے گی، تو یہ حکومت اپنے کرنسی نوٹوں کے بدلے میں اس کو سونا فراہم کرے گی، مثلاً اگر امریکا کے پاس برطانیہ کے اسٹرلنگ پونڈ آئے اور وہ اب ان کے بدلے میں برطانیہ سے سونے کا مطالبہ کرے، تو برطانیہ پر لازم ہے کہ وہ ان کے بدلے میں امریکا کو سونا فراہم کرے، اس کو ''سونے کی مبادلت کا معیار'' (Gold Exchange Standard) کہا جاتا ہے۔

(۱۰) اسی اُصول پر سالہا سال تک عمل ہوتا رہا حتیٰ کہ جب ریاستہائے متحدہ امریکا کو ڈالر کی قیمت میں کمی کے باعث سخت بحران کا سامنا کرنا پڑا اور ۱۹۷۱ء میں سونے کی بہت قلّت ہوگئی تو امریکی حکومت اس بات پر مجبور ہوئی کہ دُوسری حکومتوں کے لئے بھی ڈالر کو سونے میں تبدیل کرنے کا قانون ختم کردے، چنانچہ ۱۵؍اگست ۱۹۷۱ء کو اس نے یہ قانون نافذ کردیا اور اس طرح کاغذی نوٹ کو سونے سے مستحکم رکھنے کی جو آخری شکل تھی وہ بھی اس قانون کے بعد ختم ہوئی۔ اس کے بعد ۱۹۴۷ء میں بین الاقوامی مالی فنڈ (International Monetary Fund) نے سونے کے بدل کے طور پر ایک ''زرِ مبادلہ نکلوانے کے حق'' (Special Drawing Rights) کا نظریہ پیش کیا، اس نظریے کا حاصل یہ تھا کہ بین الاقوامی مالی فنڈ کے ممبران کو اس بات کا اختیار حاصل ہے کہ وہ مختلف ممالک کی کرنسی کی ایک معین مقدار غیرملکی قرضوں کی ادائیگی کے لئے نکلوا سکتے ہیں اور مقدار کے تعین کے لئے ۸۸۸٦۷ گرام سونے کو معیار مقرّر کیا گیا کہ اتنی مقدار کا سونا جتنی کرنسی کے ذریعہ خریدا جاسکتا ہو اتنی کرنسی ایک ملک نکلوا سکتا ہے، لہٰذا اب صورتِ حال یہ ہے کہ زَرِ

مبادلہ نکلوانے کا یہ حق جسے اِختصار کے لئے (S.D.R) کہا جاتا ہے، سونے کی پشت پناہی کا مکمل بدل بن چکا ہے۔

اس طرح اب سونا کرنسی کے دائرے سے بالکل خارج ہو چکا ہے اور اَب سونے کا کرنسی سے کوئی تعلق باقی نہیں رہا اور نوٹوں اور زَرِ علامتی نے پوری طرح سونے کی جگہ لے لی ہے، اب نوٹ نہ سونے کی نمائندگی کرتے ہیں، نہ چاندی کی، بلکہ ایک فرضی قوتِ خرید کی نمائندگی کرتے ہیں، لیکن چونکہ کرنسی کے اس نظام میں ایک مستقل اور اَبدی نظام کی طرح اب تک مضبوطی اور جماد پیدا نہیں ہوا، اس لئے کہ تقریباً تمام ممالک میں اس بات کی تحریک چل رہی ہے کہ پہلے کی طرح پھر سونے کو مالی نظام کی بنیاد مقرّر کی جائے، یہاں تک کہ دوبارہ سونے کی سلاخوں کے نظام کی طرف لوٹنے کی آوازیں لگنے لگی ہیں، اس لئے دُنیا کے تمام ممالک اب بھی اپنے آپ کو سونے سے بے نیاز اور مستغنی نہیں سمجھتے، بلکہ ہر مُلک اب بھی اِحتیاطی تدبیر کے طور پر زیادہ سے زیادہ سونے کے ذخائر جمع رکھنے کی کوشش کرتا ہے تاکہ زمانے کے بدلتے ہوئے حالات اور اِنقلابات میں یہ سونا کام آئے، لیکن سونے کی بڑی سے بڑی مقدار کا یہ ذخیرہ صرف ایک اِحتیاطی تدبیر کے طور پر ہے، اس کا موجودہ دور میں رائج کرنسی سے کوئی قانونی تعلق نہیں ہے، خواہ وہ کرنسی نوٹ کی شکل میں ہو یا دھاتی سکوں کی شکل میں۔ (۱)

---

(۱) احکام الاوراق النقدية، العثمانی (القاضی المفتی محمد تقی العثمانی)، کراتشی، مکتبه دارالعلوم، طبع اول ۱۴۰۹ھ ص ۳

___ ایضا کاغذی نوٹ اور کرنسی کا حکم ص ۷

___ مقدمة فی النقود والبنوك ص ۸، الدکتور محمد زکی شافعی

___ تطور النقود فی ضوء الشريعة الاسلامیه ص ۱۹، الدکتور احمد حسن احمد الحسنی

___ تعارف زر و بنکاری، ص ۱۵، شیخ مبارک علی

___ ایضا کتاب معاشیات حصہ دوم ص ۱۱۳

(باقی اگلے صفحے پر)

سہولت، اور آسانی کے پیشِ نظر زر کے ارتقاء کا خلاصہ پیشِ خدمت ہے، ملاحظہ فرمائیں!

اِرتقاءِ زَر کے تدریجی مراحل ایک نظر میں

پہلا مرحلہ:-شی کا تبادلہ شیٔ سے، اس کو "مقائضہ" (Barter) کہتے ہیں۔

دُوسرا مرحلہ:-مخصوص اجناس کو بطورِ "ثمن" قرار دِیا گیا، اس کو "زَر بضاعتی کا نظام" (Commmodity Money System) کہتے ہیں۔

تیسرا مرحلہ:-اس مرحلے میں سونے چاندی کو ثمن قرار دِیا گیا، اس کو "نظامِ زَر معدنی" (Matalic Money System) کہتے ہیں۔

تیسرے مرحلے کے دس انقلابات:-

۱-کوئی خاص سکہ نہیں تھا، سونے چاندی کی مختلف شکلوں میں تبادلے کے وقت صرف وزن کا اعتبار ہوتا تھا۔

۲-مہر لگے ہوئے کہیں سونے اور کہیں چاندی کے سکے رائج ہوگئے، جن کی ظاہری قیمت (Face Value) حقیقی قیمت (Gold or Silver content) کے مساوی ہوتی تھی۔اس کو "معیاری قاعدۂ زَر" (Gold Specie Standard) کہتے ہیں۔

۳-ایک ملک میں سونے چاندی دونوں کے سکے بطور کرنسی کے رائج ہوگئے، اور ان کے آپس میں تبادلے کے لئے ایک خاص قیمت مقرّر کی گئی۔اس کو "دو دھاتی نظام"

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

—— المعاملات المالية المعاصرة في الفقه الاسلامي، الدكتور محمد عثمان شبير، اردن، دارالنفائس، طبع سوم ۱۴۱۹ھ، (ص۱۷۶)

—— احكام الاوراق النقدية في الفقه الاسلامي ص۵۵، ستر بن ثواب الجعيد

—— السياسة النقدية والمصرفية في الاسلام ص۶۰، عدنان خالد التركماني

Introduction to Economic Principles, by Dr.A.N. Agarawala p: 314

Modren Economic Theory, by K.K Dewett. P: 416

(Bi-Metallism) کہتے ہیں۔

۴-حفاظت کے پیشِ نظر سونے چاندی کو سناروں کے پاس بطورِ امانت رکھوانے کا دستور شروع ہوگیا، جس کے نتیجے میں مالکان کو رسیدیں (Receipts) جاری ہونے لگیں۔اورخریداری میں ان رسیدوں کو نمائندگی حاصل ہوگئی۔

۵-رسیدوں کے رِواج میں تیزی آنے کے بعد ''بنک نوٹ'' کا رِواج شروع ہوگیا۔یہ کاغذی نوٹ ہے۔اس میں جاری شدہ نوٹوں کے سو فیصد برابر سونا موجود ہوتا تھا، اور بوقتِ طلب حامل کو سونے کی سلاخ ملا کرتی تھی، اس لئے اس نظام کو ''سونے کی سلاخوں کا معیار''(Gold Bullion Standard) کہتے ہیں۔

۶-۱۸۳۳ء میں بنک نوٹ کو ''زرِقانونی'' (Legal Tender) قرار دِیا گیا۔ اس مرحلے پر صرف حکومتی مرکزی بنک ہی یہ نوٹ جاری کرسکتے تھے۔

۷-حکومتی ضروریات کے پیشِ نظر جاری شدہ نوٹوں کے تناسب سے زیادہ نوٹ جاری ہوگئے۔ان نوٹوں کو ''زرِاعتباری'' (Fiduciary Money) کہتے ہیں۔اس مرحلے پر سکوں میں دھات کی مقدار یا اس کی کوالٹی ناقص کی گئی، جس سے ظاہری قیمت اصلی قیمت سے کئی گنا زیادہ ہوگئی، اوراَب اس کو ''علامتی زر''(Token Money) کا نام دیا گیا۔

۸-زَرِاِعتباری کا رِواج بڑھنے کی وجہ سے نوٹوں کو سونے میں تبدیل کرنے کو بالکل محدود کردیا گیا۔

۹-۱۹۳۱ء میں نوٹوں کو عوامی سطح پر سونے میں تبدیل کرنے کی بالکل ممانعت کی گئی،صرف ممالک کے آپس میں اس کا لحاظ رکھا جاتا تھا۔اس نظام کو ''سونے کی مبادلت کا معیار'' (Gold Exchange Standard) کہتے ہیں۔

۱۰-۱۹۷۱ء میں ممالک کی سطح پر بھی اس کی ممانعت ہوگئی،اور یوں سونا کرنسی کے دائرے سے بالکل خارج ہوگیا۔گویا کہ ۱۹۷۱ء سے کرنسی کی پشت پر کوئی سونا نہیں رہا۔گو

اَب بھی ہر ملک احتیاطی تدبیر کے طور پر زیادہ سے زیادہ سونے کے ذخائر جمع رکھنے کی کوشش کرتا ہے، لیکن ان ذخائر کا موجودہ کرنسی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

سکہ سازی کی تاریخ اور مختلف مراحل

زمانۂ جاہلیت اور دورِ اِسلامی کے ابتدائی زمانے تک زَر، خالص ''سلع'' (Goods) کی شکل میں تھا، یعنی سکہ نہیں تھا، چنانچہ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں ہرقل کے دَنانیر اور فارس کے دَراہم بغلیہ اور حمیر یہ اہلِ مکہ کے پاس آتے تھے، لیکن یہ دَنانیر اور دَراہم ڈلی کی شکل میں ہوتے تھے، جیسا کہ علامہ بلاذری نے اس کی تصریح کی ہے:-

> "كانت دنانير هرقل ترد على اهل مكة في الجاهلية وترد عليهم دراهم الفرس البغلية والحميرية فكانوا لا يتبايعون لا على انها تبر"
>
> ''یعنی جاہلیت کے زمانے میں اہلِ مکہ کے پاس ہرقل کے دَنانیر اور فارس کے دَراہم بغلیہ اور حمیر یہ آتے تھے، اور یہ لوگ آپس میں معاملات ڈلی ہی سے کرتے تھے۔''[1]

زمانۂ اسلام میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہی کرنسیوں کو برقرار رکھا جیسا کہ بعض روایات میں ہے کہ آپ نے اپنی صاحبزادی حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا نکاح حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ کے ساتھ چار سواسّی دَراہمِ کسروی کے ساتھ کیا۔[2]

---

(۱) فتوح البلدان، البلاذری، احمد بن یحی البلاذری، القاهرة، مکتبة النهضة المصرية، القسم الثالث ص ۵۷۱)

(۲) کسروی کسریٰ کی طرف نسبت ہے، اور کسریٰ دو گزرے ہیں، کسریٰ اوّل، جسے کسریٰ اکبر بھی کہا جاتا ہے، یہ ساسانی الاصل تھا، اور فارس پر ۵۳۱ تا ۵۷۹ حکومت کی، دُوسرے کسریٰ نے ۵۹۰ تا ۶۲۸ فارس پر حکومت کی، اسی کو ہرقل شاہِ رُوم نے شکست دی تھی، دَراہم کسرویہ کسریٰ اوّل کی طرف منسوب ہیں۔

اسی طرح زکوٰۃ، جزیہ اور سارے معاملات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں انہی کرنسیوں کے مطابق انجام پاتے تھے، آپ نے ان میں کسی قسم کا کوئی ردّ وبدل نہیں فرمایا، اور ڈلی کی شکل میں ان کے ساتھ تعامل جاری رکھا، جیسا کہ مشہور حدیث ہے:-

"الذھب بالذھب وزنا بوزن مثلا بمثل والفضة بالفضة وزنا بوزن مثلا بمثل، فمن زاد او استزاد فھو ربا۔[1]

''سونا سونے کے مقابلے میں برابر سرابر بیچو، اور چاندی چاندی کے مقابلے میں برابر سرابر بیچو، جس نے بڑھایا یا زیادہ مانگا، تو یہ رِبا ہے۔''

اسی طرح زمانۂ جاہلیت میں رُومی اور فارسی زَر کے ساتھ ڈلی کی شکل میں معاملات لوگ کرتے تھے۔

یہی صورتِ حال حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد میں بھی رہی، اور ان کرنسیوں میں کسی قسم کا کوئی تغیر واقع نہیں ہوا۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ابتدائی زمانۂ خلافت میں بھی یہی حال رہا، اور پہلے سے جاری شدہ کرنسیاں بحال رہیں، البتہ ۱۸ھ میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نقشِ کسروی کے مطابق دَراہم بنائے، جن کو'' دَراہم بغلیہ'' کہا جاتا تھا، کیونکہ یہ خچر کے سر کی طرح ہوتے تھے، اور جن شہروں میں اس قسم کا کوئی سکہ ڈھلتا، اس شہر کا نام اس پر تحریر کیا جاتا تھا، مثلاً دمشق، بعلبک وغیرہ۔ اور یہ کہنا بظاہر دُرست ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اسلامی تاریخ کے پہلے شخص ہیں جنھوں نے اسلامی سکہ رائج فرمایا۔

اگرچہ مورّخ بلیر کا موقف یہ ہے کہ خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے طبریہ میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے قبل سکہ ڈھالا تھا، یعنی ۱۵ھ میں۔

---

(۱) اخرجه مسلم، كتاب المساقاة، باب الربا۔

اور جب حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ خلیفہ بنے، تو انہوں نے ایسا سکہ بنایا، جس پر ''اللہ اکبر'' نقش تھا۔

حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں دِرہم اور فلوس اسلامیہ ڈھالے گئے تھے، اور جب کوفہ اور بصرہ میں زیاد کی ولایت بن گئی، تو انہوں نے حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دِرہم کی طرح دِرہم بنایا۔

بعد میں یزید، معاویہ دوم، مروان بن حکم نے سکہ سازی میں کوئی دِلچسپی نہیں لی، اگرچہ بعض خودمختار حکمرانوں مثلاً قطری بن فجاءۃ الخارجی، عبداللہ بن زبیرؓ اور مصعب بن زبیر نے ۷۰ھ میں سکہ بنایا تھا، چنانچہ کہا جاتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ پہلے شخص ہیں، جنہوں نے گول دِرہم بنایا، اور اس سے قبل گول دِرہم کا رِواج نہیں تھا۔

عبدالملک بن مروان (۶۵ تا ۸۶ھ) نے نظامِ زَر کی اِصلاح شروع کی، اور ۷۹ھ میں خالص اسلامی سکہ جاری کیا، چنانچہ عبدالملک بن مروان نے یہ سکہ حجاج بن یوسف الثقفی کے پاس بھیجا، اور حجاج نے مختلف اطراف میں پھیلایا، تاکہ اس کے مطابق سکے ڈھالے جائیں۔

عبدالملک بن مروان کے دورِ حکومت میں باقاعدہ نگران بورڈ تھا جو ''دارالضرب'' (جہاں سکے بنائے جاتے ہیں) کی نگرانی کرتا تھا، لہٰذا یہ کہا جاسکتا ہے کہ عبدالملک بن مروان تاریخِ اسلام میں زَر کے ''مصلحِ اوّل'' ہیں۔

عمر بن ہبیرہ والئ عراق (یزید بن عبدالملک کے عہدِ حکومت میں) خالد بن عبداللہ بجلی (ہشام بن عبدالملک کے زمانے میں) اور یوسف بن عمر، ان لوگوں نے سکہ کا معیار بہت بڑھایا، اور اس میں بہت سختی کی، اور خالص چاندی کا استعمال شروع ہوا، چنانچہ بنی اُمیہ کے دور میں ہبیری، خالدی اور یوسفی زَر سب سے عمدہ شمار ہوتا تھا، اور منصور تو خراج وغیرہ میں اس کے علاوہ کوئی اور زَر قبول بھی نہیں کرتے تھے۔

اس زمانے میں دِرہم کو کھوٹ سے سختی کے ساتھ بچایا گیا، اور بہت بڑا جرم قرار

دِیا گیا، چنانچہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے زمانے میں ان کے پاس ایک آدمی لایا گیا، جس نے شاہی سکہ کے خلاف سکہ بنایا تھا، تو انہوں نے اس کو سزا دِی اور اس کو جیل میں ڈلوا دِیا۔ عبدالملک بن مروان نے ایک آدمی کو اس طرح گرفتار کیا تھا، تو اس کا ہاتھ کاٹنے کا اِرادہ کیا، لیکن بعد میں اس کو معاف کیا، اور اس کو ویسی سزا دی۔

یہاں تک کہ دورِ عباسی آ گیا، اور یہ دور جب اِضطراب اور اِنتشار کا شکار ہوگیا، اور چھوٹی چھوٹی خودمختار ریاستیں وجود میں آگئیں، اس زمانے میں ملاوٹ اور کھوٹ کا سلسلہ شروع ہوگیا، جس کی کئی قسمیں بن گئیں:-

۱- وہ دَراہم جن میں تانبے یا پیتل کی نسبت چاندی کا مادّہ غالب رہتا تھا، یہ عباسی دور کا ابتدائی زمانہ تھا۔

۲- وہ دَراہم جن میں چاندی اور کھوٹ دونوں برابر سرابر تھے۔

۳- وہ دراہم جن میں چاندی کی نسبت دُوسرا مادّہ غالب تھا، یہ دَراہم ظاہر برقوق کے زمانے میں وجود میں آئے، اور ان کو "حمی زَر" کہا جاتا تھا۔ چنانچہ کتبِ فقہ میں "دَراہم بہرجہ، دَراہم ستوقہ" کی اِصطلاح اس قسم کے دَراہم کے لئے استعمال ہوتی ہے۔

چنانچہ ابنِ مماتی فرماتے ہیں کہ ۳۰۰ھ کے بعد چاندی کم ہوگئی، اور نایاب ہوگئی، اور مصر میں خالص دَراہم کی تعداد بہت کم ہوگئی، چنانچہ ان کی جگہ کھوٹ نے لیا، چنانچہ شام میں ایسے دَراہم وجود میں آئے کہ ان میں چاندی ایک تہائی (۱/۳) سے بھی کم تھی۔

کہا جاتا ہے کہ عضدالدولہ نے مخلوط دَراہم بنائے جن میں تانبا اور سیسہ بھرا ہوا تھا، تو شروع میں تجار نے ان کو لینے سے انکار کیا، صلاح الدین کی حکومت جب وسیع ہوگئی، اور سونا اور چاندی ختم ہوگئی، یعنی ان کا وجود نایاب ہوگیا، تو انہوں نے ایسے دَراہم بنائے جن میں چاندی دو تہائی رکھی، اور باقی دُوسرا مادّہ رکھا گیا۔ اور یہی دَراہم مصر اور شام میں بنوایوب میں رائج رہے، اسی طرح پیرس میں ایسے دَراہم وجود میں آئے جن میں ستر فیصد

چاندی اور باقی دُوسرا مادّہ ہوتا تھا۔

فلوس کی تاریخ

کہا جاتا ہے کہ فلوس سے قبل لوگ گندم وغیرہ بطورِ ثمن اِستعمال کرتے تھے، اس کے بعد تانبے وغیرہ کے فلوس رائج ہوگئے، اس کے بعد ٹیکسال (دارالضرب) میں باقاعدہ گول فلوس بنائے جانے لگے، لیکن ان فلوس کی حیثیت بہت گئی گزری تھی، ان سے معمولی قسم کے معاملات انجام پایا کرتے تھے۔

مراجعتِ کتب سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے عربی فلس حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ١٧ھ میں ''بزنطی'' طرز پر بنایا، یہ فلوس بلادِ مصریہ میں پھیل گئے، ان فلوس پر عربی حروف میں ان کا نام بھی درج تھا۔

اس کے بعد ایسے فلوس بنائے گئے، جن پر ڈھالے جانے کی تاریخ اور مقام کا نام بھی درج ہوتا تھا، ان فلوس میں قدیم ترین فلوس ٩٠ھ کے ہیں۔

ابوالفضل حنفی نے خراسان میں فلوس کو خوب رِواج دیا، چنانچہ وہ فلوس کے بارے میں کہتے تھے:-

"ھی فینا بمنزلة الفضة عندھم"

''یعنی فلوس ہمارے نزدیک فلوس کی حیثیت وہی ہے، جو ان کے ہاں چاندی کی ہے۔''

اس زمانے میں اسی زَر سے معاملات ہونے لگیں، اور یکے بعد دیگرے بادشاہ فلوس بناتے رہیں، لیکن ٦٥٠ھ میں لوگوں کے پاس فلوس بہت زیادہ ہوگئے۔

تقریباً ٧٢٠ھ کے لگ بھگ امیر محمود نے قاہرہ میں فلوس ڈھالنے لگے، اور دَراہم کو ختم کردیا، اور فلوس ہی سونے اور دُوسرے معاملات کا معیار قرار دیا گیا، اب اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس زمانے میں فلوس ہی نے اصل زَر کی حیثیت اختیار کی۔

فلوس نے جب اصل زر کی حیثیت اختیار کی، تو ان کے اوزان اور ان کی تحدید بھی کی گئی، چنانچہ ۸۲۸ھ میں بادشاہ نے اعلان کیا کہ فلوس میں ہر رطل بارہ درہم کا برابر ہوگا، اس کے بعد اس کی قیمت زیادہ ہوگئی، اور اعلان کیا گیا کہ ہر رطل ۱۸ دِرہم کا ہوگا۔[1]

سکہ بنانے کا حق کس کو حاصل ہے؟

قانوناً تو یہ بات طے شدہ ہے کہ سکہ بنانے کا اِختیار صرف حکومت کو حاصل ہے، عامۃ الناس سکہ نہیں بنا سکتے، اور اس طرح کرنا بہت بڑا قانونی جرم سمجھا جاتا ہے، اور اس پر تعزیری سزا جاری ہوتی ہے، لیکن شرعاً آیا سکہ بنانے کا اِختیار کسی فرد کو حاصل ہے؟ اس سلسلے میں جمہور علماء کا اس بات پر اِتفاق ہے کہ شرعاً بھی سکہ بنانے کا اِختیار صرف حکومت کو حاصل ہے، کسی فرد کو ہرگز یہ اِختیار حاصل نہیں کہ وہ کسی ملک کا سکہ بنائے، خواہ وہ سکہ، سکۂ سلطانی کے موافق ہو یا اس سے مختلف ہو، اور اگر کسی نے اس طرح حرکت کی، تو یہ فساد فی الارض کے قبیل میں ہوگا، اور ایسا شخص مستحقِ تعزیر ہوگا، چنانچہ روایات میں آتا ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کے پاس ایک ایسا شخص لایا گیا جس نے سکہ سلطانی کے خلاف اپنے طور پر سکہ بنایا تھا، انہوں نے اس کو سزا دی، اس کو جیل میں ڈلوادِیا، اور اس کا سکہ جلادِیا۔

اسی طرح حضرت عبدالملک بن مروان نے ایک شخص کو گرفتار کروایا جس نے سکہ سلطانی کے خلاف سکہ بنایا تھا، انہوں نے اس کا ہاتھ کاٹنا چاہا، لیکن بعد میں اس کو معاف کیا، اور اس کو دُوسری قسم کی سزا دی۔

ڈاکٹر عدنان ترکمانی کہتے ہیں:-

وکرہ ذلك الامام مالك، وقال: انہ من الفساد ولو کان

---

(۱) النقود الانتمانیۃ، العمر (ابراھیم بن صالح العمر) بیروت، دار العاصمۃ ۱۴۱۴ھ، ص۵۲ تا ۷۰

______ السیاسۃ النقدیۃ والمصرفیۃ، الترکمانی (الدکتور عدنان خالد الترکمانی) بیروت، مؤسسۃ الرسالۃ ۱۴۰۹ھ (ص۶۳)

الضرب علی الوفا کما روی عن سعید بن المسیب ان من یضرب النقود من غیر رجال الدولة او السلطة الحاکم یعتبر من الفساد فی الارض۔

اس کام کو حضرت اِمام مالکؒ نے مکروہ قرار دیا ہے، اور فرمایا کہ یہ از قبیلِ فساد ہے، اگرچہ اس کے سکہ کی بناوٹ بادشاہ کے سکہ کے موافق ہو۔ اور حضرت سعید بن مسیّبؒ سے روایت ہے کہ حکومت کے علاوہ اگر کسی شخص نے سکہ بنایا، تو یہ فساد فی الارض شمار ہوگا۔

البتہ حضراتِ حنفیہ کے ہاں اس کی گنجائش ہے، بشرطیکہ وہ سکہ سلطانی کے موافق ہو، اور اس سے اسلام اور مسلمانوں کو نقصان لاحق نہ ہو۔

لیکن چونکہ اگر یہ اختیار ہر کسی کو حاصل ہو کہ وہ سکہ بنائے، تو اس زمانے میں اس کا فساد ہونا، اور اس کے معاشی نقصانات بالکل واضح ہیں، اس لئے حنفیہ کا مذہب بھی جمہور کا موافق ہو جائے گا، اور اَب یہ سمجھا جائے گا کہ سکہ بنانے کا اِختیار صرف حکومت کو حاصل ہے، حکومت کے علاوہ کسی بھی فرد کو یہ اِختیار حاصل نہیں، خواہ اس کا بنایا ہوا سکہ سکہ سلطانی کے موافق ہو، یا مخالف ہو۔[1]

زَر اور اس کے شرعی و اِقتصادی وظائف

زَر کے وظائف (Functions) سے مراد یہ ہے کہ زَر اِنسانی معاشرے میں کیا کردار اَدا کرتا ہے، اور زَر بنی نوعِ اِنسان کی کیا خدمات انجام دیتا ہے۔

زَر کے وظائف کے سلسلے میں ہم جب معاشیات کی کتابوں اور علماء وفقہاء کی عبارات کی مراجعت کرتے ہیں، تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ زَر کے شرعی اور اِقتصادی وظائف تقریباً ایک جیسے ہیں، اس لئے ہم کتبِ فقہ اور کتبِ معاشیات کی روشنی میں ان

(۱) السیاسیة النقدیة والمصرفیة، التر کمانی (الدکتور عدنان خالد التر کمانی) بیروت، مؤسسة الرسالة ۱۴۰۹ھ (ص۶۷)

وظائف کا خلاصہ ذیل میں پیش کرتے ہیں، البتہ یہ بات یاد رہے کہ ماہرینِ معاشیات نے ان وظائف کو باقاعدہ عنوانات قائم کر کے ذِکر کیا ہے، اور فقہائے کرام نے باقاعدہ عنوانات کی تصریح کے ساتھ ان کو ذِکر نہیں کیا ہے، بلکہ زکوٰۃ اور سود وغیرہ کے مسائل کے بیان کے ضمن میں ان کی جو عبارات مذکور ہیں، ان سے یہ وظائف بآسانی اخذ کئے جاسکتے ہیں:

۱-آلۂ مبادلہ (Medium of Exchange)

زَر کا اوّلین فرض یہ ہے کہ یہ آلۂ مبادلہ کا کام دیتا ہے، یعنی اشیاء اور خدمات کے خریدنے اور بیچنے کے وقت استعمال ہوتا ہے، اگر زَر موجود نہ ہو، تو ہر شخص کو ضرورت کی چیزیں حاصل کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی شئ دینی پڑے گی، یعنی اشیاء کا براہِ راست اشیاء کے ساتھ تبادلہ کرنا پڑے گا، ایسے نظام کو مقایضہ (Barter) کہا جاتا ہے، اور اس میں کئی مشکلات پیش آتی ہیں، جیسا کہ گزشتہ صفحات میں تفصیل کے ساتھ ان کا ذِکر ہو چکا ہے، لیکن زَر کی بدولت یہ دُشواری ختم ہوگئی، اب ہر شخص اپنی چیزیں زَر کے عوض فروخت کر دیتا ہے، اور زَر کی مدد ہی سے اپنی ضرورت کی اشیاء یا خدمات خرید لیتا ہے، آلۂ مبادلہ کی حیثیت سے زَر اِنسانی معاشرے کے لئے بہت ہی نافع اور مفید ہے، اور اس کے بہت فوائد ہیں، مثلاً صنعت کار خام مال اور مشینری خرید سکتے ہیں، مزدوروں کو اُجرتیں ادا کر سکتے ہیں، زَر کی مدد سے ہر چھوٹی موٹی چیز خریدی جاسکتی ہے۔

۲-معیارِ قدر (Standard of Value)

زَر ''قدر'' کی پیمائش کے معیار کا کام دیتا ہے، جس طرح گندم کے وزن کی پیمائش باٹوں سے کی جاتی ہے، کپڑے کے طول وعرض کو میٹر یا گز سے ناپا جاتا ہے، اسی طرح چیزوں کی قدر و قیمت کو زَر کے معیار پر ماپا جاتا ہے، اس کی بدولت ہر شخص اپنی اشیاء کی قدر کا اندازہ کر سکتا ہے، مثلاً ریڈیو ایک ہزار روپے کا ہے، کپڑا تیس روپے گز ہے، کتاب سو روپے کی ہے، وغیرہ۔

۳-ذخیرہ قدر (Store of Value)

زر قدر کو جمع کرنے یا ذخیرہ کرنے کے کام آتا ہے، انسان کو دولت جمع کرنے کی ضرورت پڑتی ہے، تاکہ وہ آئندہ ضرورت پڑنے پر کام آسکے، یہ کام زر انجام دیتا ہے، کیونکہ کوئی اور شئ مثلاً گندم یا بکریاں یہ کام انجام نہیں دے سکتیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ اوّل تو یہ چیزیں فنا پذیر ہیں، اور دوم ان کی قیمت گھٹتی ہے، جبکہ زر کی قیمت عام حالات میں عام چیزوں کی طرح بدلتی نہیں رہتی، اور اس کے ضائع ہونے کا اِحتمال بھی کم ہوتا ہے۔

۴-آئندہ ادائیگیوں کا معیار (Standard of Deferred Payments)

انسانی معاشرے میں بعض ایسے باہمی معاملات ہوتے ہیں، جن کی ادائیگی اُدھار ہوتی ہے، مثلاً: قرض، اُدھار خرید وفروخت یہ مقصد زر کی مدد سے پورا ہوجاتا ہے، کیونکہ زر کی قدر میں بڑی حد تک اِستحکام پایا جاتا ہے۔

پروفیسر منظور علی کہتے ہیں:-

''غرض اگر زر نہ ہو، تو اِنسان کو اَشیاء پیدا کرنے اور تبادلہ کرنے کے لئے قدیم فرسودہ نظام کی جانب لوٹنا پڑے، اسی لئے یہ کہا جاتا ہے کہ انسانی تہذیب وتمدّن کی ترقی میں حصہ ڈالنے والی ایجادوں میں ''زر'' ایک بہت بڑی ایجاد ہے، کیونکہ اس کی وجہ سے انسانی تہذیب نے ترقی کے مرحلے تیزی سے طے کئے ہیں۔''(۱)

---

(۱) کتاب معاشیات حصہ دوم ص ۱۲۰

ـــــــــ احکام الاوراق النقدیة للجعید :

"وفیما یلی بین تلك الوظائف :

۱۔النقود وسیط للتبادل۔۔۔

۲۔ النقود مقیاس للقیمة۔۔۔

۳۔ النقود مخزن للقیمة۔۔۔

۴۔ النقود وسیلة للمدفوعات المؤجلة۔۔۔"ص ۲۱۔۲۲

(باقی اگلے صفحے پر)

اب آیئے دیکھتے ہیں کہ علمائے اسلام نے اس بارے میں کیا کہا ہے؟

علامہ ابن العربیؒ فرماتے ہیں:-

''دَراہم و دَنانیر کو توڑنا عظیم گناہ ہے، کیونکہ یہ اشیاء کی قیمتوں کو اَندازہ کرنے کا ذریعہ ہے، اور اَموال کی مقدار کی پہچاننے کا راستہ ہے، اور مبادلات میں استعمال ہوتے ہیں، یہاں تک کہ بعض علماء نے ان کو مقادیر کے اختلاف یا مقادیر کے مجہول ہونے کے وقت اموال کے درمیان ''قاضی'' کہا ہے، (یعنی جب اموال کی مقداریں مختلف ہوں، یا مجہول ہوں، تو دِرہم یا دَنانیر ہی اس

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

_____ السیاسیة النقدیة والمصرفیة فی الاسلام للترکمانی:

"ان للنقود وظیفتین اساسیتین ووظیفتین ثانویتین:

الوظائف الاساسیة للنقود : الوظیفة الاولی : النقود وسیط للتبادل---الوظیفة الثانیة : النقود کمعیار للقیمة--الوظائف الثانویة للنقود، الوظیفة الاولی ثبوت النقود فی الذمة، الوظیفة الثانیة : النقود مستودع للقیمة"ص٥٣۔

The Theory of Money and Credit by Ludwing Von Mises P:41Ch:1

Modren Econmic Theory by Dewet:

"Money performs five important functions:

1. It is serves as a medium of exchange.

2. It is used as a store of value.

3. It is standard for measuring values.

4. Money serves as a standard for deffered payments.

5. It transfers value."P:412

Introduction to Economic Principles:

" Money performs four main functions:

1/ common medium of exchang

2/ A common measure of value.....

3/ Store of value......

4/ A standard of deffered payments...."P315.

اختلاف اور جہالت کا تصفیہ کرتا ہے قاضی کی طرح۔"[1]

اس عبارت میں ابن العربی نے زر کے بنیادی وظائف بیان فرمائے ہیں، کہ زر قیمت کا معیار اور آلۂ مبادلہ ہے۔

علامہ ابن الہمامؒ نے بھی زر کو آلۂ مبادلہ قرار دیا ہے کہ:-

"ان دونوں کی تخلیق ہی اس مقصد کے لئے ہوئی ہے کہ ان کے ذریعہ دیگر اشیاء حاصل کی جائیں........۔"[2]

علامہ سرخسیؒ فرماتے ہیں:-

"زر کے ذریعے دیگر اشیاء کی قیمت معلوم کی جاتی ہے۔"[3]

علامہ ابن القاسم فرماتے ہیں:-

"سونا چاندی تمام اشیاء کی قیمتوں کا معیار ہے۔"[4]

علامہ ابن تیمیہؒ "فلوس" کے بارے میں فرماتے ہیں:-

"جو فلوس تعامل میں ہوں، ان میں اثمان کے معنی غالب کئے جائیں گے، اور لوگوں کے اموال کا معیار سمجھیں جائیں گے۔"[5]

علامہ ابن القیمؒ فرماتے ہیں:-

(۱) احکام القرآن, ابن العربی،(ابو بکر محمد بن عبد الله المعروف بابن العربی متوفی ۵۴۳،) بیروت, دارالمعرفة (۱۰۶۴/۳)

(۲) فتح القدیر (۱۵۵/۲)

(۳) المبسوط،السرخسی (شمس الدین السرخسی) بیروت،دارالمعرفة، ۱۴۱۴ھ (۱۹۳/۲)

دوسری جگہ فرماتے ہیں:"انه تقوم الاموال بهما وانه لا مقصود فيهما سوى انهما قيم الاشياء، وبهما تعرف خيرة الاموال ومقاديرها۔(۲۰/۳)

(۴) بحواله احکام الاوراق النقدية والتجارية(ص ۷۰)

(۵) مجموع الفتاوی (۳۶۸/۲۹)

''دراہم ودنانیر فروخت شدہ اشیاء کے اثمان ہیں، اور ثمن وہ معیار ہے، جس سے اموال کی قیمتیں متعین کی جاتی ہیں۔''(۱)

یہ چند حوالہ جات صرف بطورِ نمونہ بیان کیے گئے، جن سے بخوبی یہ اندازہ ہوسکتا ہے کہ علمائے اسلام کی عبارات میں زر کے وہی وظائف مذکور ہیں، جو ماہرینِ معیشت ذکر کرتے ہیں۔

نوٹ:- وظائفِ زر کی اس تفصیل میں آپ نے کہیں یہ نہیں دیکھا کہ کسی ماہرِ اقتصاد یا فقیہ نے زر کا یہ وظیفہ بھی بیان کیا ہو کہ یہ محلِ تجارت بھی ہے، جس سے یہ بات بالکل صاف طور پر سامنے آتی ہے کہ زر کا وظیفہ تجارت ہے ہی نہیں، لہٰذا ① زر کی تعریف، ② زر کی حقیقت اور ③ زر کے وظائف ان تینوں مباحث سے یہ بات واضح طور پر سامنے آگئی کہ زر صرف آلۂ مبادلہ ہے، آلۂ تجارت نہیں۔

اِفراطِ زر اور تفریطِ زر (Inflation and Deflation)

اس بحث کا اصل محل اس مقالے کا بابِ ششم ہے، جس کا عنوان ہی ''قدرِ زر'' (Value of Money) ہے، اس لیے اس کی اصل تفصیلات اِن شاء اللہ تعالیٰ اسی باب میں بیان کی جائیں گی، جن میں اِفراط وتفریطِ زر کے عوامل واسباب (Causes) اس کے اثرات (Effects) اور مختلف اَقسام واَنواع (Kinds) پر مفصل روشنی ڈالی جائے گی، یہاں ہم صرف اِفراط اور تفریطِ زر کے معنی وحقیقت بیان کرنے پر اِکتفاء کریں گے:

اِفراط اور تفریط ایک دُوسرے کی ضد کے طور پر اِستعمال ہوتے ہیں، کیونکہ لغوی معنی کے اعتبار سے ''اِفراط'' زیادت، مبالغہ اور کمال کو کہتے ہیں، جبکہ ''تفریط'' کمی اور تقصیر کو کہتے ہیں، لہٰذا اِفراطِ زر اور تفریطِ زر کے لغوی معنی زر کے بڑھنے اور گھٹنے کے ہوئے، اصل اِصطلاحی معنی بھی لغوی معنی کے قریب ہیں، کیونکہ:-

(۱) اعلام الموقعین (۲/۱۳۷، ۱۳۸)

جب زَر کا پھیلاؤ زیادہ ہو جائے، تو اَشیاء کی طلب (Demand) بڑھ جاتی ہے، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اشیاء کی قیمتوں میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے، اشیاء کی قیمتوں میں اضافے کی وجہ سے زَر کی قدر (Value) میں کمی آجاتی ہے، اس صورتِ حال کو "اِفراطِ زَر" (Inflation) کہا جاتا ہے، اس کے برعکس جب زَر کا پھیلاؤ کم ہو جائے، جس سے اشیاء کی قیمتوں میں کمی ہو جاتی ہے، اور زَر کی قدر میں اضافہ ہو جاتا ہے، تو اس صورتِ حال کو "تفریطِ زَر" (Deflation) کہا جاتا ہے۔[1]

خلاصہ یہ کہ زَر کے زیادہ پھیلاؤ سے اشیاء کی قیمت میں اضافہ اور زَر کی قدر میں کمی ہو جاتی ہے، اور کم پھیلاؤ کی صورت میں صورتِ حال معکوس ہو جاتی ہے، گویا کہ اشیاء کی قیمتیں اور زَر کی قدر دونوں متضاد سمتوں (Directions) میں سفر کرتے ہیں۔

قیمتِ شیٔ ↑ قدرِ زَر ↓ ←→ قیمتِ شیٔ ↓ قدرِ زَر ↑

اس اِصطلاح کی اصل حقیقت تو یہی ہے، لیکن بعد میں اس میں عموم ہوا، اور اس کو اَشیاء کی قیمتوں میں ہر اضافے کے لئے استعمال کیا گیا، خواہ وہ اِضافہ زَر کے پھیلاؤ کی وجہ سے ہو، یا دیگر عوامل کی وجہ سے، جس کی تفصیل بابِ ششم میں آئے گی۔



---

(۱) اسلام اور جدید معیشت و تجارت (ص ۱۰۸) جسٹس مفتی محمد تقی عثمانی

مراجع اضافیہ:-

زَر اور بنک داری (ص ۱۸۴) شیخ عطاء اللہ ایم اے

زَر اور بنکاری (ص ۸۳) شیخ مبارک علی

مقدمة في النقود والبنوك (ص۲۸) الدكتور محمد زكي الشافعي

بابِ دوم

رِبا (سود)

اَحکامِ زَر میں سب سے اہم حکم چونکہ ''رِبا'' (Interest) کا ہے، جیسا کہ اگلے ابواب سے اِن شاء اللہ تعالیٰ معلوم ہو جائے گا، اس لئے ضروری ہے کہ رِبا کی تعریف اور دیگر بعض متعلقہ باتوں کو اس باب میں اِختصار کے ساتھ بیان کیا جائے۔

تعریفِ ربا

''رِبا'' لغوی معنی کے اعتبار سے زیادتی اور بڑھوتری کو کہتے ہیں، اور اِصطلاحی معنی کے اعتبار سے اس کا اِطلاق دو معنوں پر ہوتا ہے:

رِبا النسیئہ اور رِبا الفضل

''رِبا النسیئہ'' کو رِبا القرآن، رِبا الجاہلیہ اور رِبا القرض بھی کہتے ہیں، اور ''رِبا الفضل'' کو رِبا الحدیث اور رِبا البیع بھی کہتے ہیں۔

رِبا النسیئہ کو رِبا القرآن اس لئے کہتے ہیں کہ قرآنِ کریم کی متعدّد آیات نے اس کو براہِ راست ممنوع قرار دیا ہے، جیسا کہ ''دلائلِ حرمت'' سے واضح ہو جائے گا، اور اس کو رِبا الجاہلیہ اس لئے کہتے ہیں کہ زمانۂ جاہلیت میں اس کا رِواج تھا، اور اہلِ جاہلیت بھی اس کو رِبا ہی کہتے تھے، اور اس کو رِبا القرض اس لئے کہتے ہیں کہ اس کا تعلق قرض سے ہے، کیونکہ نسیئہ کے معنی اُدھار کے ہیں۔

''رِبا الفضل'' کو رِبا الحدیث اس لئے کہتے ہیں کہ یہ قسم صرف الفاظِ قرآن سے

نہیں سمجھی گئی، بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیثِ مبارکہ سے معلوم ہوئی، جیسا کہ ''دلائلِ حرمت'' سے واضح ہو جائے گا، اور اس کو رِبا البیع اس لئے کہتے ہیں کہ اس کا تعلق بیع سے ہے، کیونکہ فضل کے معنی زیادت کے ہیں، چنانچہ ابن العربیؒ احکام القرآن[1] میں فرماتے ہیں:-

"الربا فی اللغة الزیادة، والمراد فی الآیة کل زیادة لا یقابلها عوض۔"

''رِبا لغت میں زیادتی کو کہتے ہیں، اور آیتِ کریمہ میں اس سے مراد ہر وہ زیادتی ہے، جس کے مقابلے میں کوئی عوض نہ ہو۔''

ابن العربیؒ کی یہ تعریف رِبا النسیئہ اور رِبا الفضل دونوں کو جامع ہے، کیونکہ ایسا اِضافہ جو کسی عوض کے مقابلے میں نہ ہو، یہ رِبا النسیئہ میں بھی پایا جاتا ہے، کیونکہ اس میں اپنا قرض پورا پورا لیا جاتا ہے، اور اس پر سود (Interest) کے نام سے جو اِضافہ ملتا ہے، وہ بے معاوضہ ہوتا ہے، اور رِبا الفضل میں بھی پایا جاتا ہے، کیونکہ اس میں دو چیزوں کا مبادلہ ہوتا ہے، اور کسی ایک جانب میں ایسی زیادتی پائی جاتی ہے، جو کسی معاوضے کے بدلے میں نہیں ہوتی، لہٰذا ابن العربیؒ کی تعریف اپنی جامعیت کی بناء پر عمدہ تعریفات میں شمار کی جاتی ہے۔

اِمام ابوبکر جصاصؒ اَحکام القرآن[2] میں رِبا کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

"وهو القرض المشروط فیه الاجل وزیادة مال علی المستقرض"

''قرض کا وہ معاملہ جس میں ایک مخصوص مدتِ ادائیگی اور مقروض پر

---

(۱) احکام القرآن، ابن العربی (محمد بن عبداللہ م ۵۴۳ھ) بیروت، دار المعرفة، طبع سوم ۱۳۹۲ھ (۱/۲۴۲)۔

(۲) احکام القرآن، الجصاص (احمد بن علی الجصاص م ۳۷۰ھ) سهیل اکیڈمی لاهور پاکستان (۱/۵۵۷)

مال کی کوئی زیادتی متعین کرلی گئی ہو۔“

علامہ جصاص نے ”القرض“ کی قید لگا کر اس تعریف کو اس قسم کے ساتھ خاص کردیا، یعنی رِبا النسیئہ کے ساتھ۔

جسٹس مفتی محمد تقی عثمانی صاحب علامہ جصاص کی اس تعریف کے بارے میں فرماتے ہیں:-

”وان هذا التعريف يشمل سائر انواع ربا النسئية وكان هذا الربا محرما فى سائر الاديان السماوية، وتوجد نصوص تحريمه حتى الآن فى مجموعة الكتاب المقدس، وراجع سفر الخروج ۲۲:۲۵ وسفر الاحبار ۲۵:۳۵ وسفر التثنية ۲۳:۲۰ من اسفار التوراة، وزبور داؤد عليه السلام ۵:۱۵، وسفر امثال سليمان عليه السلام ۲۸:۸ وسفر نحمياه ۵:۷، وسفر حزقيل عليه السلام ۱۸:۸، ۱۳، ۱۷، ۱۲، ۲۲“

”یہ تعریف رِبا النسیئہ کی تمام اَقسام کو شامل ہے، اور رِبا کی یہ قسم تمام آسمانی اَدیان میں حرام رہی ہے، چنانچہ اس کی حرمت کی نصوص ابھی تک کتابِ مقدس میں موجود ہیں، اس کے لئے ملاحظہ ہوں: خروج: ۲۲:۲۵، احبار: ۲۵:۳۵، استثناء: ۲۳:۲۰، زبورِ داؤدی: ۵:۱۵، سفر امثال سلیمان علیہ السلام: ۲۸:۸، سفر نحمیاہ: ۵:۷، اور اسفار حضرت حزقیل علیہ السلام: ۱۸:۸، ۱۳، ۱۷، ۲۲، ۱۲۔“[1]

---

(۱) تکملہ فتح الملہم شرح صحیح مسلم (جسٹس مفتی محمد تقی عثمانی) کراچی، مکتبہ دار العلوم کراچی ۱۴ طبع اوّل ۱۴۰۵ھ (۱/ ۵۶۷)۔

''رِبا النسیئہ'' کی تعریف پر مشتمل ایک مشہور حدیث کی تشریح و تحقیق

"کل قرض جر نفعا فھو ربا" رواہ الحارث بن ابی اسامة فی مسندہ عن علی رفعہ

''حارث بن ابی اُسامہ نے اپنے ''مسند'' میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کی ہے، کہ جو قرض کچھ نفع کمائے، وہ رِبا ہے۔''[1]

اس حدیث شریف میں ''قرض'' کا لفظ موجود ہے، اس لئے اس کا تعلق رِبا النسیئہ سے ہی ہے۔

اس روایت پر سندی حیثیت سے اگر چہ جرح ہوئی ہے، لیکن چونکہ دُوسری روایات وآثار سے اس کی تائید ہوتی ہے، اس لئے یہ حدیث حسن لغیرہ ہے، اور محدثین کرام کے نزدیک صالح للعمل ہے، بلکہ اُمت کی طرف سے اس کو "تلقی بالقبول" حاصل ہے، جیسا کہ مفتیٔ اعظم مولانا محمد شفیع صاحب ''مسئلہ سود''[2] میں اس حدیث سے متعلق فرماتے ہیں:-

> ''یہ حدیث علامہ سیوطی نے جامع صغیر میں نقل کی ہے، اور فیض القدیر شرح جامع صغیر میں اگر چہ اس کی سند پر جرح کی ہے، اسناد کو ضعیف بتلایا ہے، لیکن اس کی شرح سراج المنیر عزیزی نے اس کے متعلق یہ الفاظ لکھے ہیں: قال الشیخ: حدیث حسن لغیرہ، یعنی یہ حدیث حسن لغیرہ ہے، کیونکہ دُوسری روایات وآثار سے اس کی تائید ہوتی ہے، بہر حال یہ روایت محدثین کے نزدیک صالح للعمل ہے۔''

---

(۱) کشف الخفاء، الجراحی (اسماعیل بن محمد العجلونی الجراحی م ۱۱۶۳ھ) بیروت، مؤسسة الرسالة، طبع سوم ۱۴۰۳ھ (۲/۱۶۴)

(۲) مسئلہ سود (ص ۱۵)، ادارۃ المعارف کراچی طبع جدید، ۱۳۹۹ھ۔

اِمام الحرمینؒ اور اِمام غزالیؒ نے بھی اس حدیث کو صحیح قرار دِیا ہے۔[1]

نیز یاد رکھنا چاہیئے کہ جمہور فقہاء و محدثین نے اس حدیث کو ایک اُصول کے طور پر قبول کیا ہے، اور فقہاء و محدثین کی یہ "تلقی بالقبول" اس بات کی بذاتِ خود ایک مستقل دلیل ہے کہ یہ اُصول قرآن وسنت کے عین مطابق ہے، لہٰذا بعض عربی مصنّفین اور علماء[2] کا اس حدیث کو دیگر احادیث کا معارض قرار دینا یا اس کی صحت سے بالکل انکار کرنا دُرست نہیں۔

مذکورہ حدیث میں "منفعت" سے مراد ہر وہ منفعت مراد ہے، جو مشروط یا معروف ہو، کیونکہ معروف بھی بیشتر اَحکامِ شرعیہ میں مشروط کے حکم میں ہے، چنانچہ اِمام ابوبکر جصاصؒ وغیرہ نے جو تعریف بیان فرمائی ہے، اس میں "المشروط" کی قید اس لئے لگائی ہے، نیز منفعت عام ہے، خواہ مال کی شکل میں ہو، یا کسی اور شکل میں ہو، لہٰذا اب مذکورہ حدیث کا مطلب یہ ہوا کہ "قرض کی وجہ سے جو بھی مشروط یا معروف نفع خواہ وہ کسی بھی شکل میں ہو، حاصل ہو، وہ سود ہے، اور اس سے بچنا واجب ہے۔"

مذکورہ بالا تشریح ومطلب میں دو باتیں آگئیں:-

۱- حدیث میں نفع سے مراد مشروط یا معروف نفع ہے۔

۲- نفع عام ہے، خواہ کسی بھی شکل میں ہو۔

---

(۱) تلخیص الحبیر، العسقلانی (علامه ابن حجر العسقلانی م ۸۵۲) الریاض، مکتبه نزار مصطفی الباز، طبع اول ۱۴۱۷ھ (۹۹۷/۳)

"قال عمر بن بدرفی المغنی: لم یصح فیه شئی، واما امام الحرمین، فقال: "انه صحیح" وتبعه الغزالی۔

——— فتح القدیر (۳۵۶/۶)

(۲) ان میں سے ڈاکٹر رفیق یونس مصری (الجامع فی اصول الربا)، شیخ صالح بن فوزان الفوزان (الفرق بین البیع والربا)، اور ڈاکٹر عبداللہ بن محمد بن حسن السعیدی (الربا فی المعاملات المصرفیة المعاصرة)۔

پہلی بات کی دلیل وہ تمام احادیث وروایات ہی، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے کئی واقعات میں قرض لے کر ادائیگی کے وقت کچھ زیادہ عطاء فرمایا۔[1]

اور دُوسری بات کی دلیل یہ ہے کہ اَئمہ اَربعہؒ نے بہت سی ایسی صورتوں کو ممنوع قرار دیا ہے، جن میں مقرض کو اپنے دیئے ہوئے قرض پر کچھ نفع حاصل ہو رہا ہے، حالانکہ وہ نفع ''مال'' کی شکل میں نہیں ہوتا، اور ممانعت کی بنیاد یہی حدیث شریف ہے، مثلاً:

۱- شیٔ مرہون سے مشروط یا معروف اِنتفاع حرام ہے۔[2]

۲- قرض خواہ کے لئے مقروض کی سواری پر سوار ہونا یا قرض کی وجہ سے اس کے گھر میں کھانا کھانا جائز نہیں۔[3]

۳- اگر کوئی کسی کو اس شرط پر قرض دے کہ مقروض اس کو اَپنا مکان فروخت کرے گا، تو یہ ناجائز ہے۔[4]

۴- ''سُفْتَجَہ'' کو اسی حدیث کی بناء پر اَئمہ نے ممنوع قرار دِیا ہے، حالانکہ اس

---

(۱) مجمع الزوائد، الهيتمي (الحافظ نورالدين علي بن ابي بكر الهيتمي م۸۰۷ھ) بيروت، لبنان، دارالكتاب طبع دوم ۱۹٦۷ء، (۱٤۱/٤)

"استسلف النبي ﷺ من رجل من الانصار اربعين صاعا، فاحتاج الانصاري فاتاه، فقال رسول ﷺ :ماجاء نا شيء، فقال الرجل واراد ان يتكلم، فقال رسول الله ﷺ : لا تقل الاخيرا، فانا خير من تسلف، فاعطاه اربعين فضلاواربعين لسلفه فاعطاه بمائتين-"

"عن عطاء بن يعقوب قال: استسلف ابن عمر مني الف درهم فقضاني اجودمنها، فقلت له : ان دراهمك اجود من دراهمي، قال: ماكان فيها من فضل نائل لك من عندى- ومالى ذلك من الاحاديث-

(۲) الدرالمختار وردالمحتار (۱۰/۷۰)

(۳) الفقه الاسلامي وادلته الزحيلي (الدكتور وهبه الزحيلي) بيروت دارالفكر (۷۲٤/٤)

(٤) مرجع سابق

میں کوئی زیادتِ مال نہیں۔[1]

لہٰذا یہ کہنا کہ منفعت جو حرام ہے اس سے مراد صرف ''زیادتِ مال'' ہے، دُرست نہیں، جیسا کہ ماضی قریب کے ایک ماہرِ اِقتصاد شیخ محمود احمد مرحومؒ[2] نے علامہ جصاصؒ وغیرہ کی تعریفات کے ظاہر کو دیکھ کر یہ بات کی ہے، کیونکہ ان تعریفات میں ''مال'' کا لفظ موجود ہے۔

حالانکہ ان تعریفات میں ''مال'' کی قید تغلیباً ہے، کیونکہ زمانۂ جاہلیت میں زیادہ تر اسی طرح ہوتا تھا، تو یہ کوئی قید اِحترازی نہیں، کیونکہ اس صورت میں علامہ جصاصؒ کی تعریف خود مذکورہ حدیث (جس میں منفعت عام ہے) کی معارض ہو جائے گی، نیز بہت سارے علمائے اسلام نے رِبا کی تعریف میں ''مال'' کی کوئی قید نہیں لگائی ہے۔[3]

خلاصہ یہ کہ مذکورہ حدیث کی رُو سے قرض پر ہر مشروط یا معروف نفع حاصل کرنا خواہ وہ کسی بھی شکل میں ہو، ''رِبا النسیئہ'' ہے، اور قرآن وحدیث کی روشنی میں حرام اور ممنوع ہے، اور اس سے بچنا ضروری ہے۔

اور "سفتجہ" اس کی جمع سفاتج ہے، اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ زید مثلاً تاجر ہے، تو عمرو اس قرض دیتا ہے، لیکن عمرو اس کو قرض دیتے وقت یہ شرط عائد کرتا ہے کہ یہ قرض میرے شہر میں جو میرا دوست یا میرے والد ہیں، ان کو اَدا کرنا، اس کو فقہائے کرام نے ممنوع قرار دیا ہے، کیونکہ اس میں مقرض یعنی عمرو کو راستے کے خطرات سے بچاؤ کا فائدہ حاصل ہوتا ہے، جو ''قرض جر نفعا'' میں داخل ہے، اور ممنوع ہے۔ دیکھئے! الشامیہ (۲۹۸/۷)۔

---

(۱) الفقہ الاسلامی وادلتہ (۷۲۴/۴)

(۲) کتاب سود کی متبادل اساس۔ شیخ محمود احمد، ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور، طبع اوّل ۱۹۸۶ء۔

(۳) مسئلہ سود۔

ربا الفضل

ربا الفضل سے مراد وہ اضافہ ہے جو کچھ مخصوص اجناس کے باہمی تبادلے پر حاصل ہو۔

ربا الفضل کے سلسلے میں حدیث مشہور ہے، جسے ''اشیائے ستہ'' والی حدیث کہتے ہیں، کیونکہ اس میں چھ چیزوں کا ذِکر موجود ہے، اس حدیث کے الفاظ ذیل میں ملاحظہ فرمائیں!

"الذهب بالذهب مثلا بمثلا والفضة بالفضة مثلا بمثل، والتمر بالتمر مثلا بمثل والبر بالبر مثلا بمثل، والملح بالملح مثلا بمثل، والشعير بالشعير مثلا بمثل فمن زاد اوازداد فقد اربى، بيعوا الذهب بالفضة كيف شئتم يدا بيد، الحديث [۱]

''سونے کو سونے کے بدلے میں برابر سرابر بیچو، چاندی کو چاندی کے بدلے میں برابر سرابر بیچو، کھجور کو کھجور کے بدلے میں برابر سرابر بیچو، گندم کو گندم کے مقابلے میں برابر سرابر بیچو، نمک کو نمک کے بدلے میں برابر سرابر بیچو، جو کو جو کے بدلے میں برابر سرابر فروخت کرو، لیکن جو شخص اِضافے کا لین دین کرے، وہ رِبا کا معاملہ کرے گا، البتہ سونے کو چاندی کے بدلے میں جس طرح چاہے، فروخت کرو، بشرطیکہ دست دَر دست ہو، اور جو کو کھجور کے بدلے میں جس طرح چاہو، فروخت کرو، بشرطیکہ دست دَر دست ہو۔''

یہ حدیث مختلف کتابوں [۲] میں مختلف الفاظ کے ساتھ آئی ہے، لیکن حاصل سب کا

---

(۱) كنز العمال، المتقى (علاء الدين على المتقى الهندى) عدد الحديث ۹۶۶۹۔

(۲) مثلاً: صحيح مسلم، القشيرى (ابو الحسين مسلم بن الحجاج القشيرى) باب المساقاة
صحيح البخارى، البخارى (ابو عبد الله محمد بن اسماعيل البخارى) باب المساقاة
سنن ابى داؤد السجستانى (سليمان بن الاشعث بن اسحاق السجستانى)، البيوع

ایک ہی ہے، اور وہ یہ کہ مخصوص اجناس کے باہمی تبادلے کے وقت کسی ایک جانب اِضافے سے آپ نے ممانعت فرمائی ہے۔

اس حدیث شریف میں صرف چھ چیزوں کا ذِکر ہے، لیکن اس پر اِتفاق ہے کہ رِبا صرف ان چھ چیزوں کے تبادلے میں منحصر نہیں، بلکہ اور چیزیں بھی اس ممانعت میں آسکتی ہیں، اب یہ کس طرح معلوم ہوگا، اس کے لئے مجتہدین نے ''تعلیل'' کا سہارا لیا، یعنی اس حدیث میں سوچا گیا کہ ان چیزوں کے باہمی تبادلے میں اِضافے کو کس علت کی بنیاد پر ممنوع قرار دیا ہے؟ چنانچہ ہر مجتہد نے اِجتہاد کرکے اپنے اجتہاد کے مطابق علت نکالی، اور اس علت پر مزید اَحکام متفرّع کیے، جس کی تفصیل کتبِ فقہ اور کتبِ اُصولِ فقہ میں مذکور ہے۔

حرمتِ رِبا کے دلائل کا خلاصہ

اَلَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا یَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا یَقُوْمُ الَّذِیْ یَتَخَبَّطُهُ الشَّیْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا۔ الآیۃ(۱)

''جو لوگ سود کھاتے ہیں، ان کا حال اس شخص کا سا ہوتا ہے، جسے شیطان نے چھوکر باؤلا کر دیا ہو، اور اس حالت میں ان کے مبتلا ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ تجارت بھی تو آخر سود ہی جیسی چیز ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے تجارت کو حلال کیا ہے، اور سود کو حرام الخ''

یَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَیُرْبِی الصَّدَقٰتِ وَاللّٰهُ لَا یُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِیْمٍ(۲)

---

(۱) سورۃ البقرۃ آیت ۲۷۵

(۲) سورۃ البقرۃ آیت ۲۷۶

''اللہ سود کو مٹاتا ہے، اور خیرات کو بڑھاتا ہے، اور تمام ایسے لوگوں کو ناپسند کرتے ہیں، جو ناشکرے اور گنہگار رہوں۔''

"يَآيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا اتَّقُوا اللهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ، فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَأْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللهِ وَرَسُوْلِهٖ الآية"[1]

''اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، اور جس قدر سود رہ گیا ہے، اسے چھوڑو، اگر تم ایمان والے ہو، اگر تم نے ایسا نہیں کیا، تو پھر اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ جنگ کے لئے تیار ہو جاؤ......''

"يَآيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَا تَأْكُلُوا الرِّبٰوا اَضْعَافًا مُّضَاعَفَةً الآية"[2]

''اے ایمان والو! سود مت کھاؤ چند در چند......''

عن ابن مسعود قال: لعن رسول الله ﷺ آكل الربا وموكله[3]

وفي رواية لمسلم وغيره: لعن رسول الله ﷺ آكل الربا، وموكله وكاتبه وشاهديه، وقال: هم سواء"

''آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سود کھانے والے اور کھلانے والے پر لعنت کی ہے، اور ایک روایت میں ہے، کہ آپ نے سود کھانے، سود کھلانے، لکھنے اور اس کے گواہ بننے والوں پر لعنت کی ہے، اور یہ بھی فرمایا کہ وہ سب برابر ہیں۔''

(۱) سورة البقرة آیت ۲۷۸

(۲) سورة البقرة آیت ۲۸۱

(۳) بخاری كتاب الطلاق، مسلم كتاب المساقاة، ابوداؤد كتاب البيوع، وغيرها

"الربا بضع وسبعون بابا والشرك مثل ذلك"[1]

''سود کی خرابیاں ستر سے اُوپر ہیں، اور شرک اس کے برابر ہے۔''

"الدرهم يصيبه الرجل من الربا اعظم عند الله من ثلاثة وثلاثين زينة يزنيها في الاسلام۔"[2]

''سود کا ایک درہم اللہ کے نزدیک تینتیس مرتبہ زِنا سے بھی زیادہ بڑھ کر ہے، جو زِنا حالتِ اسلام میں انسان کرے۔''

"الربا ثلاث وسبعون بابا ايسرها مثل ان ينكح الرجل امه"[3]

''سود کے تہتر قسم کی خرابیاں ہیں، ان میں سب سے معمولی یہ ہے کہ آدمی اپنی ماں سے بدکاری کرے۔''

"ماحد اكثر من الربا الا كان عاقبة امره الى قلة۔"[4]

''جس شخص نے سود کے ذریعے سے زیادہ مال کمایا، انجام کار اس میں کمی ہی ہوگی۔''

"اذا ظهر الزنا والربا في قرية فقد احلوا بانفسهم عذاب الله۔"[5]

''کسی بستی میں زِنا اور سود کا کاروبار پھیل جائے، تو بستی والوں نے اللہ کا عذاب اپنے اُوپر اُتار لیا۔''

---

(۱) رواه البزار ورواته رواة الصحيح، وهو عند ابن ماجه باسناد صحيح باختصار۔

(۲) الطبراني الكبير، الطبراني (سليمان بن احمد م ۳۶۰ھ)

(۳) مستدرك حاكم، الحاكم (محمد بن عبدالله الحاكم م ۴۰۵ھ)، بيروت، دارالكتب العلمية، ۱۴۱۱ھ

(۴) ابن ماجه والحاكم

(۵) المستدرك للحاكم

"مامن قوم یظهر فیهم الربا الا اخذوا بالسنة "الحدیث [1]

''جس قوم میں سود پھیل جائے، وہ یقیناً قحط سالی میں مبتلا ہوجاتی ہے۔''

"بین یدی الساعة یظهر الربا"الحدیث [2]

''قیامت سے پہلے سود کی کثرت ہوجائے گی۔''

"لیاتین علی الناس زمان لا یبقی احد الا اکل الربا، فمن لم یاکله اصابه من غباره۔" [3]

''ایک زمانہ آئے گا کہ کوئی بھی شخص سودخوری سے بچے گا نہیں، اور اگر وہ بچ بھی گیا، تو اس کا اثر اس تک ضرور پہنچے گا۔''

یہ چند قرآنی آیات اور اَحادیثِ مبارکہ ہم نے سود اور رِبا کی وعید سے متعلق یہاں ذکر کی، یہ صرف بطور ایک نمونے کے ہیں، ورنہ سودخوری کی سزاوں سے متعلق اور بھی متعدّد اَحادیث اور رِوایات موجود ہیں، جن میں سودخوری اور سودی معاملات کرنے کے بارے میں بہت شدید وعیدیں اور سزائیں مذکور ہیں، اگر ان احادیث کی تفصیل مطلوب ہو، تو مفتیٔ اعظم مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کے مشہور رسالہ ''مسئلہ سود'' کا مطالعہ فرمایا جائے، جو خاص سود ہی کے موضوع پر ہے، اور اس میں سود کی وعیدوں سے متعلق چہل حدیث موجود ہیں۔

نیز شرکت و مضاربت کے موضوع پر ڈاکٹر عمران اشرف عثمانی صاحب کا مقالہ بھی ان احادیث کے مطالعے کے لئے موزوں ہے، یہ مقالہ پی ایچ ڈی کے لئے لکھا گیا ہے، اور جامعہ کراچی نے منظور کیا ہے، اور اب مطبوعہ شکل میں دستیاب ہے۔

---

(۱) مسند احمد بن حنبل

(۲) المعجم الطبرانی

(۳) سنن ابی داؤد

اللہ تعالیٰ سود کی لعنت سے اور اس کی وعیدوں سے پوری اُمتِ مسلمہ کو محفوظ رکھے۔

علت کے معنی اور علت وحکمت میں فرق

لغت میں ''علت'' عین کے کسرے کے ساتھ ''بیماری'' کو کہتے ہیں، اور اِصطلاح میں علت کی متعدّد تعریفات کی گئی ہیں:۔(۱)

''علت'' کی مشہور تعریف کا حاصل درج ذیل ہے:۔

''علت اس شئ کو کہتے ہیں جو نص کے حکم کے لئے علامت ہو، اور نص میں موجود ہو، اور جب یہ علامت غیر نص (فرع) میں پائی جائے، تو اس کی بنیاد پر غیر نص کو بھی وہ حکم مل جاتا ہے۔''(۲)

---

(۱)،مباحث العلة فی القیاس عند الاصولیین، الھیتی (عبدالحکیم عبد الرحمن السعد السعدی الھیتی العراقی، بیروت، لبنان، دارالبشائر الاسلامیة طبع اول ۱۴۰۲ ھج (ص۲۸)۔
"واما بالکسر فانها تأتی بمعنی المرض---وعلماء الاصول لهم تعریفات کثیرة للعلة---اھ"

(۲)کشف الاسرار شرح نورالانوار، النسفی (ابو البرکات عبد الله بن احمد المعروف ب"حافظ الدین النسفی" م ۷۱۰ھج)،بیروت، دارالکتب العلمیه،، طبع اول ۱۴۰۲ اھ
"ماجعل علما علی حکم النص مما اشتمل علیه النص وجعل الفرع نظیرا له فی حکمه بوجوده فیه "(۲۴۸/۲)

______ حاشية جامع الاسرار فی المنار للنسفی للکاکی، الافغانی (فضل الرحمن عبد الغفور الافغانی)
"قلت: اختلفت عبارات الاصولیین فی تعریف العلة واوضح تعریفاتها واحسنها فی نظری هو ما عرفه بعضهم بقوله :
"الوصف الخارج المناسب للحکم بحیث یکون مضافاالیه "(۱۱۸۴/۴)
''علت اس خارجی وصف کو کہتے ہیں، جو حکم کے لئے مناسب ہو، اور حکم اس کی طرف مضاف ہو۔''

The Historic Judgment on Interest
Justice Muhammad Taqi Usmani
"The Illat is the basic feature of a transaction without which the relevant law cannot be applied to it ."P: 80

لیکن تمام تعریفات کا جو حاصل نکلتا ہے، وہ یہ ہے کہ علت غیر منصوص میں مدارِ حکم ہوتی ہے، اگر علت ہو، تو حکم بھی موجود ہوگا، اور اگر علت نہ ہو تو حکم بھی موجود نہیں گا، البتہ علت منصوص میں مدارِ حکم نہیں ہوتی، اور نہ ہی منصوص میں حکم اس کی طرف مضاف ہوتا ہے، بلکہ یہاں حکم خود نص کی طرف مضاف ہوگا، لأن النصّ اولٰی واقوای من العلة۔[1]

حکمت (Wisdom):- حکمت لغت میں مضبوطی اور اِستحکام کو کہتے ہیں، اور اِصطلاح میں حکمت کی تعریف درج ذیل ہے:-

> "حکمت اس مصلحت کو کہتے ہیں، جس کی وجہ سے کوئی حکم مشروع ہوا ہو، خواہ وہ مصلحت منفعت کے حصول کی شکل میں ہو، یا دفعِ ضرر کی شکل میں۔"[2]

یعنی شارع نے کسی کام کو کرنے کا حکم دیا ہے، یا کسی کام کرنے سے منع کیا ہے،

---

(۱) نسمات الاسحار علی المنار، الشامی (علامه ابن عابدین الشامی) کراچی، ادارة القرآن والعلوم الاسلامیه طبع سوم ۱۴۱۸ھ

"ثم هو علم علی الحکم فی الفرع عند اکثر مشائخنا لان الحکم فی الفرع مضاف الیه لا الحکم فی الاصل عندهم" (ص۲۱۷)

(۲) حکمة التشریع الاسلامی فی تحریم الربا، ڈاکٹر یوسف حامد العالم، دارجامعه ام درمان الاسلامیه، طبع اول ۱۴۰۳ھ (ص ۳۰)

"من المتفق علیه بین جمهور العلماء المسلین ان الله سبحانه وتعالی ماشرع حکماالا لمصلحة عباده وان هذه المصلحة اما جلب نفع لهم واما دفع ضرر عنهم"

مباحث العلة فی القیاس عند الاصولیین، الهیتی (عبد الحکیم عبدالرحمٰن):

"فالجمهور یطلقها علی مایترتب علی التشریع من جلب مصلحة او تکمیلها او دفع مفسدة او تقلیلها" (ص ۱۰۵)

The Historic Judgment on Interest (by Justice Muhammad Taqi Usmani)
"The Hikmahat is the wisdom and the philasophy taken into account by the legislator while framing the law....."P:80

"حکمت اس مصلحت اور فلسفے کو کہتے ہیں، جو مقنن قانون وضع کرتے وقت پیش نظر رکھتا ہے۔"

اس میں پیشِ نظر یہ ہے کہ بندہ اس کام کرنے کی وجہ سے فلاں فائدہ حاصل کرے، یا فلاں نقصان سے بچ جائے، یا ممانعت کی صورت میں کام نہ کرنے کی وجہ سے فلاں فائدہ حاصل کرے، یا فلاں نقصان سے بچ جائے، یہ حکم کی حکمت ہے۔

فرق:- علت اور حکمت کی تعریف سے دونوں میں فرق خود بخود واضح ہوگیا، کہ علت مدارِ حکم ہے، لہٰذا شرعی اَحکام کا دارومدار علل پر ہوگا، حکمت پر نہیں، کیونکہ حکمت بعض اوقات بالکل مخفی ہوتی ہے، اور بندوں کو اس پر بالکل اِطلاع نہیں ہوتی، اب اگر حکمت پر حکم کا مدار ہو، تو اس صورت میں حکم معطل ہوجائے گا، مثلاً:-

مسافر کے لئے ''قصر'' کا حکم ہے، اب اس حکم کی تشریع میں حکمت و مصلحت ''مشقت'' سے بچنا ہے، لیکن کہاں مشقت ہے، اور کہاں مشقت نہیں ہے، یہ فیصلہ نہایت مشکل ہے، اس لئے مذکورہ حکم کے لئے علت ''سفر'' کو مقرر کیا گیا، اب حکم کا مدار مشقت پر نہیں، بلکہ سفرِ شرعی پر ہے، سفرِ شرعی ہے، تو قصر کا حکم بھی ہے، سفرِ شرعی نہیں ہے، تو قصر کا حکم بھی نہیں ہے۔

حکمت اور علت میں فرق واضح کرنے کے لئے بعض علمائے کرام نے عام دُنیاوی قانون میں یہ مثال بیان فرمائی ہے، کہ مثلاً ٹریفک کا قانون ہے کہ جب سرخ بتی جل رہی ہو، تو سگنل پر گاڑی روکی جائے، اب ''گاڑی روکنا'' ایک حکم یا قانون ہے، اور سرخ بتی کا روشن ہونا اس کی علت ہے، اور یہ قانون کیوں بنا؟ اس کی مصلحت، حکمت اور فلسفہ حوادث سے بچاؤ ہے، لیکن یہ بات ہر ایک جانتا ہے کہ مذکورہ حکم کا مدار سرخ بتی ہے، اگر وہ روشن ہے، تو گاڑی روکنا لازم ہے، ورنہ نہیں، مذکورہ مصلحت اور حکمت اس کا مدار نہیں، یہی وجہ ہے کہ اگر دُوسری سائڈ سے بالکل ٹریفک نہ ہو، اور سرخ بتی جل رہی ہو، تب بھی گاڑی روکنا لازم ہے، حالانکہ اس صورت میں حادثے کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔ (1)

---

(۱) تکملۃ فتح الملھم شرح صحیح مسلم۔ العثمانی (جسٹس مفتی محمد تقی عثمانی) (۱/۴۷۵) کراچی، مکتبہ دارالعلوم، طبع اوّل ۱۴۰۵ھ۔

Historic Judgment on Interest (by Justice Muhammed Taqi Usmani)

تنبیہ:- علت اور حکمت میں فرق بیان کرنے کی ضرورت اس لئے پیش آتی ہے، کہ اس زمانے میں سود جائز کرنے والے جو حیلے پیش کرتے ہیں، ان میں سے ایک حیلہ یہ بھی ہے کہ آج کل بنکوں سے سود پر جو قرضہ کاروبار کے لئے لیا جاتا ہے، یا بنک لوگوں سے جو قرضہ سود پر لیتا ہے، اس میں کسی فریق پر کوئی ''ظلم'' نہیں، بلکہ دونوں کا فائدہ ہے، اور سود کی ممانعت ظلم کی وجہ سے ہے، لہٰذا بنک کے اس قسم کا سود جائز ہوگا، اس کو ناجائز کہنا درست نہیں، ناجائز سود تو وہ ہے کہ ایک آدمی کے پاس کھانے کے لئے کچھ نہیں، یا پہننے کے لئے کچھ نہیں، اور وہ کسی سے قرضہ لیتا ہے، تاکہ وہ اس سے اس ضرورت کو پورا کرے، تو قرض دہندہ اس کو کچھ اِضافے کی شرط کے ساتھ قرضہ فراہم کرتا ہے، تو اس میں بلاشبہ ظلم ہے، اور یہ ناجائز ہے، لیکن کاروباری نوعیت کے قرضے میں ظلم تو دُور کی بات ہے، بلکہ یہ تو عین انصاف ہے، کہ بنک نے قرضہ لے کر اس کو کسی کاروبار میں لگایا اور اس پر بنک کو نفع حاصل ہوا، اب اس نفع میں سے بنک نے کچھ حصہ اکاؤنٹ ہولڈر کو دِیا، اور کچھ خود رکھ لیا، دونوں کا فائدہ ہوگیا، تو اس کو ناجائز کہنے کی کوئی وجہ نہیں۔

حکمت اور علت میں فرق بیان کرنے سے بات صاف اور واضح ہو جاتی ہے، کہ حکم کا مدار علت پر ہے علت موجود ہوگی، تو حکم بھی موجود ہوگا، اور علت موجود نہیں ہوگی، تو حکم بھی موجود نہیں ہوگا، حکم کا مدار حکمت پر نہیں، ظلم رِبا کی حکمت ہے، علت نہیں، لہٰذا کسی قرضے میں ظلم کے ہونے یا نہ ہونے پر رِبا کا حکم لاگو نہیں ہوگا، بلکہ علت کو دیکھا جائے گا، اور اس پر حکم کا مدار ہوگا، جو بلاشبہ مذکورہ قرضوں میں موجود ہے، لہٰذا کاروباری قرضوں پر سود کا لین دین بھی حرام ہوگا۔

نیز ان قرضوں میں ظلم بھی ہے، جس کو علمائے اُمت نے بڑی تفصیل کے ساتھ اپنی تحریرات میں ذکر کیا ہے۔[1]

---

(۱) مسئلہ سود

زر میں علتِ ربا کی تحقیق

زر میں ربا کی دونوں قسمیں پائی جاتی ہیں، ربا الفضل بھی اور ربا النسیئہ بھی، زر میں ربا الفضل کے حرام ہونے کی علت کے بارے میں تین قول مشہور ہیں، جن کا خلاصہ ذیل میں بیان کیا جاتا ہے:-

۱- قدر+جنس: یعنی اگر زر میں یہ دونوں باتیں پائی جائیں، تو اس صورت میں تبادلۂ زر کے وقت کسی ایک جانب زیادتی جائز نہیں ہوگی، مثلاً: سونے کا سونے کے ساتھ اگر تبادلہ ہو، یا چاندی کا چاندی کے ساتھ اگر تبادلہ ہو، تو چونکہ یہ موزونات میں سے ہیں، اور جنس کا جنس کے ساتھ مقابلہ ہے، اس لئے یہاں کسی جانب اِضافہ جائز نہیں، بلکہ مماثلت ضروری ہے۔

یہ مذہب حضراتِ حنفیہ کا ہے، اور اِمام احمد بن حنبلؒ کا مشہور قول بھی یہی ہے۔[1]

یہ حضرات اپنے موقف کو قرآن، سنت اور قیاس سے ثابت کرتے ہیں:-

قرآن کریم:-قال الله تعالیٰ:-

أَوْفُوا الْكَيْلَ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُخْسِرِينَ ۝ وَزِنُوا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيمِ ۝[2]

---

(۱) الدر المختار مع رد المحتار (۷/۳۰۵)

"وعلته ای علة تحریم الزیادة القدر المعهود بکیل او وزن مع الجنس، فان وجدا حرم الفضل"

ـــــ البحر الرائق شرح کنز الدقائق (۶/۲۰۷)

"وعلته القدر والجنس ای وجوب المساواة التی یلزم عند فوتها الربا"۔

ـــــ ابن قدامه (موفق الدین ابو محمد عبد الله بن احمد بن محمد بن قدامه المقدسی م ۶۲۰ھ) المغنی، دارعالم الکتب، الریاض طبع اول ۱۴۰۶ھ

"فروی عن احمد فی ذلك ثلث روایات اشهرهن ان علة الربا فی الذهب والفضة کونه موزون جنس "(۶/۵۴)

(۲) سورة الشعراء آیت ۱۸۱

''ماپ پورا بھر کردو، اور نقصان دینے والے مت ہو، اور سیدھی ترازو سے تولو''

وقال الله تعالیٰ:

وَيَا قَوْمِ أَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيزَانَ بِالْقِسْطِ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ الآيه [1]

''اور اے قوم! ماپ اور تول کو پورا کرو انصاف کے ساتھ، اور نہ گھٹاؤ لوگوں کی ان کی چیزیں۔''

وقال الله تعالیٰ:

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِينَ الَّذِينَ إِذَا اكْتَالُوا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُونَ وَإِذَا كَالُوهُمْ أَوْ وَزَنُوهُمْ يُخْسِرُونَ [2]

''خرابی ہے گھٹانے والوں کی، وہ لوگ جب ماپ کرلیں، لوگوں سے تو پور بھرلیں، اور جب ماپ کردیں ان کو یا تول کردیں، تو گھٹا کر دیں۔''

ان آیاتِ کریمہ میں کیل اور وزن کو پورا پورا دینے کا حکم دیا گیا ہے، اور ان میں کمی کرنے سے ڈرایا گیا ہے، جس سے اشارۃً یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ رِبا کی علت ''کیل ووزن'' ہے۔ [3]

سنت:- وہ تمام احادیث جن کا تعلق اشیائے ستہ سے ہے، اور جن میں سے بعض کا تذکرہ گزشتہ صفحات میں ہو چکا ہے، اور بعض مزید ذیل میں ذکر کی جارہی ہیں، اس

---

(۱) سورۃ هود آیت ۸۵

(۲) سورۃ التطفیف۔

(۳) بدائع الصنائع الکاسانی (علاء الدین ابوبکر الکاسانی) کراچی، ایچ ایم سعید، طبع اول ۱۹۱۰ء (۱۸۴/۵)

''علت'' کا مأخذ ہیں۔

"الذهب بالذهب وزنا بوزن مثلا بمثل والفضة بالفضة وزنا بوزن مثلا بمثل، فمن زاد او استزاد فهو ربا۔ (۱)

''سونا سونے کے مقابلے برابر سرابر بیچو، اور چاندی چاندی کے مقابلے میں برابر سرابر بیچو، جس نے بڑھایا یا زیادہ مانگا، تو یہ رِبا ہے۔''

"لا تبيعوا الذهب بالذهب الا وزنا بوزن۔" (۲)

''سونے کو سونے کے مقابلے میں مت بیچو مگر یہ کہ برابر سرابر ہو۔''

"لا تبيعوا الدرهم بالدرهمين ولا الصاع بالصاعين " (۳)

''ایک دِرہم دو دِرہموں کے بدلے میں مت بیچو، اور ایک صاع دو صاعوں کے بدلے میں مت بیچو۔''

اس حدیث میں ''دِرہم'' کا تعلق وزن سے ہے، اور ''صاع'' کا تعلق کیل سے ہے، اور صاع پیمانے کو کہتے ہیں، لیکن یہاں اس سے مراد وہ چیز ہے جو اس پیمانے میں ماپی جاتی ہو، اور جنس کا جنس کے ساتھ مقابلہ بھی ہے، لہٰذا معلوم ہوا کہ علتِ رِبا قدر+جنس ہے، اور یہی حال اشیائے ستہ والی احادیث کا بھی ہے، کیونکہ ان میں بھی جنس کا مقابلہ جنس کے ساتھ ہے، اور ہر چیز یا موزونات میں سے ہے، اور یا مکیلات میں سے ہے۔

"ماوزن مثلا بمثل اذا كان نوعا واحدا وماكيل فمثل ذلك، فاذا اختلف النوعان فلا بأس به۔" (۴)

---

(۱) اخرجه مسلم، كتاب المساقاة، باب الربا۔

(۲) حواله بالا

(۳) مجمع الزوائد (۴/۱۱۲)

(۴) نيل الاوطار، الشوكاني (محمد بن علي بن محمد الشوكاني م ۱۲۵۵ھ) من ابواب الربا۔

''جو چیز تولی جاتی ہو، تو وہ برابر ہونی چاہئے، اور جو چیز ناپی جاتی ہو، اس کا بھی یہی حکم ہے، البتہ جب دونوں قسمیں مختلف ہو جائیں، تو اس صورت میں (زیادتی میں) کوئی حرج نہیں۔''

قیاس:- بیع مال کے بدلے میں مال دینے سے عبارت ہے، اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ دونوں جانب تساوی ہو، یعنی دونوں جانب میں جو مال ہو، کسی مال کا کوئی جز عوض سے خالی نہ ہو، اور ایک دِینار مثلاً ایک دِینار کا صورۃً بھی مثل ہے، اور معنیً بھی مثل ہے، صورۃً مثلی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ دونوں موزونات میں سے ہیں، اور معنیً اس لئے مماثلت ہے کہ دونوں ہم جنس ہیں، اب اگر کسی جانب ایک دِینار یا نصف دِینار کا اِضافہ ہو، تو یہ دِینار یا نصف دِینار عوض سے خالی ہوگا، اور یہی حقیقتِ رِبا ہے۔ اب یہ تماثل صورۃً ومعنیً جس مبادلے میں بھی پایا جائے گا، وہاں کسی ایک جانب زیادتی جائز نہ ہوگی، لہٰذا معلوم ہوا کہ رِبا الفضل کی علت قدر وجنس ہے۔ (۱)

۲:- زَر میں رِبا الفضل کی حرمت کی علت ''جنس+خلقی ثمنیت'' ہے، جس کو ''ثمن جوہریہ'' یا ''ثمنیت غالبہ'' بھی کہتے ہیں، اس کے قائل حضرت اِمام شافعیؒ ہیں، اور اِمام مالکؒ کا مشہور قول بھی یہی ہے۔ (۲)

---

(۱) بدائع الصنائع(۵/۱۸۴)

(۲) ملاحظہ ہوں! النووی (محی الدین یحی بن شرف النوویؒ) روضۃ الطالبین (۳/۳۷۸) المکتب الاسلامی، بیروت، طبع سوم ۱۴۰۵ھ۔

"وقال الجمهور: العلة فيهما صلاحية الثمنية الغالبة، وان شئت قلت: جوهرية الا ثمان غالبا، والعبارتان تشملان التبر والمضروب والحلي والاواني منهما، وفي تعدى الحكم الى الفلوس اذا راجت وجه، والصحيح انه لاربا فيها، لانتفاء الثمنية الغالبة، ولا يتعدى الى غير الفلوس من الحديد والنحاس والرصاص وغيرها قطعا۔"

نیز ملاحظہ ہو! ابن رشد المالکی(ابوالولید محمد بن احمد القرطبی م ۵۲۰ھ)المقدمات الممهدات (۲/۳۵)۔

"واما الذهب والفضة فلم يقس عليهما شيئا من العروض التي تكال او توزن لان العلة عنده في منع التفاضل في كل واحد هي انهما اثمان للاشياء"۔

اس قول کے مطابق جب خلقی اور جوہری ثمنیت رِبا الفضل کی علت قرار پائی، تو ظاہر ہے کہ یہ علت ثمنِ خلقی ہی کے ساتھ محدود رہے گی، اور وہ صرف سونا چاندی یا ان دونوں متعلقات ہیں، لہٰذا صرف سونا چاندی کے تبادلے میں رِبا الفضل حرام ہوگا، فلوس وغیرہ میں رِبا جاری ہی نہیں ہوگا۔

ان حضرات کے من جملہ دلائل میں سے ایک دلیل یہ بھی ہے کہ سونے، چاندی کا سلم تمام اشیاء میں جائز ہے، حتیٰ کہ موزونات میں بھی جائز ہے، اب اگر علت سونے اور چاندی میں ''وزن'' ہو، تو سلم میں تو ''تاجیل'' ضروری ہوتی ہے، اب اس کا حاصل ہوگا، کہ یہ موزون کی موزون کے ساتھ اُدھار بیع ہے، حالانکہ جب جنس مختلف ہو، لیکن قدر ایک ہو، تو یہاں زیادتی تو جائز ہوتی ہے، لیکن نساء (اُدھار) ناجائز ہوتا ہے، تو اس کا تقاضا یہ ہے کہ سونے چاندی کا سلم موزونات میں صحیح نہ ہو، حالانکہ اس کے جواز پر سب فقہائے کرام متفق ہیں، معلوم ہوا کہ سونے چاندی میں حرمتِ رِبا کی علت وزن نہیں، بلکہ ثمنیت ہے۔[1]

تردید:- سونے چاندی میں حرمتِ رِبا کی علت ''ثمنیت غالبہ'' قرار دینا ''علتِ قاصرہ'' ہے، یعنی یہ سونے اور چاندی تک منحصر رہتی ہے، اور اس میں تعدی کی صلاحیت نہیں، لہٰذا منصوص میں تو اس علت کا کوئی فائدہ نہیں، کیونکہ منصوص میں حکم نص کی طرف مضاف ہوتا ہے، نہ کہ علت کی طرف، اور فرع کی طرف یہ متعدی نہیں ہوتی، تو اس تعلیل کا فائدہ کیا؟[2]

[3] ۳:- زَر میں حرمتِ رِبا کی علت ''جنس+ثمنیت مطلقہ'' ہے، یہ مالکیہ کا مذہب ہے، اور حنفیہ میں سے اِمام محمدؒ کا قول بھی ہے۔[4]

---

(۱) مجموع فتاوی ابن تیمیه (۲۹/۴۷۱)

(۲) احکام الاوراق النقدية والتجارية الجعيد (ستر بن ثواب) السعودية، الطائف، مكتبة الصديق، طبع اول ۱۹۹۳ء (ص ۱۵۰)

(۳) حواله بالا (بحواله المدونة للامام مالكؒ)

(۴) بدائع الصنائع (۶/۵۹)

اس قول کے مطابق رِبا الفضل کی علت جب مطلق ثمنیت ہے، تو فلوس اگر رائج ہوں، یا کوئی اور چیز بطورِ زَر اور ثمن رائج ہو جائے، تو اس میں بھی رِبا الفضل جاری ہوگا، یہی وجہ ہے کہ ان حضرات کے ہاں فلس بفلسین کی بیع ناجائز ہے، اور یہ سودی معاملہ ہے، جیسا کہ اس کی تفصیل اگلے صفحات میں اِن شاءاللہ تعالیٰ آئے گی۔ (۱)

ان حضرات کی دلیل یہ ہے کہ جب فلوس اپنے وظیفے (Function) کے اعتبار سے دِینار اور دِرہم کی طرح ہو گیا، یعنی جو وظائف دِرہم اور دِینار کے ہیں، وہی وظائف فلوس کے بھی ہو گئے، تو حکمِ رِبا میں بھی فلوس دِرہم اور دِینار کی طرح ہوں گے۔ (۲)

رِبا النسیئہ کی علت

یہ ساری تفصیل زَر میں ''رِبا الفضل'' کی حرمت کی علت سے متعلق تھی، اور جہاں تک زَر میں ''رِبا النسیئہ'' کی حرمت کی علت کا تعلق ہے، تو وہ بالکل واضح ہے، اور اس میں کسی کا اِختلاف بھی نہیں ہے، کیونکہ قرض کے جس معاملے میں کچھ مشروط یا معروف اِضافہ جو خالی عن العوض ہو گا پایا جائے، تو وہ معاملہ ناجائز ہوگا۔

بلکہ یہ حقیقت میں یہی علت رِبا الفضل کی بھی ہے، لیکن چونکہ وہاں احادیث موجود ہیں، جن میں رِبا کو صرف چھ چیزوں میں ذکر کیا ہے، اس سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ آیا یہ حکم صرف ان چھ چیزوں میں منحصر ہے، یا کہیں اور بھی متعدی ہوگا، اسی وجہ سے علمائے اُمت کی ایک جماعت ایسی بھی ہے، جو رِبا الفضل کو صرف انہی اشیاء میں منحصر گردانتی ہے، جیسا کہ آگے اس کی تفصیل آرہی ہے، اور یہی وہ رِبا ہے جس میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ آپ دُنیا سے تشریف لے گئے، اور ہمارے لئے ابوابِ رِبا کو واضح نہیں فرمایا، لہٰذا علمائے اُمت نے ان احادیث میں غور وخوض کر کے اپنے اپنے اِجتہاد کے مطابق اس حکم کی علت مستنبط کی، اور اس پر حکم کا مدار رکھا، جس کی تفصیل بیان ہوئی، لیکن ''رِبا النسیئہ'' میں

---

(۱) احکام الاوراق النقدیة، العثمانی (المفتی القاضی محمد تقی العثمانی) (ص ۱۸)

(۲) بدائع الصنائع (۵/۱۸۵)

کوئی خاص شئ کا ذِکر نہیں، بلکہ فرمایا"کل قرض جر نفعا فھو ربا " اس میں آپ نے ایک اصل کلی بیان فرمائی کہ جس قرض میں بھی "جرِ منفعت" کی بات پائی جائے، تو وہ رِبا ہے، اور حرام ہے، اوراس سے بچنا واجب ہے۔

فائدہ ① (حکمِ رِبا کی تعدی وقصر):-

اشیائے ستہ والی حدیث ان اشیاء میں حرمتِ رِبا پر صریح نص ہے، اوراُمت ان اشیاء میں حرمتِ رِبا پر متفق ہے، لیکن کیا یہ حرمت انہی اشیائے منصوصہ میں منحصر ہے، یا دیگر اشیاء میں بھی پائی جاسکتی ہے؟ اس سلسلے میں علماء کی دو جماعتیں ہیں:-

ایک جماعت "تعدی" کی قائل ہے، جس کی تفصیل گزشتہ صفحات میں ذِکر کی جاچکی، اور دُوسری جماعت "قصر" کی قائل ہے، یعنی یہ کہ یہ حکم صرف انہی اشیائے ستہ میں منحصر ہے، اور دیگر اشیاء پر یہ حکم لاگو نہیں ہوگا، اس جماعت میں درج ذیل حضرات شامل ہیں:-

۱۔ طاووس، ۲۔ قتادہ، ۳۔ شعبی، ۴۔ مسروق، ۵۔ عثمان بتی، ۶۔ قاضی ابوبکر الباقلانی، ۷۔ صدیق حسن خان، ۸۔ علامہ ابنِ حزم اور تمام اہلِ ظاہر۔[1]

ان حضرات کے اس موقف کا منشاء یا تو:-

۱- حجیتِ قیاس سے انکار ہے، یا

۲- یہ کہ اصل اشیاء میں اباحت ہے، اور یا

۳- یہ کہ پہلی جماعت (معللہ) نے استخراجِ علت میں ایک دُوسرے سے اِختلاف کیا ہے، لہٰذا اس اِختلاف کی وجہ سے ساری علّتیں کمزور پڑگئیں، اورکوئی ایسی قوی

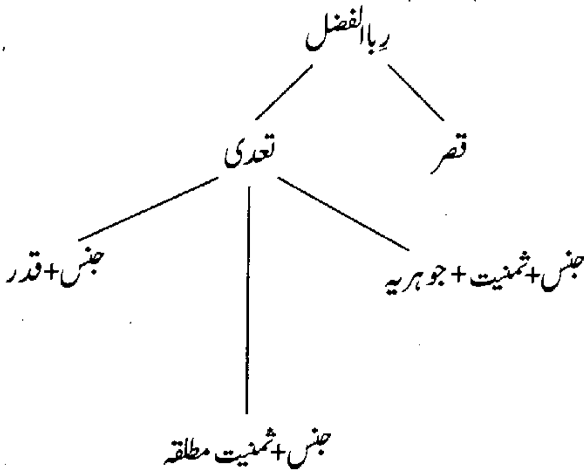
---

(۱) المغنی لابن قدامه مع الشرح الکبیر (۱۲۴/۴)

ــــــابن حزم (ابومحمد علی بن احمد بن سعید ابن حزم م ۴۵۶ھ) المحلی (۴۶۸/۸) ادارة الطباعة المنیرية مصر، طبع اول ۱۳۵۰ھ

"وممن قال: "لاربا الافی الاصناف المذكورة "طاوٗس، وقتادة وعثمان البتی، وابو سلیمان وجمیع اصحابنا"

دلیل موجود نہیں، جس کی بنیاد پر اس حکم کو متعدی کیا جا سکے۔



فائدہ ۴ (رِبا النّساء اور رِبا النسیہ میں فرق):-

رِبا کے سلسلے میں ہم دو لفظ بکثرت سنتے ہیں:-

۱ رِبا النَّساء اور ۲ رِبا النسیہ

ان دونوں میں فرق ہے، اور وہ یہ کہ رِبا النساء کا تعلق ''بیع'' (Sale) سے ہے، اور رِبا النسیہ کا تعلق ''قرض'' (Loan) سے ہے۔

اس کی مزید وضاحت یہ ہے کہ اگر:-

۱- سونے کا تبادلہ سونے کے ساتھ ہو، یا

۲- چاندی کا تبادلہ چاندی کے ساتھ ہو، یا

۳- سونے کا تبادلہ چاندی کے ساتھ ہو، یا

۴- چاندی کا تبادلہ سونے کے ساتھ ہو،

تو پہلی دو صورتوں میں دو قسم کا رِبا پایا جا سکتا ہے، رِبا الفضل کہ کسی ایک جانب زیادتی ہو، اور رِبا النَّساء کہ ایک عوض پر قبضہ ہو، اور دُوسرا اُدھار ہو، تو یہ اُدھار رِبا النساء کہلاتا

ہے، اور آخری دو صورتوں میں زیادتی تو جائز ہے، لیکن اُدھار جائز نہیں، یہ رِبا النساء ہے۔ ''بیعِ صَرف'' میں اس کی مزید وضاحت آئے گی، اِن شاء اللہ تعالیٰ۔ اور رِبا النسیہ کا تعلق عقدِ قرض سے ہے، جیسا کہ اس کی تفصیل گزر گئی۔ [۱]

ثمنیت کسے کہتے ہیں؟

ثمنیت کے معنی کسی شئ کے ''ثمن ہونے'' کے ہیں، اور ''ثمن'' کی تعریف درج ذیل ہے:-

"الثمن اسم لما هو عوض من المبيع "[۲]

''جو کسی بیچی ہوئی چیز کا بدل بن سکے، اس کو ثمن کہتے ہیں۔''

"قال لازهری : قال الليث: ثمن كل شئي قيمته "[۳]

''ہر شئ کا ثمن اس کی قیمت ہے۔''

"والمعروف ان الثمن هو ماجعل عوضا في عقد البيع"[۴]

''مشہور یہی ہے کہ ثمن وہ چیز ہے جو عقدِ بیع میں عوض بنے۔''

---

(۱) جهاد فی رفع بلوی الربا،محمد خاطر محمد الشیخ، (۱۰/۱)

"وعلى هذا ينقسم ربا لبيوع الى قسمين:

۱۔ ربا الفضل :ويتحقق ببيع احد الاصناف۔۔۔۔

۲۔۔ربا النساء: ويكون في بيع الاموال الربوية بجنسها او بغير جنسها، يتحد معها في العلة عند تاجيل القبض في احد البدلين الخ "

بحوث في الربا، الامام ابو زهره، بيروت،دارالفكر العربي، (ص ٦٦)

"فان ذلك يكون ربا ويسمى ربا النساء وليس هو ربا النسيئة الذى بيناه من قبل "

(۲) كتاب المغرب في ترتيب المعرب،المطرزی (ابو الفتح ناصر الدين عبد السيد بن على المطرزى المتوفى ٦١٦ هج)، بيروت، دارالكتب العربي۔

(۳) تهذيب الاسماء واللغات، النووى (ابوزكريا محى الدين بن شرف النووى المتوفى ٦٧٦هج) مصر، ادارة الطباعة المنيرية (۴۵/۱)

(۴) تطور النقود للدكتور احمد حسن احمد الحسني، ص(۱۳۳)

ان تمام تعریفات کا حاصل یہ ہے کہ عقدِ بیع (Sale) میں جو شئی مبیع کے مقابلے میں آجائے، وہ ثمن ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ثمن زَر کا مترادف نہیں، بلکہ زَر سے عام ہے، یعنی ہر زَر ثمن ہے، لیکن ہر ثمن کا زَر ہونا ضروری نہیں، مثلاً:۔

اگر کوئی شخص اپنا گھر غلام کے مقابلے میں فروخت کرے، تو اس مثال میں غلام ثمن ہے، لیکن غلام زَر نہیں ہے، جیسا کہ ظاہر ہے، لہٰذا جن حضرات کے نزدیک زَر میں علتِ رِبا ثمنیت مطلقہ ہے، تو اس سے مراد یا ثمنِ خلقی ہوگا، یا پھر وہ ثمن ہوگا، جو زَر جیسا ہو، یعنی لوگ اپنے معاملات میں اس کو زَر ہی کے طور پر اِستعمال کرتے ہیں، جیسا کہ فلوس اور کاغذی نوٹ وغیرہ، اس درجے میں زَر ثمن کا مترادف ہوسکتا ہے۔

تو گویا کہ ثمن کی بھی تین قسمیں ہوگئیں:۔

① ثمنِ خلقی = سونا، چاندی

② ثمن اِصطلاحی یا عرفی = فلوس، نوٹ وغیرہ

③ ثمن اتفاقی = مثال مذکور میں غلام

بابِ اوّل اور بابِ دوم کی تفصیلات سے معلوم ہوا کہ مال، زَر، کرنسی اور ثمن میں فروق موجود ہیں، اور یہ ایک ہی چیز کے مختلف نام نہیں ہیں۔



باب سوم

کرنسی نوٹ اور فلوس (Pices)

نوٹ کسے کہتے ہیں؟

اِرتقاءِ زر کی بحث میں یہ تفصیل گزر چکی ہے کہ ۱۷۰۰ء میں صرّافوں اور سناروں کی طرف سے جاری شدہ رسیدوں نے ترقی کر کے باقاعدہ نوٹوں کی شکل اختیار کی، اور اس کے بعد اس پر مختلف مراحل گزرتے گئے، تو نوٹ یا بنک نوٹ (Bank Note) درحقیقت مذکورہ رسیدوں کی ترقی یافتہ شکل اور باضابطہ شکل ہے، جو بعد میں زرِ قانونی (Legal Tender) قرار پایا، لہٰذا ہم نوٹ کی تعریف درج ذیل الفاظ میں کر سکتے ہیں:-

"نوٹ حکومت کا ایک عہد نامہ ہے جو بہ تحکم سکے کی طرح واجب القبول بنایا گیا ہے۔"(۱)

علامہ سید احمد بیگ الحسینیؒ اپنی کتاب "بهجة المشتاق" میں نوٹ کے بارے میں لکھتے ہیں:-

"جب ہم نے لفظ "بنک نوٹ" کی ماہیت کے بارے میں تحقیق کی، تو معلوم ہوا کہ یہ فرانسیسی زبان کی اِصطلاح ہے، اور "لاروس" جو فرانسیسی زبان کی سب سے بڑی اور مشہور لغت ہے، اس میں بنک نوٹ کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

(۱) جدید فقہی مباحث (۸۸/۲)

''بنک نوٹ'' ایک کرنسی نوٹ ہے، جس کے حامل کو مطالبے کے وقت اس نوٹ کی حقیقی قیمت دے دی جائے گی، اور یہ نوٹ بالکل اسی طریقے پر رائج ہوتا ہے، البتہ یہ نوٹ مضمون ہوتے ہیں، یعنی اس کے بدل کی ضمانت دی جاتی ہے، تاکہ لوگ اس لین دین پر اِعتماد کریں...........[1]

یادرہے کہ نوٹ، بنک نوٹ اور کاغذی زَر (Paper Money) ایک ہی چیز ہے، جس کو عربی میں "الاوراق النقدیة" یا "النقود الورقیة" یا "الانواط" کہتے ہیں۔

نوٹوں کی فقہی وشرعی حیثیت (ایک تفصیلی جائزہ)

کرنسی نوٹ کی فقہی تکییف (فقہی وصف کہ نوٹ فقہی اَحکام کے لحاظ سے کیا چیز ہے؟) میں مختلف نظریات رہے ہیں، اور اس سلسلے میں علماء وفقہاء کی آراء مختلف ہیں چنانچہ بعض کتابوں میں سات تک اقوال ذِکر کیے گئے ہیں، لیکن ہم یہاں صرف ان اقوال کو ذِکر کرنے پر اِکتفاء کیے دیتے ہیں، جو زیادہ معروف اور مشہور ہیں، اور وہ چار ہیں:-

۱-نوٹ دَین(Debt) کی ''سند''(Certificate) ہے۔

۲-نوٹ ''سامان''(Goods) ہے۔

۳-نوٹ سونے اور چاندی کا ''بدل'' یا قائم مقام(Substitute) ہے۔

۴-نوٹ بذاتِ خود ''ثمنِ عرفی''(Customary Price) ہے، اور فلوس کے حکم میں ہے۔

ان اقوال کی تفصیل، دلائل کی تنقیح، تفریعات کی تشریح اور مناقشہ ذیل میں ملاحظہ ہوں:-

---

(۱) بحوالہ کاغذی نوٹ اور کرنسی کا حکم (ص ۱۷)

نوٹ کی فقہی حیثیت سے متعلق پہلا نظریہ

گزشتہ صدی کے بیشتر علمائے ہند (جن میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوھی، حضرت مولانا اشرف علی تھانوی اور حضرت مولانا مفتی محمد شفیع رحمہم اللہ بھی شامل ہیں) کا نوٹ سے متعلق یہ موقف رہا ہے کہ نوٹ دَین کی سند ہے، نوٹ نہ مال ہے، نہ سونے اور چاندی کا بدل ہے، اور نہ بذاتِ خود ثمن ہے، بلکہ یہ محض اس دَین کی ایک سند (Certificate) ہے، جو حاملِ نوٹ کے لئے جاری کنندہ کے ذمہ واجب ہے۔[1]

دلائل

ا- اس موقف پر ایک اہم دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ ہر نوٹ پر یہ وعدہ لکھا ہوا ہوتا ہے کہ اس کے حامل کو بوقتِ مطالبہ اس نوٹ کی حقیقی قیمت ادا کی جائے گی، لہٰذا یہ وعدہ اس بات کی صاف دلیل ہے کہ نوٹ دَین کی سند اور وثیقہ ہے، چنانچہ علامہ سید احمد بک الحسینیؒ نوٹ کی ماہیت اور حقیقت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

"فقوله :"قابلة لدفع قيمتهالدى الاطلاع لحاملهاالخ" لم يجعل شكافي انها سندات ديون الخ"

"یہ بات کہ اس کے حامل کو مطالبے کے وقت اس نوٹ کی حقیقی قیمت ادا کردی جائے گی، بلاشبہ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ یہ

(ا) امداد الفتاوی، تھانوی (حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ) کراچی، مکتبہ دارالعلوم کراچی ۱۴، (۵/۲)۔

جدید فقہی مباحث للقاسمی (۱۸۱/۲)۔

احكام الاوراق النقدية والتجارية للجعيد (ص١٧٦)۔

احكام الاوراق النقدية للعثمانی (ص١٠)۔

نوٹ قرض کی سند ہے الخ۔''[1]

۲- ان نوٹوں کا بدل بصورت سونا یا چاندی جاری کنندہ کے خزانے میں ہونا ضروری ہے، جس سے یہ بات واضح ہے کہ ان نوٹوں کی قیمت اسی بدل کی وجہ سے ہے، لہٰذا نوٹ اس بدل کی سند ہے۔[2]

۳- نوٹ کاغذ کا ایک معمولی پُرزہ (Piece) ہے، پھر ایک پُرزہ زیادہ قیمت کا ہے، اور دُوسرا کم قیمت کا ہے، مثلاً ۱۰۰ کا نوٹ اور ۵۰ کا نوٹ، حالانکہ ذاتاً دونوں کاغذ برابر ہیں، لیکن قیمت میں فرق ہے، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اصل چیز بدل ہی ہے۔

۴- اگر ان نوٹوں کے ذریعے تعامل (Custom) ختم ہو جائے، تو حکومت اس کا ضمان ادا کرتی ہے، یہ بھی اس بات کی واضح دلیل ہے کہ یہ اس دَین کی سند ہے۔[3]

تفریعات (یعنی اس قول پر جو فرعی اور فقہی مسائل مرتب ہوتے ہیں)

اس قول پر جو فقہی مسائل متفرع ہوتے ہیں، ان میں سے بعض مشہور مسائل درج ذیل ہیں:-

۱- بیعِ سلم میں نوٹ رأس المال نہیں بن سکتا، کیونکہ نوٹ پر قبضہ ثمن پر قبضہ نہیں، بلکہ اس کی سند پر قبضہ ہے، تو گویا کہ رأس المال (Capital) پر قبضہ نہیں پایا گیا، حالانکہ بیعِ سلم میں رأس المال پر قبضہ ضروری ہے، ورنہ ''بیع الکالئ بالکالئ'' (اُدھار کی بیع اُدھار کے ساتھ) ہو جائے گی، جو شرعاً ممنوع ہے۔

---

(۱) بلوغ الامانی علی الفتح الربانی، الساعاتی (احمد عبد الرحمن البنا) مصر، مطبعة الفتح الربانی، طبع اول، ۱۳۵۲ ھ (۲۴۸/۲)

(۲) الفتاوی السعدیة، السعدی (الشیخ عبد الرحمن الناصر السعدی) السعودیہ، الریاض، مکتبة المعارف، طبع دوم، ۱۹۸۲ء (ص ۳۲۴)

(۳) احکام الاوراق النقدیة والتجاریة للجعید (۱۷۶)(۴) کما هو مصرح به فی جمیع کتب الفقه۔

۲-نوٹ کے ذریعے سونے یا چاندی کا معاملہ دُرست نہیں ہوگا، کیونکہ یہ بیعِ صَرف ہوگی، اور بیعِ صَرف میں دونوں عوضوں پر قبضہ کرنا ضروری ہے، حالانکہ یہاں نوٹوں پر قبضہ درحقیقت سونے یا چاندی کی رسید پر قبضہ ہے، اور سونا یا چاندی اُدھار ہے، تو عوضین پر قبضہ نہیں پایا گیا۔[۱]

۳-فقیر کو محض نوٹ دینے سے زکوٰۃ ادا نہیں گی۔[۲]

۴-نوٹوں کے ذریعے معاملہ ''حوالہ'' ہے، جو ''تعاطی'' (کسی خاص لفظ کے بغیر لین دین کرنا) کے طریقے سے دُرست ہے، یعنی زید عمرو کو نوٹ دے کر اس سے کتاب خریدتا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ زید عمرو کو نوٹ دے کر گویا یہ کہہ رہا ہے کہ میرے ذمہ تمہارا جو دَین ہے، اس کی یہ سند ہے، اور تم بجائے مجھ سے اس کے جاری کنندہ سے وصول کرو، اور یہی حوالہ ہے۔[۳]

۵-نوٹ کا تبادلہ نوٹ سے دُرست نہیں ہوگا، اگرچہ مختلف الجنس ہوں، کیونکہ یہ بیع الکالئی بالکالئی (اُدھار کا اُدھار کے ساتھ بیع) ہے، جو ممنوع ہے۔

مناقشہ

اس موقف سے اَحکامِ شرعیہ اور مختلف معاملات (Transactions) میں جو مشقت اور حرج لازم آتا ہے، وہ بالکل ظاہر ہے، کیونکہ نوٹوں کے ذریعے مذکورہ بالا جیسے سارے معاملات معطل ہوجائیں گے، حالانکہ حرج شریعت میں بنصوصِ قرآن وسنت مدفوع اور مرفوع ہے، چنانچہ محقق عبدالرحمٰن السعدی صاحب اپنے فتاویٰ میں فرماتے ہیں:-

"لا یخفی ان جمیع اقطار الدنیا الا لنزر الیسیر کل معاملاتهم فی هذه الاوراق التی تسمی الانواط، فلوحکم

---

(۱) احکام الاوراق النقدیة للعثمانی (ص۱۰)

(۲) امداد الفتاوی (۵/۲)

(۳) بهجة المشتاق بحواله احکام الاوراق النقدیة للجعید۔

لها باحكام السندات والديون لتعطلت المعاملات في الوقت الذي تقتضي الاحوال وظروفها ان يخفف فيه غاية التخفيف "

''تمام دُنیا کے معاملات انہی نوٹوں کے ذریعے انجام پاتے ہیں، لہٰذا اگر یہ کہا جائے کہ یہ نوٹ دَین کی سندات ہیں، تو تمام معاملات معطل ہوجائیں، حالانکہ حالات کا تقاضا یہ ہے کہ معاملات میں بہت ہی تخفیف ہوجائے۔''(۱)

جسٹس مفتی محمد تقی عثمانی صاحب فرماتے ہیں:-

"فيه حرج عظيم والمعهود من الشريعة السمحة في مثله السعة والسهولة الخ۔"

''اس میں عظیم اور نا قابلِ برداشت حرج ہے، حالانکہ شریعتِ مطہرہ کا مزاج ان جیسے حالات میں گنجائش اور وسعت کرنے کا ہے۔''(۲)

نیز اس تنگی کو لوگ قبول تو کریں گے نہیں، تو حرام معاملات کا اِرتکاب کریں گے، اور نوٹ کا سندِ دَین ہونا کسی نصِ صریح قطعی سے ثابت تو ہے نہیں، جس میں کوئی اور اِحتمال نہ ہو، لہٰذا بہتر یہی ہے کہ نوٹ کو سندِ دَین نہ قرار دیا جائے، تاکہ لوگ اِرتکابِ حرام سے محفوظ ہوں۔

کرنسی نوٹ پر جو وعدہ لکھا ہوا ہوتا ہے، جس کی تفصیل گزر چکی، یہ شروع میں تو دُرست تھا، لیکن اب یہ بے معنی ہے، اب جاری کنندہ اس بات کا کوئی پابند نہیں کہ نوٹ کے حامل (Holder) کو سونا یا چاندی دیدے، بلکہ کاغذی نوٹ کی پشت پر کوئی سونا یا چاندی ہے ہی نہیں، بلکہ اس وعدہ اور ضمانت کا صرف اتنا فائدہ ہے کہ جاری کنندہ حامل کو بوقتِ

---

(۱) الفتاوى السعدية (ص ۱۸۲)

(۲) احكام الاوراق النقدية للعثماني (ص ۱۶)

مطالبہ کر سکے یا دُوسرے نوٹ دے دیتا ہے، یا کوئی سامان دے دیتا ہے، جیسا کہ جیوفرے گراؤتھر (Geoffry Growther) لکھتے ہیں:-

"The promise to pay which appears on their face is now utterly meaningless. Not even in amounts of 1700 cannot now be converted into gold. The note is no more than a piece of paper, for no intrinsic value whatever, and if were presented for redemption, the Bank of England could honour its only by giving silver coins or another notes, but it is accepted as money throughout the British Isles."

''کرنسی نوٹوں پر جو یہ عبارت لکھی ہوئی ہوتی ہے کہ حاملِ ھٰذا کو مطالبے پر ادا کرے گا، اب اس عبارت کا کوئی مقصد اور معنی باقی نہیں رہے، اس لئے اب موجودہ دور میں کرنسی نوٹوں کی کسی بھی مقدار کو سونے میں تبدیل کرانے کی کوئی صورت نہیں، چاہے ان نوٹوں کی مقدار سترہ سو پونڈ یا اس سے زیادہ کیوں نہ ہو، اب موجودہ دور میں یہ کرنسی نوٹ ایک کاغذ کا پُرزہ ہے، جس کی ذاتی کوئی قیمت نہیں، اور اگر کوئی شخص اس پونڈ کو بنک آف انگلینڈ میں پیش کرے، تو بنک یا تو علامتی سکے دے دے گا، یا سکے بجائے دُوسرے نوٹ پکڑا دے گا، لیکن کاغذی پونڈ برطانیہ کے تمام جزائر میں زر کے طور پر رائج ہیں۔''(۱)

خلاصہ یہ کہ یہ ''وعدہ'' (Promise) نوٹ کی ثمنیت کو باطل نہیں کرتا، بلکہ اس کو مزید تقویت بخشتا ہے، کیونکہ اس کی وجہ سے نوٹ کے ساتھ لین دین کے سلسلے میں لوگوں کا اِعتماد بڑھ جاتا ہے۔

لٰہذا یہ موقف نہایت کمزور اور موجبِ حرج ہے، بلکہ ناقابلِ عمل ہے، اس لئے

---

(۱) بحوالہ کاغذی نوٹ اور کرنسی کا حکم (ص ۲۵)۔

آج کل کے حالات میں اس کو اختیار نہیں کیا جاسکتا۔

نوٹ کی شرعی حیثیت سے متعلق دُوسرا نظریہ

نوٹ مال اور سامان (Goods) ہے، کیونکہ لین دین اور سارے معاملات نفسِ کاغذ ہی سے متعلق ہوتے ہیں، اور کاغذ مال متقوم (قیمت والا) ہے، جس کی قدر و قیمت عرف و رِواج کی وجہ سے بڑھ گئی، جیسے ہیرے، جواہرات کہ انتہائی قیمتی ہوتے ہیں، لیکن ان کی حیثیت مال اور سامان کی ہوتی ہے۔

ہندوستانی علمائے کرام میں علمائے رام پور اور جناب احمد رضا خان صاحب بریلوی کی بھی یہی رائے ہے، اور یہی شیخ عبدالرحمٰن بن سعدی کے نزدیک راجح معلوم ہوتی ہے۔[1]

احمد رضا خان صاحب بریلوی کا اس موضوع پر باقاعدہ رسالہ ہے، جس کا نام ہے "کفل الفقیہ الفاهم فی احکام القرطاس والدراهم" اس میں انہوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ نوٹ مال اور سامان ہے، سندِ دَین یا خود ثمن نہیں، چنانچہ فرمایا:-

"اما اصله فمعلوم انه قطعة كاغذ والكاغذ مال متقوم وما زادته هذه السكة الارغبة للناس اليه وزيادة في صلوح ادخاره للحاجات، وهذا معنى المال اى مايميل اليه الطبع ويمكن ادخاره للحاجة الخ"

"اس کی (نوٹ) اصل تو معلوم ہے کہ وہ کاغذ کا ایک ٹکڑا ہے، اور کاغذ مال متقوم ہے، اور اس کے سکے ہونے نے اس کی طرف رغبتیں بڑھائیں، اور یہ کہ وقتِ حاجت کے لئے اُٹھا رکھنے اور ذخیرہ

(۱) الفتاوی السعدیہ (ص۳۲۷ تا ۳۲۹)۔

کرنے کا زیادہ لائق ہوگیا، اور مال کے یہی معنی ہیں، کہ طبع اس کی طرف مائل اور رغبت ہو، اور زمانۂ مستقبل کی ضرورتوں کے لئے اس کو ذخیرہ کیا جا سکے۔"(۱)

دلائل

۱-عروض (سامان) کی جتنی تعریفات ہوئی ہیں، وہ سب کاغذی نوٹ پر صادق آتی ہیں، مثلاً:-

"العرض هو كل ماعدا العين والطعام من الاشياء كلها"

"سونے چاندی اور طعام کے علاوہ تمام اشیاء سامان میں داخل ہیں۔"

"هو ماسوى النقد"

"جو نقد کے علاوہ ہو، وہ سامان ہے۔"

"هو كل مالازكوة في عينه"

"سامان ہر وہ چیز ہے، جس کی ذات میں زکوٰۃ واجب نہ ہو۔"

"هو ماعداالحيوان والطعام والنقد"

"سامان حیوان، طعام اور نقد کے علاوہ ہر چیز کو کہتے ہیں۔"(۲)

۲- جب نوٹ کے بدلے میں کوئی چیز خریدی جائے، تو عقد اسی نوٹ پر واقع سمجھا جاتا ہے، سونے یا چاندی پر واقع نہیں سمجھا جاتا، اور اس نوٹ کی قیمت مقرر ہوتی ہے، تاکہ لوگ اس میں رغبت کا اظہار کریں، یہ نوٹ اپنی ذات کے اعتبار سے سونے چاندی

---

(۱) كفل الفقيه الفاهم في احكام القرطاس والدراهم، بریلوی (مولوی احمد رضاخان بریلوی) لاهور، شبیر برادرز، اردو بازار لاهور، (ص۱۳)

(۲) شرح الصاوی للشیخ محمد ابراهیم المبارك، بحواله احكام الاوراق النقدية والتجارية للجعيد (ص ۱۹۰)

سے بالکل مختلف ہے، یہ ایک محض ایک کاغذ ہے، اگر چہ ثمن بننے میں سونے چاندی کی طرح ہے، اور سونے چاندی کے موافق ہے، لیکن اس موافقت سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کو سونے یا چاندی کا حکم دیا جائے، دیکھئے موتی یا ہیرا اگر قیمت میں سونے چاندی کے برابر یا اس سے زائد ہو جائے، تو کیا موتی یا ہیرے کو سونے یا چاندی کا حکم دیا جائے گا؟ نہیں، ہرگز نہیں، اسی طرح نوٹ کا معاملہ بھی ہے۔ [1]

۳-نوٹ نہ مکیلات میں سے ہے، اور نہ موزونات میں سے، اور اس کی کوئی ایسی جنس بھی نہیں، جس پر نوٹ کو قیاس کیا جائے۔

۴-فقہائے کرام نے یہ قاعدہ ذِکر کیا ہے کہ نئے واقعات کو مشابہ ترین (Most Similar) منصوص علیہ شئ کے ساتھ ملایا جائے گا، اور اسی کا حکم ان واقعاتِ جدیدہ کو دیا جائے گا، اس قاعدہ کا تقاضا بھی یہ ہے کہ نوٹ کو سامان کے ساتھ ملایا جائے، کیونکہ سامان اس کو کہتے ہیں کہ جو نہ کیلی ہو، اور نہ وزنی، نہ حیوان ہو، اور نہ زمین۔ [2]

۵- ان نوٹوں کی حکومت اگر ختم ہو جائے، تو ان نوٹوں کی کچھ قیمت باقی نہیں رہتی، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ بذاتِ خود نقد (زَر) نہیں، گو وقتی طور پر زَر (Money) قرار دیا گیا ہے، تاکہ لوگوں کی رغبتیں بڑھ جائیں، بخلاف سونے چاندی کے کہ اس میں یہ بات نہیں، وہ بہر حال نقد ہی ہے، لہٰذا سونے چاندی پر نوٹوں کو قیاس کرنا اور ان کے اَحکام ان کو دینا قیاس مع الفارق ہے۔ [3]

تفریعات

۱-اس موقف پر جو سب سے اہم اور خطرناک مسئلہ متفرّع ہوتا ہے وہ یہ کہ کاغذی نوٹ اَموالِ رِبویہ میں سے نہیں، لہٰذا نوٹوں میں رِبا الفضل جائز ہوگا، مثلاً زید

---

(۱) الفتاوى السعدية (ص۳۱۸)

(۲) جريدة البلاد السعودية العدد ۲۹۱۷ (۱۳۷۸/۶/۲۲ھ)

(۳) الفتاوى السعدية (ص۳۲۰)

عمرو کے ہاتھ ایک ہزار روپے آٹھ سو روپے میں فروخت کرسکتا ہے، البتہ رِبا النسیہ نوٹوں میں ان کے ہاں بھی ناجائز ہے، کیونکہ وہ "کل قرض جر نفعا فھو ربا" کے کلیہ میں داخل ہے۔

چنانچہ احمد رضا خان صاحب بریلوی ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"نعم یجوز بیعه بازید من رقمه وبانقص منه کیفما تراضیا الخ"

"ہاں نوٹ پر جتنی رقم لکھی ہوئی ہے، اس سے زائد یا کم پر اس کا بیچنا جائز ہے، جبکہ باہمی رضامندی سے ہو۔"[1]

اور فتاویٰ سعدیہ میں مذکور ہے:۔

"فتعین انها سلع یثبت لها مایثبت لسائر السلع من زیادة ونقصان وجواز بیع بعضها ببعض متماثلا او متفاضلا من جنس او اجناس الخ"

"تو یہ بات ثابت ہوگئی کہ یہ نوٹ سامان ہے، دوسرے سامان کی طرح اس میں بھی کمی بیشی جائز ہوگی خواہ دونوں نوٹ ہم جنس ہوں یا مختلف الجنس ہوں۔"

اور شیخ سلیمان الحمدان اپنے ایک فتویٰ میں فرماتے ہیں:۔

"اذا علم هذا فلامانع من بیع الورق علی اختلاف انواعه و مسمایاته من الریالات او الدنانیر او الجنیهات باحد النقدین الذهب والفضة متفاضلاً او نساء ولادخل للربا فی شئی من ذلك لان الورق لیس من الاموال الربویة

---

(۱) کفل الفقیه الفاهم فی احکام القرطاس والدراهم (ص ۶۲)

ولان الربا مختص بالمکیلات والموزونات والورق لیس بمکیل ولا موزون۔"

"........نوٹوں کے تبادلے میں رِبا کا کوئی دخل نہیں، کیونکہ نوٹ اَموالِ رِبویہ میں سے نہیں، اوراس لئے بھی کہ رِبا خاص ہے مکیلات اورموزونات کے ساتھ اورنوٹ نہ مکیل ہے، اورنہ موزون۔"[1]

۲-نوٹوں میں اگر تجارت کی نیت نہ ہو، تو زکوٰۃ واجب نہیں۔[2]

۳-نوٹوں کے ذریعے مضاربت جائز نہیں، کیونکہ مضاربت میں مال کا دَراہم یا دَنانیر ہونا ضروری ہے، یا نقود کا ہونا ضروری ہے، جبکہ نوٹ نقود نہیں، بلکہ عروض ہے۔

مناقشہ

پہلی بات تو یہ کہ نوٹوں میں اس موقف کے مطابق رِبا الفضل یا رِبا النساء جاری نہیں ہوگا، اور یہ بہت ہی خطرناک بات ہے، کیونکہ اس رِبا کا دروازہ کھل جائے گا، اوراس موقف کے مطابق رِبا نوٹوں میں اس لئے جاری نہیں ہوتا کہ نوٹ عروض ہیں، نہ مکیلات میں سے ہیں، اورنہ موزونات میں سے ہیں، اورنہ ان میں ثمنیت ہے، لہٰذا رِبا الفضل کی کوئی علت بھی نوٹ میں موجود نہیں۔

موقف ثانی کی دلائل میں سے ایک دلیل یہ بھی ہے کہ عروض کی تعریفات نوٹوں پرصادق آتی ہیں، حالانکہ یہ بات غلط ہے، کیونکہ یہ تعریفات فقہائے کرام نے خاص خاص مقامات کی مناسبت سے ذکر کی ہیں، یہ عام تعریفات نہیں، مثلاً زکوٰۃ کے باب میں زکوٰۃِ حیوان کو ذِکر کیا، زکوٰۃِ ارض کو ذِکر کیا، زکوٰۃِ سیم وزَر کو ذِکر کیا، پھر عروض کی باری آئی، تو مقام

---

(۱) جریدۃ البلاد السعودیۃ العدد ۲۹۱۷ (۱۳۷۸/۶/۲۲ھ)

______ المعاملات المالیۃ المعاصرۃ فی الفقہ الاسلامی، الدکتور عثمان شبیر، بیروت، دارالنفائس، طبع سوم ۱۴۱۹ھ

(۲) حوالہ بالا۔

کی مناسبت سے اس کی ایسی تعریف کی، جو اسی مقام کے ساتھ مناسب تھی، جیسا کہ کتبِ مالکیہ میں ہے:-

"المراد بالعرض هنا مقابل الذهب والفضة"

''عرض سے یہاں مراد وہ چیز ہے، جو سونے چاندی کے مقابلے میں ہو۔''(۱)

دلائل میں یہ کہنا کہ جب جب نوٹوں کی حکومت ختم ہو جاتی ہے، تو ان کی قیمت ختم ہو جاتی ہے، جو تعریف میں ''یہاں'' کی قید لگا کر اس بات کی طرف اشارہ کیا کہ ''عرض'' کی یہ تعریف صرف یہاں کے خاص ہے، یہ کوئی عام تعریف نہیں۔

زوالِ ثمنیت کی دلیل ہے، تو اس کے بارے میں عرض یہ ہے کہ ہماری گفتگو نوٹوں کے بارے میں اس وقت ہے، جب ان کی قیمت برقرار ہو، تو اس وقت یہ دیکھنا ہے کہ ان کی فقہی حیثیت کیا ہے؟ اور جب ان کی قیمت ہی نہ رہے تو یہ صورت ہماری بحث سے خارج ہے۔

نوٹوں کی شرعی حیثیت سے متعلق تیسرا نظریہ

تیسرا موقف نوٹوں سے متعلق یہ ہے کہ نوٹ سونے چاندی کا قائم مقام ہے، یعنی نہ تو ان کی حیثیت محض سندِ دَین کی ہے، اور نہ یہ عروض ہے، اور ان میں بذاتِ خود ثمنیت ہے، لیکن چونکہ عرف و رِواج کی وجہ سے کاغذی نوٹ اصل ثمن (سونے چاندی) کے قائم مقام اور اس کا بدل (Substitute) ہے، لہٰذا جو اَحکام اصل اور ''مبدل'' کے ہوں گے، وہ اَحکام نوٹوں میں بھی جاری ہوں گے۔

مولانا محمد عبدالحی صاحب لکھنوی کی عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی اس

---

(۱) الخرشي على سيدي خليل، الخرشي (محمد الخرشي المالكي) بيروت، دارالصادر (۲۹۵/۲)

نظریے کے قائل ہیں، اور ان کے نزدیک نوٹ ثمن تو ہے، لیکن اس پر احکام سونے چاندی کے لاگو ہوں گے، نہ کہ فلوس کے، نوٹ کے بارے میں ایک جگہ وہ فرماتے ہیں:-

''پس پیسے (فلوس) اگرچہ عرفاً ثمن ہیں، مگر عینِ ثمن خلقی نہیں سمجھے گئے ہیں، بخلاف نوٹ کے کہ یہ عین ثمن خلقی ہے، گو ثمنیت خلقیہ نہیں، بلکہ ثمنیت عرفیہ ہو، پس تفاضل بیع فلوس میں جائز ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ نوٹ میں بھی جائز ہو، کیونکہ پیسے غیر جنس ثمن ہیں، حقیقۃً بھی اور عرفاً بھی، گو بوجہ اصطلاح اور عرف کے اس میں بڑی ثمنیت کی صفت آ گئی ہو، پس جبکہ نوٹ عرفاً جمیع احکام میں عین ثمن خلقی سمجھا گیا، بابِ تفاضل میں اسی بناء پر حکم دیا جائے گا، اور تفاضل اس میں حرام ہوگا۔''[1]

شیخ احمد البنا نوٹ کے سلسلے میں تحریر فرماتے ہیں:-

"فالذی اراہ حقا وادین اللہ علیہ ان حکم الورق المالی کحکم النقدین تماما سواء بسواء لانہ یتعامل بہ کالنقدین تماما، ولان مالکہ یمکنہ صرفہ فی قضاء مصالحہ بہ فی ای وقت شاء فمن ملك النصاب من الورق المالی ومکث عندہ حولا کاملا وجبت علیہ زکاۃ باعتبار الفضۃ الخ"

''جس کو میں حق سمجھتا ہوں، وہ یہ کہ کاغذی نوٹ بالکل برابر سرابر سونا چاندی کے حکم میں ہے، کیونکہ نوٹ کے ذریعے سونا چاندی کی طرح معاملہ ہوتا ہے، اور نیز نوٹ کے مالک کے لئے ممکن ہے کہ وہ نوٹ

(۱) مجموعۃ الفتاوی، لکھنوی (مولانا عبد الحی) کراچی، ایچ ایم سعید، پاکستان چوک (۱۳۷/۲)۔

سے اپنی ضروریات جس وقت چاہے، پوری کر سکتا ہے، لہٰذا جو نوٹ میں سے نصاب کا مالک ہو، اور اس نصاب پر پورا سال گزر جائے تو ایسے شخص پر چاندی کے حساب سے زکوٰۃ واجب ہو جائے گی۔"(۱)

اسلامی فقہ اکیڈمی جدہ کی اس سلسلے میں جو قرارداد ہے، اس کے الفاظ درج ہیں:-

"وبعد الاطلاع على قرار المجمع رقم ۹ في الدورة الثالثة بان العملات الورقية نقود اعتبارية فيها صفة ثمنية كاملة، ولها الاحكام الشرعية المقررة للذهب والفضة من حيث احكام الربا والزكاة والسلم وسائر احكامها۔"

"پیپر کرنسی زرِ اعتباری ہے، جس میں کامل ثمنیت ہے، سود، زکوٰۃ، سلم اور دیگر اَحکام جو سونے چاندی کے ہیں، وہ اَحکام نوٹ کے بھی ہیں۔"(۲)

دلائل

۱- اس پر اتفاق ہے کہ نوٹ تمام معاملات میں سونے چاندی کا بدیل ہے، اور اس کا مقام ہے، اور تمام معاملات میں نوٹ نے سونے چاندی کا مقام لیا، تو لامحالہ اَحکام میں بھی نوٹ سونے چاندی کی طرح ہوگا، خاص طور پر جبکہ مشہور اُصولی قاعدہ ہے کہ: "البدل له حكم المبدل" یعنی بدل اَحکام میں مبدل کی طرح ہوگا، یہاں مبدل سونا اور چاندی ہے، اور بدل کاغذی نوٹ ہے۔

۲- اَحکامِ شرعیہ میں اِعتبار معانی اور مقاصد کا ہے، معروف اُصولی قاعدہ ہے:

---

(۱) الفتح الربانی

(۲) مجلة مجمع الفقه الاسلامي، الدورة الخامسة، العدد الخامس، الجزء الثالث، ۱۴۰۹ھ، (ص ۲۲۶۱)

"الامور بمقاصدها" یعنی تمام اُمور کا دار و مدار مقاصد پر ہے، الفاظ اور ظاہری شکلوں پر نہیں، تو نوٹ کی وضع سے مقصد ثمنیت ہے، لہٰذا مقاصد کے اعتبار سے نوٹ سونے اور چاندی کی طرح ہوگا۔[1]

تفریعات

۱-نوٹ تمام اَحکامِ شرعیہ میں جب سونے چاندی کی طرح ہوگیا، اور سونے چاندی کا مقام نوٹ کو نیابۃً حاصل ہوگیا، تو نوٹ کے وہی اَحکام ہوں گے، جو سونے چاندی کے ہیں، اور وہ معروف ہیں، لہٰذا:-

الف:-نوٹ پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

ب:-نوٹ کے ذریعے زکوٰۃ ادا ہوجائے گی۔

ج:-نوٹ میں رِبا کی تمام اقسام جاری ہوں گی، یعنی رِبا الفضل، رِبا النسیئہ اور رِبا النساء نوٹ میں حرام ہوں گے، لیکن اس نظریے کے اعتبار سے اس کا مطلب یہ ہے کہ دو نوٹوں کا تفاضلاً تبادلہ اس وقت ناجائز ہوگا، جبکہ ان دونوں نوٹوں کا مبدل اور اصل سونا ہے، یا چاندی ہے، اس صورت میں چونکہ یہ دونوں نوٹ متحد الجنس ہوں گے، اس لئے ان کا تفاضلاً بیع دُرست نہ ہوگی، لیکن اگر دو نوٹ ایسے ہوں کہ ان میں سے ایک کا مبدل اور اصل سونا ہے، اور دُوسرے کا چاندی ہے، تو اس صورت میں ان دو نوٹوں کا تفاضلاً بیع دُرست ہوگی، کیونکہ یہ دونوں نوٹ مختلف الجنس ہیں، البتہ جانبین سے قبضہ جس کو "تقابض" کہتے ہیں، ضروری ہوگا، کیونکہ یہ بیعِ صَرف ہے، جس میں تقابض ضروری ہوتا ہے، جیسا کہ اس کی تفصیل آگے مستقل بحث کی شکل میں آئے گی۔

د:-بیعِ صَرف اپنی شرائط کے ساتھ نوٹ میں جائز ہوگی۔

---

(۱) الفتاوى السعدية (۳۲۲تا۳۲۴)۔

مناقشہ

معاملات میں نوٹ کا سونے اور چاندی کی طرح رِواج پانے سے لازم نہیں آتا کہ یہ کہا جائے کہ اصل سونا چاندی ہے، اور نوٹ نائب ہے، لہٰذا دونوں کے اَحکام ایک ہوں گے، کیونکہ اس میں یہ اِحتمال بھی ہے، نوٹ کو مستقل ثمن کی حیثیت حاصل ہو، جیسا کہ فلوس کو یہ حیثیت حاصل ہے، حالانکہ فلوس بھی سونا چاندی کی طرح رِواج میں رہے ہیں، لہٰذا یہ وجہ نہایت کمزور ہے۔

نیز جب اِن نوٹوں کی پشت پر سرے سے سونا یا چاندی موجود ہی نہیں، تو زکوٰۃ یا سود کے مسائل میں یہ فیصلہ کس طرح ہوگا کہ اس نوٹ کا مبدل اور اصل سونا ہے، اور اس کا چاندی ہے، اس صورت میں یہ فیصلہ بہت مشکل ہوگا، اور ان مسائل میں لوگ حرجِ عظیم میں مبتلاء ہوجائیں گے، حالانکہ حرج دینِ اسلام کے مزاج کے یکسر خلاف ہے، اور قرآن اور حدیث نے اس کی نفی کی ہے۔

نوٹ کی شرعی حیثیت سے متعلق چوتھا نظریہ

نوٹ کی شرعی حیثیت سے متعلق چوتھا موقف یہ ہے کہ نوٹ بذاتِ خود ثمنِ عرفی ہے، اور اَحکام میں فلوس کی طرح ہے، یعنی نوٹ نہ سندِ دَین ہے، نہ عروض ہے، اور نہ سونے چاندی کا بدیل ہے، بلکہ خود ثمن ہے، اور اَحکامِ شرعیہ میں فلوس کی طرح ہے۔

اکثر علماء اسی نظریے کے قائل ہیں، اور یہی نظریہ ہمارے نزدیک راجح ہے، اس لئے ہم اس کو قدرِ زیادہ تفصیل کے ساتھ اور مفصل حوالہ جات کے ساتھ بیان کریں گے، چند مشہور اور معروف علمائے عرب وعجم کی عبارات ملاحظہ مع ترجمہ ملاحظہ ہوں:-

۱- شیخ عبداللہ بن سلمان جو دارالافتاء ریاض کے رکن ہیں، فرماتے ہیں:-

"ھذہ النظریۃ تری ان الاوراق النقدیۃ کالفلوس فی

طرف الثمنية عليها فما ثبت للفلوس من احكام الربا والزكاة والسلم تثبت للاوراق النقدية مثلها وقد قال بهذه النظرية مجموعة كبيرة من افاضل العلماء و يعتبر القائل بها في الجملة وسطا بين القائلين بالنظرية السندية والقائلين بالنظرية العرضية، ولا شك انه اقرب الاقوال الى الاصابة في نظرنا۔" (النقد الورقي ص۸۳)

''اس نظریے کا حاصل یہ ہے کہ نوٹ ثمن طاری ہونے میں فلوس کی طرح ہیں، سو رِبا، زکوٰۃ اور سلم کے جو اَحکام فلوس میں جاری ہوتے ہیں، وہ اَحکام نوٹوں میں بھی جاری ہوں گے، اس نظریے کا قائل فاضل علماء کی ایک بڑی جماعت ہے، اور اس نظریے کا قائل دو نظریوں یعنی یہ نظریہ کہ نوٹ سند ہے، اور یہ نظریہ کہ نوٹ عرض ہے، کے درمیان فیصل اور ثالث ہے، (یا اس نظریے کا قائل مذکورہ دو نظریوں کے قائلین کے درمیان میں ہے، یعنی یہ نظریہ اعتدال پر مبنی ہے۔) اور بلاشبہ یہ نظریہ ہماری نظر میں حق اور دُرستگی کے زیادہ قریب ہے۔''[1]

خط کشیدہ عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ نے اس نظریے کی کتنی پُرزور تائید فرمائی کہ:-

الف:- اس قول کو علمائے افاضل کی ایک بڑی جماعت کی طرف منسوب کیا۔

ب:- اس قول کے قائل کو ''وسط'' کہا۔

ج:- اس قول کو حق کے زیادہ قریب کہا۔

شیخ احمد خطیب اس سلسلے میں فرماتے ہیں:-

(۱) بحوالہ جدید فقہی مباحث للقاسمی۔

"فتبین بجمیع ذلك ان النوت کالفلوس النحاسیة فی جمیع احکامها ظاهراً وباطناً (اقناع النفوس بالحاق النوت بالفلوس ص۴۸)

"ان تمام (دلائل) سے یہ بات واضح ہوگئی کہ نوٹ ظاہراً و باطناً تمام اَحکام میں تانبے سے بنے ہوئے فلوس کی طرح ہے۔"[1]

شیخ عبداللہ بن بسام فرماتے ہیں:-

"لانها لیست ذهبا ولا فضة وانما هی اثمان تتغیر کما تتغیر القروش بالکساد والرواج وتقریر الحکومات۔۔۔فان کان الورق بالقروش اشبه وبه اولی فالاحسن ان تلحق به وان تعطی حکمه وحکم القروش معروف الخ (الورق النقدی ص ۸۱)[2]

"کیونکہ یہ (نوٹ) سونا اور چاندی نہیں، یہ تو اثمان ہیں، ان میں "کساد، رواج" اور حکومتوں کے انقلابات سے اس طرح تغیر واقع ہوتا ہے جس طرح نیکل کے سکے بدلتے ہیں، پس اگر نوٹ نیکل کے سکوں کے زیادہ مشابہ ہیں، اور ان کے زیادہ قریب ہیں، تو پھر بہتر یہی ہے کہ ان کو ان ہی کے ساتھ ملایا جائے، اور ان کو ان ہی کا حکم دیا جائے، اور نیکل کے سکوں کا حکم معروف ہے۔"[3]

سعودیہ عربیہ کے علمائے کبار کی مجلس نے نوٹوں کے سلسلے میں اکثریت کے ساتھ جو قرارداد منظور کی، وہ درج ذیل ہے:-

---

(۱) حوالہ بالا۔

(۲) بحوالہ: جدید فقہی مباحث للقاسمی جلد دوم۔

(۳) ایضاً۔

"ان الورق النقدی یعتبر نقداً قائما بذاته کقیام النقدیة فی الذهب والفضة وغیرها من الاثمان وانه اجناس تتعدد بتعدد جهات الاصدار بمعنی ان الورق النقدی السعودی جنس وان الورق النقدی الامریکی جنس وهکذا کل کل عملة ورقیة جنس مستقل بذاته الخ

"نوٹ بذاتِ خود زَر ہے، جیسا کہ سونا چاندی اور دیگر اثمان ہیں، اور یہ کہ نوٹ کی جنس جاری کنندہ کے اختلاف کی وجہ سے مختلف ہوتی ہے، (یعنی دو نوٹ اس وقت مختلف جنس شمار ہوں گے، جب ہر نوٹ کا جاری کنندہ الگ الگ ہو۔) مطلب یہ کہ سعودی نوٹ (ریال) الگ جنس ہے، امریکی نوٹ (ڈالر) الگ جنس ہے، اور اسی طرح ہر کاغذی کرنسی مستقل جنس ہے۔"(۱)

جسٹس مفتی محمد تقی عثمانی فرماتے ہیں:-

"فاتضح بنا ذکرنا ان النقود الورقیة لم تبق الآن سندات لدیون فی تخریجها الفقهی، وانما صارت اثمانا رمزیة یعبر عنها الفقهاء بکلمة الفلوس النافقة، فان الفلوس النافقة تکون قیمتها الاسمیة اضعاف قیمتها الذاتیة فکذلك الاوراق النقدیة تکون قیمتها الاسمیة اضعاف قیمتها الذاتیة وجرت بها التعامل العام فیما بین الناس دون ایما فرق بینها وبین الفلوس النافقة الخ"

"ہماری بحث سے یہ بات واضح ہوگئی کہ کاغذی نوٹ اب دیون کی سندات نہ رہے، اب تو یہ علامتی اثمان بن گئے، جن سے فقہائے

(۱) ابحاث هیئة کبار العلماء بالمملکة العربیة السعودیة، طبع اول ۱۴۰۹ هجر (۱/۵۷)

کرام'' فلوس نافقہ'' کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں، کیونکہ فلوس نافقہ کی ظاہری قیمت اس کی ذاتی قیمت سے کئی گنا زیادہ ہوتی ہے، چنانچہ کاغذی نوٹ کا یہی حال ہے، کہ ان کی ظاہری قیمت ان کی ذاتی قیمت سے کئی گنا زیادہ ہے، اوران نوٹوں کے ذریعے لوگوں کے درمیان تعامل جاری ہے، اور تعامل کے لحاظ سے ان میں اور فلوس میں کوئی فرق نہیں۔''[1]

ڈاکٹر محمد سلیمان الاشقر اس بابت فرماتے ہیں:-

"القول الثالث انها عملة نقدية قائمة بذاتها تعامل معاملة الذهب والفضة الا انها شئی آخر ليست هی الذهب وليست هی الفضة وليست هی قائمة مقام الذهب ولا الفضة، بل هی اجناس اخری بحسب الدول المصدرة لها، فالدنانير الكويتية جنس والدنانير العراقية جنس ثان والدولارات الامريكية جنس ثالث وهكذا۔ ودليل هذا القول دليل واحد وهو القياس علی الذهب والفضة بجامع الثمنية، وهذا القول هو السائد الآن فی الاوساط الاسلامية الملتزمة بالشريعة۔۔۔وقد درج عليه غالبية المسلمين الملتزمين فی التعامل۔۔۔وصدرت الفتاوی من كثير من المفتين بهذا القول وصدرت قرارات من بعض المجامع الفقهية بموجبه الخ"

'' (نوٹوں کے سلسلے میں) تیسرا قول یہ ہے کہ یہ بذاتِ خود ایک کرنسی زَر ہے، جس کے ساتھ سونے چاندی جیسا معاملہ کیا جاتا ہے، مگر

---

(۱) احکام الاوراق النقدیة للعثمانی (ص۱۵)

مختلف چیز ہے، نہ یہ سونا ہے، نہ چاندی ہے، اور نہ سونے چاندی کا قائم مقام ہے، بلکہ یہ (نوٹ) جاری کنندہ ممالک کے پیشِ نظر بالکل مختلف اجناس ہیں، کویتی دِینار ایک جنس ہے، عراقی دِینار جنسِ ثانی ہے، امریکی ڈالر جنسِ ثالث ہے، اور اسی طرح دُوسری کرنسیوں کا حال ہے۔ اور اس قول کی دلیل ایک ہی ہے، اور وہ یہ کہ نوٹوں کو سونے چاندی پر علتِ ''ثمنیت'' کی وجہ سے قیاس کیا جاتا ہے۔ اب ان ممالک میں جہاں شریعت کی پابندی کی جاتی ہے، اسی قول کو دُرست سمجھا جاتا ہے، اور اکثر مسلمان اسی کے مطابق باہمی معاملات چلاتے ہیں، بہت سارے مفتیانِ کرام نے اسی قول کے مطابق فتوے جاری کیے، اور بعض فقہی اکیڈمیوں سے اس کے موافق قراردادیں پاس ہوئی ہیں۔''[1]

ڈاکٹر اشقر کی یہ عبارت اس موقف پر نہایت صاف، واضح اور بے غبار ہے، اور اس میں بہت باتیں اہم ہیں، جن کا مختصر تجزیہ درج ہے:-

۱- نوٹ بذاتِ خود کرنسی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ نوٹ سندِ دَین نہیں، اور نہ ہی عروض ہے، جیسا کہ ظاہر ہے۔

۲- جس کے ساتھ سونے چاندی جیسا معاملہ کیا جاتا ہے، مگر مختلف چیز ہے، نہ یہ سونا ہے، نہ چاندی ہے، اور نہ سونے چاندی کا قائم مقام ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ بات اپنی جگہ دُرست ہے کہ نوٹ تعامل میں سونے چاندی کی طرح ہے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ تعامل کی وجہ سے نوٹ سونے چاندی کا مقام قرار دِیا جائے، اور سونے چاندی کا بدیل قرار دِیا جائے، اور اَحکام میں اس کو سونے چاندی کا تابع بنایا جائے، جیسا کہ تیسرے

---

(۱) مجلة مجمع الفقه الاسلامي، الدورة الخامسة، العدد الخامس، الجزء الثالث، ۱۴۰۹ھ، (ص ۱۶۸۶)

نظریے والوں نے کیا ہے۔

۳- اور اس قول کی دلیل ایک ہی ہے، اور وہ یہ کہ نوٹوں کو سونے چاندی پر علتِ ''ثمنیت'' کی وجہ سے قیاس کیا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سونا چاندی ''مقیس علیہ'' ہے، نوٹ ''مقیس'' ہے، اور ''ثمنیت'' علت ہے۔

۴- اب ان ممالک میں جہاں شریعت کی پابندی کی جاتی ہے، اسی قول کو دُرست سمجھا جاتا ہے، اور اکثر مسلمان اسی کے مطابق باہمی معاملات چلاتے ہیں، بہت سارے مفتیانِ کرام نے اسی قول کے مطابق فتوے جاری کئے، اور بعض فقہی اکیڈمیوں سے اس کے موافق قرارداد یں پاس ہوئی ہیں۔ اس عبارت میں مختلف طریقوں سے اس قول کی ترجیح ذِکر ہے کہ:-

الف:- اکثر ممالک میں یہ قول دُرست سمجھا جاتا ہے۔

ب:- اکثر ممالک میں اس کے مطابق تعامل جاری ہے۔

ج:- بہت سارے مفتیانِ کرام نے اسی قول کے مطابق فتوے جاری کئے۔

د:- بعض فقہی اکیڈمیوں سے اس کے موافق قراردادیں پاس ہوئی ہیں۔

دلائل

دلیلِ اوّل:- نوٹ قانونی کرنسی (Legal Tender) بن گیا ہے، اور معاملات میں نوٹ قبول کرنے پر اس طرح لوگوں کو مجبور کیا جاتا ہے، جس طرح دُوسرے عرفی اثمان کو قبول کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے، حالانکہ اگر دیکھا جائے تو دُوسری مالی دستاویزات کی قبولیت پر لوگوں کو مجبور نہیں کیا جاتا، مثلاً اگر کسی نے دُوسرے شخص کو قرضہ دیا، یا کسی نے دُوسرے شخص کے ہاتھ کوئی بیچی، اور وہ مقروض یا خریدنے والا اس کو نوٹ دیتا ہے، تو اس صورت میں اس کے لئے اِنکار کی گنجائش نہیں، لیکن اگر وہ اس کو نوٹ کے بجائے چیک پکڑاتا ہے، تو وہ چیک قبول کرنے سے قانوناً اِنکار کرسکتا ہے، نیز یہ بھی یاد رہے کہ کرنسی

نوٹ غیر محدود قانونی کرنسی (Unlimited Legal Tender) ہے، جیسا کہ اس کی تفصیل گزر چکی۔

دلیلِ دوم:- ''سندِ دَین'' قانوناً ہر کوئی جاری کرسکتا ہے، مثلاً مدیون دائن کے لئے کوئی رقعہ تحریر کرے، جیسا کہ معاملات میں ہوتا رہتا ہے، لیکن نوٹ جاری کرنے کا اِختیار قانوناً ہر کسی کو حاصل نہیں۔

دلیلِ سوم:- اگر دیکھا جائے تو نوٹ پر ہر جگہ اور ہر عرف میں ''ثمن'' اور ''زر'' کا اطلاق بولا جاتا ہے، جو اس بات کی واضح دلیل ہے کہ نوٹ سندِ دَین یا عروض نہیں، اور نہ ہی سونے چاندی کا بدیل ہے۔

دلیلِ چہارم:- دیکھئے! سکوں میں کاروبار جاری ہے، اور لوگ سکوں کے ذریعے باہمی معاملات چلا رہے ہیں، اور یہ نہیں دیکھتے کہ ان کی پشت پر سونا یا چاندی ہے، یا نہیں، یہی حال بعینہٖ آج کل نوٹوں کا ہے، کہ لوگوں کے معاملات میں نوٹ چل رہے ہیں، اور تعامل میں نوٹ جاری ہیں، لیکن کسی کا سونا یا چاندی کی طرف ذہن ہی نہیں جاتا، اس صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے نوٹ کو سونے چاندی کی سند، یا عروض یا سونے چاندی کا بدیل کس طرح کہیں گے؟

دلیلِ پنجم:- سونے چاندی کے اِرتقاء (Evolution) پر جو مراحل گزرے ہیں، اس میں یہ بات ہم نے ذِکر کی ہے کہ اب کچھ عرصے سے ان نوٹوں کی پشت سونے اور چاندی سے بالکل خالی ہوگئی، اور نوٹ کو سونے چاندی کا کوئی سہارا حاصل نہیں، اس حال میں نوٹ سونا یا چاندی کی کس طرح سند ہوگی، یا کس طرح بدیل ہوگا؟ اس سلسلے میں جیوفرے گراؤتھر (Geoffry Growther) کی عبارت پیچھے گزر چکی ہے۔

دلیلِ ششم:- یہ بات تفصیل کے ساتھ گزر چکی ہے کہ نوٹ کو سندِ دَین یا عروض قرار دینے کی صورت میں کئی مفاسد لازم آتے ہیں، اور رِبا کا دروازہ کھل سکتا ہے، نیز اس سے ''سد الذرائع'' کے قاعدے میں جو شریعت کا بہت اہم قاعدہ ہے، خلل پڑسکتا ہے،

کیونکہ اگر نوٹ کو عروض قرار دے کر اس میں رِبا الفضل کو جائز قرار دیا جائے، تو لوگ اس کا بصورتِ بیع (Sale) کاروبار شروع کریں گے، اور رِبا الفضل کا بازار گرم ہو جائے گا، کیونکہ ہمارے ہاں سونا چاندی تو ہے نہیں، یہی نوٹ سب کچھ ہے۔

دلیلِ ہفتم:۔ نوٹ کو سندِ دَین یا عروض قرار دینے کی صورت میں لوگ معاملات کے سلسلے میں مختلف مشاکل اور مسائل میں واقع ہو جائیں گے، اور معاملات میں حرج ومشقت پیش آجائے گی، تفصیل گزر چکی ہے، اور حرج شریعتِ اسلامیہ میں مرفوع اور مدفوع ہے، جبکہ نوٹ کو بذاتِ خود ثمن قرار دینے میں اس قسم کی کوئی خرابی نہیں، اور نہ ہی کوئی حرج ہے۔

دلیلِ ہشتم:۔ بابِ اوّل میں ''زَر'' کی جو تعریف (Definition) بیان ہو چکی ہے، وہ مکمل طریقے سے نوٹ پر صادق ہے، لہٰذا نوٹ کو زَر نہ کہنا خلافِ انصاف ہے۔

دلیلِ نہم:۔ بابِ اوّل میں زَر کے جو وظائف (Functions) بیان ہو چکے ہیں، زَر وہ تمام وظائف بحسن وخوبی انجام دیتے ہیں، پھر کیوں نوٹ کو زَر نہ کہا جائے؟[1]

نوٹ کی فقہی حیثیت میں قولِ راجح

انہی دلائل اور وجوہات کی بناء پر نوٹ کی شرعی حیثیت کے بارے میں راجح قول یہی ہے کہ:۔

---

(۱) احکام الاوراق النقدیة والتجاریة فی الفقه الاسلامی للجعید عن الورق النقدی لابن منیع (ص۱۴۷)

_____ مجلة البحوث الاسلامیة، العدد الاول من المجلد الاول (ص۲۰۵)

_____ فقه الزکاة للقرضاوی (۱/۲۷۱)

_____ المعاملات المالیة المعاصرة فی الفقه الاسلامی

_____ جدید فقهی مباحث

_____ احکام الاوراق النقدیة للعثمانی

نوٹ بذاتِ ثمن ہے، اس پر سونے چاندی کی طرح ثمن کے اَحکام جاری ہوں گے، بس اتنا فرق ہے کہ سونا چاندی ثمنِ خلقی ہے، اور نوٹ ثمنِ عرفی ہے، نوٹ نہ سندِ دَین ہے، نہ عروض ہے، اور نہ سونے چاندی کا بدیل(Substitute) ہے۔

وجوہِ ترجیح

وجوہِ ترجیح اِختصار کے ساتھ ذیل میں ملاحظہ ہوں!

۱-نوٹ پر زَر کی ذِکر کردہ تعریفات مکمل طور پر صادق آتی ہیں۔

۲-زَر کے جو شرعی اور اِقتصادی وظائف ہیں، وہ نوٹ بحسن وخوبی سرانجام دیتا ہے۔

۳-نوٹ کو زَر اور بذاتِ خود ثمن قرار دینے سے زکوٰۃ، سلم، مشارکہ، مضاربہ وغیرہ معاملات میں نہایت سہولت پیدا ہو جاتی ہے۔

۴-نوٹ کو زَر اور ثمن قرار دینے سے سود کا دروازہ بند ہو جاتا ہے، اور شریعت کے اہم اصل ''سدالذرائع'' پر عمل ہو جاتا ہے۔

۵-نوٹ کی پشت پر سونا چاندی نہیں ہیں۔

۶-ہر علاقے اور ہر عرف میں نوٹ پر زَر کا اِطلاق ہوتا ہے۔

۷-نوٹوں کے ساتھ تعامل کے وقت کسی کا ذہن سونے یا چاندی کی طرف نہیں جاتا۔

۸-نوٹ کو قانونی طور پر کرنسی کا درجہ دیا گیا ہے۔

۹-نوٹ کے اِجراء کا حق ہر کسی کو حاصل نہیں، بلکہ صرف مرکزی بنک ہی اس کا مجاز ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جمہور علمائے اُمت نے اسی قول کو اِختیار کیا، اور اسی کو ترجیح دی، اور اَحکامِ شرعیہ میں اسی قول کے مطابق فتاویٰ صادر کرتے ہیں، جیسا کہ تفصیل کے ساتھ

ان کی اصل عبارات بمع اُردو ترجمے کے ذِکر ہوئیں۔[1]

تنبیہ

اگر دیکھا جائے، تو ان حضرات کی بات بھی دُرست ہے، جو نوٹ کو سندِ دَین قرار دے رہے ہیں، لیکن یہ بات اس وقت دُرست تسلیم کی جاسکتی تھی، جب اس کی پشت پر سونا یا چاندی تھی، لہٰذا جس زمانے میں نوٹ کی پشت سونے چاندی سے خالی نہیں تھی، اس وقت اگر کوئی نوٹ کو سندِ دَین کہتا، تو اس کی بات دُرست تھی، لیکن جب اس کی پشت سونے چاندی سے خالی ہوگئی، تو اَب اِس کو سونے چاندی کی سند کہنے کی کوئی معقول اور وزنی وجہ اور دلیل موجود نہیں۔

یہ قاعدۂ شرعیہ مُسلَّم ہے کہ زمانے میں تغیر (Changing) واقع ہونے کی وجہ سے غیر منصوص اَحکامِ شرعیہ میں تغیر واقع ہوسکتا ہے، جس کے شریعت میں بہت نظائر ہیں، یہاں ان کو ذِکر کرنا مناسب نہیں، انہی میں سے نوٹ کا مسئلہ بھی قرار دِیا جاسکتا ہے، کہ اُس وقت یہ سند تھا، اور بعد میں بذاتِ خود ثمن بن گیا، تو آراء میں اختلاف، زمانے میں اختلاف کی وجہ سے ہوا۔

---

(۱) اضافی حوالہ جات:-المعاملات المالية المعاصرة "الراجح ماذهب اليه الفريق الثالث من ان النقود الورقية تقوم مقام النقود الذهبية والفضية فى التعامل، وتاخذ صفة الثمنية لان العرف العام الخ"(ص۱۹۱)

جدید فقہی مباحث میں مذکور ہے: ''حاصل کلام یہ کہ کاغذی نوٹ فلوس کی طرح اثمان مروّجہ ہیں، لہٰذا جو اَحکام فلوس کے ہوں گے، وہی اس کے بھی ہوں گے اگر چہ الخ'' (۲/۱۸۵)

اسلام وجدید معیشت وتجارت میں ہے: ''صحیح نقطۂ نظر یہ ہے کہ نوٹ رسید نہیں بلکہ خود مال ہیں، سونے چاندی کی طرح ثمنِ حقیقی نہیں بلکہ ثمنِ عرفی ہیں الخ'' (ص۱۰۶)۔

كذافى اقتصاديات النقود فى اطار الفكر الاسلامى، متولى(ابوبكر الصديق عمر) قاهره، مكتبه وهبه، طبع اول ۱۴۰۳ هـ۔

فائدہ

نوٹ سے متعلق مذکور چار نظریوں میں سے نظریۂ سند اور نظریۂ عروض بالکل الگ اور ممتاز ہیں، ایک دُوسرے سے بھی ممتاز ہیں اور آخری دو نظریوں سے بھی ممتاز ہیں، البتہ آخری دو نظریے پہلے دو نظریوں سے تو ممتاز ہیں، لیکن باہم ملتے جلتے ہیں، جس کی وجہ سے اشتباہ (Confusion) میں واقع ہونے کا اندیشہ ہے، تو خوب سمجھنا چاہئے کہ یہ دونوں نظریے اس بات پر متفق ہیں کہ نوٹ سندِ دَین یا عروض نہیں، بلکہ ثمن ہے، ثمنیت پر ان کا اتفاق ہے، لیکن فرق یہ ہے کہ نظریۂ سوم کی رُو سے نوٹ بذاتِ خود ثمن نہیں، بلکہ سونے چاندی کا بدیل (Substitute) ہے، اس وجہ سے ہم اس کو ثمن کہتے ہیں، لہٰذا اس کے اَحکام اوّل سے آخر وہی ہوں گے جو سونے چاندی کے ہیں، یہاں تک کہ اس نظریہ کی رُو سے نوٹوں کا تبادلہ صرف ہوسکتا ہے، جبکہ نظریۂ چہارم کی رُو سے نوٹ بذاتِ خود ثمن ہے، یہ کسی شیٔ کا قائم مقام نہیں، البتہ ثمن ہونے کی وجہ سے اس کے اَحکام سونے چاندی کے ہوں گے، لیکن خلقت اور عرف کا فرق ہوگا، نوٹ ثمنِ عرفی ہے، اس لئے فلوس کی طرح ہوں گے، اور ان کا تبادلہ صرف نہیں ہوگا، اور سونا چاندی ثمن خلقی ہے، اس لئے ان میں صرف ہوسکتا ہے، اس لئے زکوٰۃ کے مسئلے کی تخریج میں بھی دونوں موقفوں میں فرق ہے، جس کی تفصیل گزر گئی۔

فلوس (Pices) کی حقیقت

فلوس ''فلس'' کی جمع ہے، فلس پیسہ کے معنی میں ہے، اسی سے ''افلاس'' اور ''تفلیس'' مشتق (Drived) ہے، افلاس کے معنی غربت کے ہیں، اور تفلیس کے معنی ہیں: حاکم کا کسی کو مفلس قرار دینا۔[1]

اور اِصطلاح میں فلوس تانبے کے ان ڈھلے ہوئے ٹکڑوں (Pieces) کو کہتے

---

(۱) لسان العرب، ابن المنظور متوفی ۷۱۱ھ، بیروت، داراحیاء التراث العربی، طبع اول ۱۴۰۸ھ (۳۱۸/۱۰)۔

ہیں، جو لوگوں میں سکوں کی طرح رائج ہوں، اس کو ''فلوس نافقہ'' یا ''فلوس رائجہ'' بھی کہتے ہیں۔(۱)

فلوس کے اِرتقائی مراحل کا خلاصہ

۱- زمانۂ جاہلیت، یعنی اسلام سے قبل اور ظہورِ اسلام کے بعد ایک عرصہ تک لوگ فلوس کی جگہ انڈے، یا گندم وغیرہ استعمال کرتے تھے، اور انڈے یا گندم یا کوئی بھی غلہ تعاملاً استعمال ہوتا تھا۔

۲- اس کے بعد لوگوں نے تانبے کے ٹکڑے استعمال کرنے لگے، لیکن یہ ٹکڑے ڈھلے ہوئے نہیں ہوتے تھے۔

۳- اس کے بعد فلوس باقاعدہ ڈھلنے لگے، اور ان کو ایک قانونی شکل دی گئی، ہر فلس کی ایک جانب اس وقت کے بادشاہ کا نام اور لقب کندہ ہوتا تھا، اور دُوسری جانب متعلقہ ملک کا نام درج ہوتا تھا، نیز جس سن میں سکہ ڈھلا ہے، وہ سن درج ہوتا تھا، یہاں سے باقاعدہ فلوس کا آغاز ہوا۔

۷۸۱ھ میں ملک ظاہر برقوق کے زمانے میں فلوس کا بہت زیادہ رِواج ہوگیا، اور

---

(۱) الفقه الاسلامي وادلته، الزحيلي (الدكتور وهبه الزحيلي) دمشق، دارالفكر، طبع اول ۱۴۰۴ھ

"الفلوس جمع فلس، وهو قطعة من النحاس كان يتعامل بها الخ" (۴/۸۰۹)۔

______ اقرب الموارد، الشرتوني (علامه سعيد الخوري الشرتوني) لبنان، دارالاسوة للطباعة النشر، طبع اول ۱۳۷۴ھ۔

"الفلس قطعة مضروبة من النحاس يتعامل بها وهي من المسكوكات القديمة (۴/۱۹۷)

______ شرح منح الجليل (علامه محمد عليش

"فلوس بضم الفاء جمع فلس بفتحها وسكون اللام، اى النحاس المسكوك الذى يتعامل به (۳/۵۳۴)۔

كذا فى دائرة معارف القرآن، وجدى، (محمد فريد وجدى) مطبعة دائرة معارف القرآن ۱۳۵۷ھ (۷/۴۰۳)۔

فلوس میں رِواج اور تعامل اس حد تک بڑھنے لگا کہ قریب تھا کہ دِرہم کا وجود ہی ختم ہو جاتا، بعض روایات میں ہے کہ اس وقت کے امیر نے بہت بڑی تعداد میں فلوس ڈھالے، اور دَراہم میں تعامل کو معطل کر دیا۔

فلوس میں تعامل وزناً بھی ہوتا تھا، اور عدداً بھی، بعد میں فلوس عددی اشیاء میں شمار ہونے لگے، چنانچہ اَحکامِ شرعیہ میں فلوس کا عددی ہونے کے لحاظ سے اعتبار ہے۔ (۱)

فلوس کے ثمن ہونے یا نہ ہونے میں اختلافِ فقہاء

''زَر'' کے استعمال اور اس کے اطلاق کے سلسلے میں بابِ اوّل میں تین موقفوں کا تفصیل کے ساتھ ذِکر کیا تھا، وہاں یہ بات ذِکر ہوئی تھی کہ بعض فقہائے کرامؒ کے ہاں زَر کے اِطلاق کا دائرہ بہت وسیع ہے، اور ان کے ہاں زَر یا ثمن کا اطلاق ''فلوس'' پر بھی ہوتا ہے، یہیں سے فلوس کے ثمن ہونے یا نہ ہونے میں اختلافِ فقہاء کا آغاز ہو جاتا ہے، کہ بعض حضرات فلوس کو ثمن اور زَر کہتے ہیں، جبکہ دیگر حضرات فلوس کو زَر یا ثمن نہیں کہتے، ہم یہاں قدرے تفصیل سے ان اقوال کو بمع ادلہ اور تفریعات کے ذِکر کرتے ہیں۔

فقہائے کرام کی عبارات کے تتبع اور اِستقراء سے اور ان پر غور کرنے سے اس سلسلے میں تین اقوال سامنے آتے ہیں، جو درج ذیل ہیں:-

۱- حضراتِ حنفیہ میں سے اِمام محمدؒ، محمد بن الفضلؒ، علامہ سرخسیؒ، علامہ حلوانیؒ، حضراتِ مالکیہ، علامہ ابنِ تیمیہؒ، اور علامہ ابن القیمؒ، ان حضرات کا قول یہ ہے کہ فلوس اثمان ہیں۔

۲- حضراتِ حنفیہ میں سے اِمام ابوحنیفہؒ، اِمام ابو یوسفؒ کے ہاں فلوس کو ثمنیت لازم نہیں اور متعین کرنے سے متعین ہوتے ہیں، اور حضرات شافعیہ کا قول یہ ہے کہ فلوس اثمان نہیں۔

---

(۱) تطور النقود فی اطار الفکر الاسلامی، الحسنی (الدکتور احمد حسن احمد الحسنی) طبع اول ۱۴۱۰ ھ، دارالمدنی۔

۳- حضراتِ حنابلہ کی اس سلسلے میں دو روایتیں ہیں، ایک روایت یہ ہے کہ فلوس اثمان ہیں، یہی اِمام احمد بن حنبلؒ سے منصوص قول ہے، اور یہی ان کے ہاں راجح ہے، اور دُوسری روایت بعض حنابلہ علماء کی ہے، اور وہ یہ کہ فلوس اثمان نہیں ہیں، گویا کہ حنابلہ ایک روایت میں فریقِ اوّل کے ساتھ ہیں، اور دُوسری روایت کے مطابق فریقِ ثانی کے ساتھ ہیں۔

فریقِ اوّل:- اِمام محمدؒ کا مذکورہ موقف ان اَحکام سے معلوم ہوتا ہے، جو ربا، سلم، مشارکہ اور مضاربہ کے ضمن میں فقہائے کرامؒ نے بیان کئے ہیں، مثلاً ''رِبا'' (Interest) کے مسئلے میں علامہ کاسانیؒ فرماتے ہیں:-

''ویجوز بیع المعدودات المتقاربة من غیر المطعومات بجنسها متفاضلاً عند ابی حنیفة وابی یوسف بعد ان یکون یداً بید کبیع الفلس بالفلسین باعیانهما، وعند محمد لا یجوز۔ وجه قوله، ان الفلوس اثمان فلایجوز بیعها بجنسها متفاضلا کالدراهم والدنانیر، ودلالة الوصف عبارة عما تقدر به مالیة الاعیان ومالیة الاعیان کما تقدر بالدراهم والدنانیر تقدر بالفلوس فکانت اثمانا، ولهذا کانت اثمانا عند مقابلتها بخلاف جنسها، وعند مقابلتها بجنسها حالة المساواة، وان کانت ثمنا فالثمن لا یتعین وان عین کا الدراهم والدنانیر فالتحق التعین فیهما بالعدم فکان بیع الفلس بالفلسین بغیر اعیانهما، وذا لا یجوز، ولانها اذا کانت اثمانا فالواحد یقابل الواحد فبقی الآخر فضل مال لا یقابله عوض فی عقد المعاوضة

وهذا تفسير الربا الخ"[1]

''کھانے جانے والی اشیاء کے علاوہ جو اشیاء ''معدودات متقاربہ'' میں سے ہوں، ان کی بیع بجنسہا زیادت کے ساتھ امام ابوحنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک جائز ہے، لیکن اس میں یہ ضروری ہے کہ ہاتھ در ہاتھ ہو، جیسا کہ ایک فلس کے مقابلے میں دو فلسوں کی بیع جائز ہے، جبکہ یہ دونوں معین ہوں، اور امام محمدؒ کے نزدیک یہ جائز نہیں۔ امام محمدؒ کے قول کی وجہ یہ ہے کہ فلوس اثمان ہیں، لہٰذا دراہم اور دنانیر کی طرح ان کی بیع بجنسہا زیادتی کے ساتھ جائز نہیں، اور وصفِ (ثمنیت) کی دلیل یہ ہے کہ جس چیز سے اشیاء کی مالیت کا اندازہ کیا جاتا ہے، اور اشیاء کی مالیت کا اندازہ جس طرح دراہم اور دنانیر کے ساتھ کیا جاتا ہے، اس طرح فلوس کے ساتھ بھی کیا جاتا ہے، لہٰذا فلوس اثمان ہوں گے، اور یہی وجہ ہے کہ فلوس کا مقابلہ جب غیر جنس کے ساتھ ہو، یا جنس کے ساتھ ہو، لیکن دونوں طرف ساوی ہوں، تو فلوس کو اثمان قرار دیا جاتا ہے، اور جب جب فلوس

---

(۱) بدائع الصنائع، الكاساني (الامام العلامة علاء الدين ابی بكر بن مسعود الكاسانی) کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی، طبع اول ۱۳۲۸ھ

مراجع اضافیه:

البحر الرائق شرح كنز الدقائق، ابن نجيم (الشيخ العلامة زين الدين بن ابراهيم متوفى ۹۷۰ھ) بیروت، دارالكتب العلمية، طبع اول ۱۴۱۸ھ (۲۱۹/۶)

فتح القدير شرح الهداية، ابن الهمام (كمال الدين محمد بن عبدالواحد المعروف بابن الهمام) كوئٹه، المكتبة الرشيديه، كوئٹه پاكستان، (۲۰۸/۶)

الفتاوى العالمگیرية، جماعة من العلماء الكبار، كوئٹه، مکتبه رشیدیه، طبع دوم، ۱۴۰۲ھ (۲۲۴/۳)۔

اثمان ہیں، تو ثمن تعیین سے متعین نہیں ہوتے، جیسا کہ دَراہم اور دَنانیر کا معاملہ ہے، لہٰذا ان میں "تعیین" کالعدم ہوگئی، تو اب یہ سمجھا جائے گا، کہ یہاں غیر معین فلس کی غیر معین فلسین کے ساتھ بیع ہوئی، اور یہ جائز نہیں، اور اسی لئے بھی کہ جب یہ اثمان ہیں، تو ایک فلس ایک فلس کے مقابلے میں آجائے گا، اور ایک فلس عوض سے خالی رہ جائے گا، اور یہی رِبا کی تفسیر ہے۔"

علامہ کاسانیؒ کی یہ عبارت کئی مفید نکات پر مشتمل ہے:-

۱-اس عبارت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اِمام محمدؒ کے نزدیک فلس کی بیع فلسین کے ساتھ ناجائز ہے۔

۲-عدمِ جواز کی وجہ ان کے نزدیک فلوس کا ثمن ہونا ہے۔

۳-ثمن کے فلوس ہونے کی دلیل فلوس کے وظائف ہیں، چونکہ فلوس کے وظائف وہی ہیں جو دَراہم ودَنانیر کے ہیں، اس لئے فلوس وصفِ ثمینت کے ساتھ متصف ہوں گے۔

۴-فلوس کے ثمن ہونے کی ایک اور دلیل یہ ہے کہ جب بیع میں ایک طرف فلوس ہوں، اور دُوسری طرف مثلاً غلام ہو، یا جب ایک فلس کا مقابلہ ایک فلس کے ساتھ ہو، تو ان صورتوں میں بالاتفاق فلوس کو ثمن قرار دِیا جاتا ہے، لہٰذا فلس بفلسین کی صورت میں بھی فلوس اثمان ہوں گے۔

۵-اور جب فلوس اثمان ہوگئے، تو ثمن تعیین سے متعین نہیں ہوتے، لہٰذا فلوس میں عاقدین یعنی بائع اور مشتری کی تعیین کا کوئی اعتبار نہیں ہوگا، اور عدمِ تعیین کے وصف میں فلوس دِرہم ودِینار کی طرح ہوں گے۔

۶-اب یہ سمجھا جائے گا کہ ایک فلس ایک فلس کے مقابلے میں آگیا، اور ایک

فلس عوض سے خالی رہ گیا، اور یہی تو رِبا کی تعریف اور تفسیر ہے، لہٰذا فلس کی بیع بفلسین ناجائز ہوگی۔

۷- البتہ بیع فلس بفلسین کی صورت میں چونکہ جنس ایک ہے، اس لئے علتِ قاصرہ کے تحقق کی وجہ سے ''نساء'' بالاتفاق ناجائز ہوگا۔

شرکت اور مضاربت کے بارے میں علامہ کاسانیؒ فرماتے ہیں:-

"واما الفلوس فان كانت كاسدة فلاتجوز الشركة ولا المضاربة بها، لانها عروض، وان كانت نافقة فكذلك في الرواية المشهورة عن ابي حنيفة وابي يوسف وعند محمد تجوز۔ والكلام فيها مبني على اصل وهو ان الفلوس الرائجة ليست اثمانا على كل حال عند ابي حنيفة وابي يوسف لانها تتعين بالتعيين في الجملة وتصير مبيعا باصطلاح العاقدين، وعند محمد الثمنية لازمة للفلوس النافقة فكانت من الاثمان المطلقة، لهٰذا ابى جواز بيع الواحد منهما باثنين، فتصير رأس مال الشركة كسائر الاثمان المطلقة الخ"[1]

''فلوس اگر کھوٹے ہوں (یعنی رِواج میں نہ ہوں)، تو ان میں شرکت اور مضاربت جائز نہیں، کیونکہ یہ عروض ہیں، اور اگر کھرے ہوں، (یعنی رواج میں ہوں) بھی اِمام ابوحنیفہؒ اور اِمام ابویوسفؒ کے نزدیک ان شرکت جائز نہیں، اور اِمام محمدؒ کے نزدیک جائز ہے۔ فلوس میں یہ بحث ایک اور اصل پر مبنی (Based) ہے، اور وہ یہ کہ فلوس رائجہ ہر حال میں اثمان نہیں، کیونکہ یہ کسی نہ کسی درجے میں

(۱) بدائع الصنائع (۵۹/۶)

تعیین سے متعین ہوجاتے ہیں، اور عاقدین کے کی اِصطلاح سے فلوس مبیع بھی بنتے ہیں، اور اِمام محمدؒ کے نزدیک فلوس نافقہ کو وصفِ ثمنیت لازم ہے، لہٰذا فلوس اثمانِ مطلقہ میں سے ہیں، اسی وجہ سے اِمام محمدؒ ایک فلس کی بیع دو کے مقابلے میں جائز قرار نہیں دیتے ہیں، لہٰذا شرکت میں فلوس دُوسرے اثمانِ مطلقہ کی طرح کا رُؤس المال (Capital) بننا دُرست ہوگا۔"

جاننا چاہئے کہ شرکت اور مضاربت میں شرعی اُصول یہ ہے کہ ان دونوں میں رأس المال کا نقود ہونا ضروری ہے، سامان رأس المال نہیں بن سکتا، اسی اُصول کی بناء پر اِمام محمدؒ کے نزدیک فلوس کے ساتھ شرکت اور مضاربت دُرست ہیں، جبکہ اِمام ابوحنیفہؒ اور اِمام ابو یوسفؒ کے نزدیک دُرست نہیں۔

علامہ کاسانیؒ نے "فی الروایة المشهورة عن ابی حنیفة وابی یوسف" کہا، کیونکہ اس سلسلے میں ان حضرات سے ایک غیر مشہور روایت بھی مروی ہے، جس کے مطابق ان کے ہاں بھی فلوس میں شرکت اور مضاربت دُرست ہیں، چنانچہ تنویر الابصار متن الدر المختار میں ہے:-

"ولا تصح مفاوضة وعنان بغیر النقدین والفلوس النافقة الخ"

"اور شرکت مفاوضہ اور شرکت عنان سونے، چاندی اور فلوس کے بغیر دُرست نہیں۔"(۱)

اس عبارت سے صاف طور پر یہ بات معلوم ہورہی ہے کہ فلوس کے ساتھ بھی

---

(۱) تنویر الابصار متن الدر المختار، التمرتاشی (محمد بن عبد الله بن احمد الخطیب التمرتاشی الغزی المتوفی ۹۳۹) بیروت، داراحیاء التراث العربی، طبع اول ۱۴۱۹ھ (۳۷۵/۶)

شرکت دُرست ہے، اور اس حکم میں مضاربت شرکت کی طرح ہے، لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ مشہور اور صحیح روایت وہی ہے کہ فلوس میں ان کے نزدیک شرکت اور مضاربت دُرست نہیں۔

اِزالۂ وہم

اِمام محمدؒ کی مشہور کتاب ''کتاب الاصل'' میں یہ مذکورہ ہے کہ فلوس میں اِمام محمدؒ کے نزدیک ''سلم'' دُرست ہے، جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس مسئلے میں اِمام محمدؒ نے فلوس کے سلسلے میں اپنا موقف ترک کر دیا، تب ہی تو فلوس میں سلم کو جائز قرار دِیا، کیونکہ سلم کے صحیح ہونے کی شرائط میں سے ایک شرط یہ بھی ہے کہ ''مسلم فیہ'' (مبیع) ایسی شئ ہو، جو متعین کرنے سے متعین ہوتی ہو، یہی وجہ ہے کہ دِرہم و دِینار میں بیع سلم دُرست نہیں، کیونکہ دِراہم و دِینار متعین کرنے سے متعین نہیں ہوتے، تو جب اِمام محمدؒ نے فلوس میں بیع سلم کو جائز قرار دِیا، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ انہوں نے فلوس میں وصفِ ثمنیت کو باطل کیا، اور فلوس کو یہاں عروض میں شمار کیا، چنانچہ مشہور کتابِ فقہ "تحفة الفقهاء" میں مذکور ہے:-

"واما السلم فی الفلوس فقد ذکر فی "الاصل" وقال : انه یجوز"

''فلوس میں سلم کے بارے میں اِمام محمدؒ نے ''الاصل'' میں فرمایا کہ یہ جائز ہے۔''(۱)

لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ کتاب الاصل میں ذِکر کردہ یہ موقف درحقیقت اِمام ابوحنیفہؒ اور اِمام ابو یوسفؒ کا ہے، اور اِمام محمدؒ نے یہاں اپنا موقف ذِکر نہیں کیا ہے، لہٰذا اس سے اس وہم میں مبتلا نہیں ہونا چاہئے کہ اِمام محمدؒ نے اس مسئلے میں اپنا موقف تبدیل کیا ہے، جیسا کہ صاحبِ تحفہ نے مذکورہ عبارت ذِکر کر کے فرمایا:-

---

(۱) تحفة الفقهاء، السمرقندی، (علامه علاء الدین المتوفی ۵۳۹ھ)، دمشق، مطبعة جامعه دمشق، طبع اول، ۱۳۷۷ھ

"ویجب ان یکون ذلك علی قول ابی حنیفة وابی یوسف۔۔۔وعلی قول محمد لا یجوز"

"یہ ضروری ہے کہ یہ مسئلہ اِمام ابوحنیفہؒ اور اِمام ابویوسفؒ کے قول پر مبنی ہو، اور اِمام محمدؒ کے قول کے مطابق یہ معاملہ دُرست نہیں۔"(۱)

چنانچہ علامہ کاسانیؒ سلم کے بارے میں صاف انداز میں لکھتے ہیں:-

"واما السلم فی الفلوس عددا فجائز عند ابی حنیفة وابی یوسف وعند محمد لا یجوز بناء علی ان الفلوس اثمان عنده فلا یجوز السلم فیها کما لا یجوز السلم فی الدراهم اوالدنانیر وعندهام الخ"

"فلوس میں سلم عدد کے اعتبار سے اِمام ابوحنیفہؒ اور اِمام ابویوسفؒ کے نزدیک دُرست ہے، اور اِمام محمدؒ کے نزدیک جائز نہیں، اور وجہ یہ ہے کہ فلوس اِمام محمدؒ کے نزدیک اثمان ہیں، لہٰذا ان میں سلم ناجائز ہوگا، جیسا کہ دَراہم اور دَنانیر میں بیع سلم جائز نہیں ہے، اور ان کے نزدیک الخ"(۲)

خلاصہ

خلاصہ یہ کہ رِبا، مشارکت، مضاربت اور سلم کے ان ذِکر کردہ مسائل سے یہ بات بالکل واضح ہوکر سامنے آئی کہ فلوس اِمام محمدؒ کے نزدیک اثمانِ مطلقہ ہیں، اور وصفِ ثمنیت ان کو لازم ہے، اور حضرات شیخینؒ (یعنی اِمام ابوحنیفہؒ اور اِمام ابویوسفؒ) کے نزدیک فلوس اثمانِ مطلقہ نہیں، وصفِ ثمنیت ان سے الگ ہوسکتی ہے۔

---

(۱) حوالہ بالا۔

(۲) بدائع الصنائع (۲۰۸/۵)، کذا فی البحر الرائق (۲۶۱/۶) وفی الدرالمختار مع ردالمحتار (۳۴۹/۷)

محمد بن الفضل، شمس الائمہ سرخسیؒ اور شمس الائمہ حلوانیؒ کا موقف

محمد بن الفضل، شمس الائمہ السرخسی اور شمس الائمہ الحلوانی: ان کے موقف کے بارے میں استاد الجعید فرماتے ہیں:-

"ویوافق محمد بن الحسن علی هذا الاصل بعض علماء الحنفية مثل محمد بن الفضل واختاره السرخسی وشيخه الحلوانی"

"اس اصل میں اِمام محمدؒ کے ساتھ بعض علمائے حنفیہ متفق ہیں، مثلاً: محمد بن الفضل، اور اسی کو علامہ سرخسی اور ان کے استاد علامہ حلوانی نے اختیار کیا ہے۔"(۱)

حضراتِ مالکیہ

مالکیہ کے ہاں فلوس اثمان ہیں، البتہ بیع فلس بفلسین میں ان کے ہاں اقوال مختلف ہیں، یعنی یہ کہ یہ معاملہ حرام ہے، مکروہ ہے، حلال ہے۔

لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ ان کے نزدیک قولِ راجح یہی ہے کہ یہ معاملہ ناجائز اور حرام ہے، جیسا کہ جسٹس مفتی محمد تقی عثمانی صاحب نے لکھا ہے:-

"وذلك ان بيع الفلس بالفلسين حرام مطلقا وهو من الربا المحرم شرعا عند الامام مالك بن انس ومحمد بن الحسن الشيبانی الخ"

"اور یہ اس وجہ سے کہ فلس کے مقابلے میں دو فلسوں کی بیع حرام مطلق ہے، اور یہ شرعاً اِمام مالک بن انسؒ اور اِمام محمدؒ کے نزدیک رِبا

(۱) احكام الاوراق النقدية والتجارية عن البدائع والفتاوى الهندية والمبسوط (ص۳۹)

حرام ہے۔"[1]

حضراتِ مالکیہ کے ہاں ان تین اقوال کا منشاء یہ نہیں کہ ان کے ہاں فلوس کے ثمن ہونے میں اختلاف ہے، بلکہ ان کے ہاں فلوس اثمان ہیں، اور یہی ہمارا مقصود ہے، بلکہ اس کا منشاء دو چیزیں ہیں، جو درج ذیل ہیں:-

منشاءِ اوّل

الف:- فلوس کو اگر سونے اور چاندی پر قیاس کیا جائے، اور یہ کہا جائے کہ ثمنیت کی علت کی وجہ سے یہ سونے اور چاندی کی طرح ہیں، تو اس کا تقاضا یہ ہے کہ فلوس اَحکام میں سونے اور چاندی کی طرح ہو، لہٰذا جس طرح ایک دِینار کے مقابلے میں دو دِیناروں کی اور ایک دِرہم کے مقابلے میں دو دِرہموں کی بیع حرام ہے، اسی طرح ایک فلس کے مقابلے میں دو فلسوں کی بیع بھی حرام ہو۔

ب:- اور اگر یہ کہا جائے کہ ٹھیک ہے فلوس اثمان ہیں، لیکن سونا اور چاندی کی طرح نہیں، اور نہ ہی یہ سونا چاندی ہیں، اور احادیث نہی میں سونا اور چاندی کا ذِکر ہے، تو اس کا تقاضا یہ ہے کہ یہ معاملہ حلال ہو۔

ج:- اور اگر اس تذبذب کو دیکھا جائے، تو اس کا تقاضا یہ ہے کہ یہ معاملہ مکروہ ہو۔

منشاءِ دوم

نقدین (سونے چاندی) میں رِبا کے حرام ہونے کی جو علت ہے وہ متعدی ہوتی ہے، یا نہیں، جو تعدی کے قائل ہیں ان کے نزدیک مذکورہ معاملہ حرام ہے، جو تعدی کے

---

(۱) احکام الاوراق النقدیة للعثمانی (ص۱۷)

قائل نہیں، تو ان کے نزدیک مذکورہ معاملہ حلال ہے، اور جو تذبذب کا شکار ہیں، ان کے نزدیک مکروہ ہے۔ (۱)

حضرت اِمام مالکؒ کی مشہور کتاب "المدونۃ" سے چند عبارات بطورِ نمونہ ملاحظہ ہوں:-

"قلت : ارأیت ان اشتریت فلوسا بدراھم فافترقنا قبل ان نتقابض، قال: لا یصلح ھذا فی قول مالك، وھذا فاسد، قال: لی مالك : لاخیر فیھا نظرة بالذھب ولا بالورق، ولو ان الناس اجازوا بینھم الجلود حتی تکون لھا سکة وعین لکرھتھا ان تباع بالذھب والورق نظرة۔ قلت: ارأیت ان اشتریت خاتم فضة او خاتم ذھب او تبر ذھب بفلوس فافترقنا قبل ان نتقابض ایجوزھذا فی قول مالك ؟ قال: لا یجوز فلس بفلسین۔۔۔ قال اللیث بن سعد عن یحی بن سعید وربیعة انھما کرھا الفلوس بالفلوس وبینھما فضل اور نظرة وقالا : انھا صارت سکة مثل سکة الدنانیر والدراھم۔"

"میں نے کہا: آپ یہ بتائیں کہ میں اگر دَراہم کے بدلے فلوس خریدوں اور پھر ہم قبضہ کئے بغیر الگ ہوجائیں، فرمایا: یہ اِمام مالک کے قول میں دُرست نہیں، اور یہ فاسد ہے، مجھے اِمام مالکؒ نے فرمایا: فلوس اگر سونے یا چاندی کے مقابلے میں اُدھار ہوں، تو اس

(۱) احکام الاوراق النقدیة والتجاریة للجعید عن شرح التلقین للمازری فی الفقه المالکی وشرح التھذیب فی الفقه المالکی المخطوطین بمرکز البحث العلمی بجامعة ام القری، (ص ۲۱)

معاملے میں کوئی خیر نہیں، اور اگر لوگ کھالوں میں میں تعامل شروع کریں، یہاں تک کہ یہ سکہ اور ذات بن جائیں، تو میں ان کھالوں کا تبادلہ سونے چاندی کے ساتھ اُدھار مکروہ قرار دُوں گا۔ میں نے کہا: آپ یہ بتائیں کہ میں اگر فلوس کے بدلے چاندی یا سونے کی انگوٹھی خریدوں، اور پھر قبضہ کئے بغیر الگ ہوجائیں، تو یہ اِمام مالکؒ کے نزدیک جائز ہے؟ فرمایا: یہ اِمام مالکؒ کے نزدیک جائز نہیں، کیونکہ اِمام مالکؒ نے فرمایا: فلس کا فلسین کے مقابلے میں معاملہ جائز نہیں ......لیث بن سعد یحییٰ بن سعید اور ربیعہ سے روایت کرتے ہیں کہ یہ دونوں فلوس کا فلوس کے مقابلے میں ایسے معاملے کو مکروہ فرماتے ہیں جس میں زیادتی یا اُدھار ہو، اور یہ فرمایا: کیونکہ یہ دَنانیر اور دَراہم کی طرح سکہ ہوگیا۔‘‘(۱)

”وقال مالك : اكره ذلك في الفلوس ولا اراه حراما كتحريم الدنانير والدراهم، قلت: ارأيت ان اشتريت فلسا بفلسين ايجوز هذا عند مالك ؟ قال: لا يجوز فلس بفلسين۔

’’اور اِمام مالکؒ نے فرمایا: میں اس کو فلوس میں مکروہ سمجھتا ہوں، اور میں اس معاملے کو دَنانیر اور دَراہم کی حرمت کی طرح حرام نہیں سمجھتا ہوں، میں نے کہا: آپ یہ بتائیں کہ اِمام مالکؒ کے نزدیک ایک فلس کی بیع دو فلسوں کے ساتھ جائز ہے؟ فرمایا: ایک فلس کی بیع دو

(۱) المدونة الكبرى، الاصبحي (الامام مالك بن انس الاصبحي المتوفى ۱۷۹، بيروت، دارالكتب العلمية، طبع اول ۱۴۱۵ هـ (۳/۵، ۲)

فلسوں کے ساتھ جائز نہیں۔"[1]

علامہ ابنِ تیمیہؒ کا موقف

علامہ ابنِ تیمیہؒ بھی فریقِ اوّل میں داخل ہیں، جو فلوس کو اثمان کہتا ہے، چنانچہ اپنے فتاویٰ میں فرماتے ہیں:-

"الاظهر المنع من ذلك فان الفلوس النافقة يغلب عليها حكم الا ثمان وتجعل معيار ا لاموال الناس۔"

"ظاہر منع ہی ہے کیونکہ فلوس نافقہ پر اثمان کا حکم غالب ہے، اور فلوس کو لوگوں کے اَموال کا معیار قرار دِیا جاتا ہے۔"[2]

ایک اور جگہ تحریر فرماتے ہیں:-

"فاذا صارت الفلوس اثمانا صارفيها هذا المعنى، فلايباع ثمن بثمن الى اجل۔"

"سو جب فلوس اثمان ہوگئے، تو ان میں یہ معنیٰ آگئے، لہٰذا اب ثمن کو ثمن کے مقابلے میں اُدھار نہیں بیچا جائے گا۔"[3]

ان دونوں عبارتوں سے یہ بات صاف طور پر معلوم ہوتی ہے کہ فلوس علامہ ابنِ تیمیہؒ کے نزدیک اثمان ہی ہیں۔

علامہ ابن القیمؒ

علامہ ابن القیمؒ بھی ان علماء میں سے ہیں، جو فلوس کو ثمن قرار دیتے ہیں، چنانچہ اس سلسلے میں وہ فرماتے ہیں:-

---

(۱) مرجع سابق (ص ۱۵۸)

(۲) مجموعة الفتاوى لابن تيميةؒ (۲۹/۴۷۱)

(۳) حوالہ بالا

"والثمن هو المعيار الذى به يعرف تقويم الاموال فيجب ان يكون محددا مضبوطا، لا يرتفع ولا ينخفض الخ"

''ثمن وہ معیار ہے جس سے اموال کی قیمتیں معلوم کی جاتی ہوں، لہٰذا ضروری ہے کہ ثمن کی کوئی تحدید ہو، اور وہ منضبط ہو، یعنی اس میں اُتار چڑھاؤ نہ ہو۔''[1]

"كما رأيت من فساد معاملاتهم والضرر اللاحق بهم حين اتخذت الفلوس سلعة تعد للربح فعم الضرر وحصل الظلم ولو جعلت ثمنا واحدا لا يزداد ولا ينقص بل تقوم به الاشياء ولا تقوم هي بغيرها لصلح امر الناس۔"

''جیسا کہ میں نے لوگوں کے معاملات کا فساد اور ان کو جو نقصان لاحق ہوا وہ دیکھا، جبکہ لوگوں نے فلوس کو سامان بنایا اور ان کو نفع کا ذریعہ بنایا، تو اس طریقے سے نقصان عام ہو گیا، اور ظلم سامنے آ گیا، اور اگر فلوس کو ثمن قرار دِیا جاتا اور اس میں اُتار چڑھاؤ نہ ہوتا، بلکہ ان اشیاء کی قیمتوں کا اندازہ کیا جاتا، اور یہ خود کسی شئ سے اندازہ نہ کیا جاتا، تو لوگوں کے معاملات دُرست ہوتے۔''[2]

اس عبارت سے یہ بات واضح ہے کہ علامہ ابن القیمؒ فلوس کو اثمان قرار دے رہے ہیں، اور ساتھ یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ فلوس کو اثمان قرار نہ دینے سے لوگوں کو نقصان اور ضرر لاحق ہو گیا، اور ظلم عام ہو گیا، اور دُوسری بات علامہ ابن القیمؒ کی عبارت سے معلوم ہوتی ہے کہ انہوں نے فلوس کو زَر سمجھا، سامان نہیں، جیسا کہ شروع میں اس کی تفصیل گزر چکی ہے۔

---

(۱) اعلام الموقعين (۱۳۹/۲)۔

(۲) حوالہ بالا۔

امام ابوحنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کا موقف

فریقِ ثانی: امام ابوحنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کا موقف یہ ہے کہ فلوس کو ثمنیت لازم نہیں، اور فلوس متعین کرنے سے متعین ہوجاتے ہیں، لہٰذا جو احکام امام محمدؒ کے موقف پر متفرّع ہوتے تھے، وہ احکام ان حضراتؒ کے موقف کے مطابق برعکس ہوجائیں گے، تفصیل اور حوالہ جات فریقِ اوّل کے بیان کے ضمن میں گزر گئے، اعادے کی ضرورت نہیں۔

امام شافعیؒ کا موقف

شافعیہ کے ہاں بھی فلوس اثمان نہیں، چنانچہ علامہ کوھجیؒ علتِ ربا کے ضمن میں فرماتے ہیں:-

"وعلة الربا فی الذهب والفضة الثمنیة وهی منتفیة عن العروض والفلوس۔"

"ربا کی علت سونے اور چاندی میں ثمنیت ہے، اور یہ عروض اور فلوس میں نہیں پائی جاتی۔"(۱)

اور علامہ نوویؒ فرماتے ہیں:-

"اذا راجت الفلوس رواج النقود لم یحرم الربا فیها، هذا هو الصحیح المنصوص وبه قطع المصنف والجمهور۔"

"جب فلوس میں ایسا تعامل جاری ہوجائے، جیسا کہ زر میں ہے، تو بھی ان میں ربا حرام نہیں ہوگا، یہی درست ہے، اسی کو مصنف نے جزم کے ساتھ بیان کیا، اور جمہور کا یہی موقف ہے۔"(۲)

---

(۱) زاد المحتاج شرح المنهاج، الکوهجی (الشیخ عبدالله بن الشیخ حسن الحسن الکوهجی) قطر، طبع اول ۱۴۰۲ھ (۲/۲۴)

(۲) المجموع شرح المهذب، النووی (الامام ابو زکریا محی الدین بن شرف النووی، بیروت، دارالفکر۔

اہم تنبیہ

عربی مصنّفین نے اگرچہ یہ بات واضح انداز میں لکھی ہے کہ شافعیہ کے ہاں فلوس اثمان نہیں، اور علامہ کوھجیؒ شافعی کی مذکورہ عبارت سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے، لیکن حضراتِ شافعیہؒ کی فقہی عبارات پر جب غور کیا جاتا ہے، تو ان عبارات سے فلوس میں مطلقاً ثمنیت کی نفی نہیں ہوتی، بلکہ ''ثمنیتِ جوہریہ'' یا ''ثمنیتِ غالبہ'' کی نفی ہوتی ہے، کہ فلوس ثمنِ جوہری یا خلقی نہیں، اور ان کے ہاں چونکہ نقود میں علتِ حرمتِ رِبا ''ثمنیتِ جوہریہ'' ہے، اور فلوس میں یہ علت نہیں پائی جاتی، اس لئے انہوں نے فلس بفلسین کی بیع کو جائز قرار دیا، تو جواز کی وجہ یہ نہیں کہ فلوس ثمن نہیں، بلکہ جواز کی وجہ یہ ہے کہ ثمنیتِ جوہریہ جو علت ہے، وہ فلوس میں نہیں پائی جاتی۔

حضراتِ شافعیہ کی فقہی عبارات سے ثمنیتِ جوہریہ کی نفی ہوتی ہے، یعنی مقید کی نفی ہے، اور مشہور قاعدہ ہے کہ جب مقید پر نفی داخل ہو، تو اس سے قید کی نفی ہوگی، نہ کہ ذاتِ مقید کی نفی، مثلاً جب یہ کہا جائے کہ میں نے زید کو بندھا ہوا نہیں مارا، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ مارا تو ہے، لیکن اس وقت وہ بندھا ہوا نہیں تھا، تو اس سے نفی باندھنے کی ہوئی، نہ کہ مارنے کی، اسی طرح مذکورہ مسئلے میں نفی ثمنیتِ جوہریہ کی ہے، نہ کہ ثمنیت کی، اس لئے راقم الحروف کا خیال یہ ہے کہ فلوسِ نافقہ ان کے ہاں بھی اثمان ہیں، لیکن اثمانِ جوہریہ نہ ہونے کی وجہ سے علتِ رِبا نہیں اس لئے فلس بفلسین کی بیع جائز ہے، چنانچہ چند عبارات ملاحظہ ہوں:۔

> "وقال الجمهور : العلة فيهما صلاحية الثمنية الغالبة، وان شئت قلت : جوهرية الاثمان غالبا۔۔۔وفی تعدی الحکم الی الفلوس اذا راجت وجه، والصحیح انه لا ربا فیها لا نتفاء الثمنیة الغالبة۔"

"اور جمہور نے کہا کہ سونے اور چاندی میں علت ان میں ثمنیتِ غالبہ کی صلاحیت کا ہونا ہے، اور اگر آپ چاہے تو کہے کہ جوہریت اثمان ....اور حکم (ربا) کو فلوس رائجہ کی طرف متعدی کرنے میں ایک روایت ہے، لیکن صحیح یہ ہے کہ ان میں ربا نہیں ہے، کیونکہ ان میں ثمنیتِ غالبہ نہیں ہے۔"(۱)

حواشی شروانی میں ہے:-

"وعلة الربا فيه جوهرية الثمن فلاربا في الفلوس وان راجت الخ"

"اور ربا کی علت اس میں ثمن کی جوہریت ہے، لہٰذا فلوس میں ربا نہیں ہے، اگرچہ رائج ہوں۔"(۲)

حنابلہ کا موقف

فقہائے حنابلہ سے اس سلسلے میں دو روایتیں ہیں: ایک روایت میں فلوس ثمن نہیں، اور دُوسری روایت کے مطابق فلوس ثمن ہیں، اور یہی روایت ان کے نزدیک راجح اور قوی ہے، چنانچہ راجح قول کے مطابق ان کے ہاں فلس بفلسین کی بیع ناجائز ہے۔(۳)

---

(۱) روضة الطالبين، النووی (علامه محی الدين بن شرف النووی) بيروت، المكتب الاسلامی، طبع دوم ۱۴۰۵ھ

(۲) حواشی الشروانی بن قاسم العبادی (۲۷۹/۴)

(۳) وقال: لايباع الفلس بالفلسين ولا السكين بالسكينين ولا ابرة بابرتين، اصله الوزن (المغنی مع الشرح الكبير ۱۲۸/۴)

______ وجزم ابو الخطاب فی خلافه الصغير: بانها (الفلوس-عصمت) مع نفاقها لا تباع بمثلها الا مماثلة معللا بانها اثمان-(الانصاف، المرداوی، علاء الدين ابوالحسن علی بن سليمان المرداوی الحنبلی) قاهره، مطبعة السنة المحمدية، طبع اول ۱۳۷۶ھ (۱۵/۵)

______ فان احمد قال: لا اری السلم فی الفلوس لانه يشبه الصرف وهذا قول محمد بن الحسن وابی ثور لانها ثمن فجازت الشركة بها كالدراهم والدنانير-(المغنی والشرح الكبير ۱۲۵/۵)

خلاصہ یہ جمہور فقہاء و مجتہدین کے نزدیک فلوس اثمان ہیں، اور فلوس کا فلوس کے ساتھ خرید و فروخت کمی بیشی کے ساتھ ناجائز اور حرام ہے۔

اس بارے میں قولِ راجح

فلوس کے ثمن ہونے یا نہ ہونے میں قولِ راجح یہی ہے کہ:-

۱-فلوس اثمان ہیں۔

۲-تعیین سے متعین نہیں ہوتے۔

۳-کمی بیشی کے ساتھ ان کی بیع حرام ہے۔

۴-ان میں شرکت دُرست ہے۔

۵-ان میں مضاربت صحیح ہے۔

۶-فلوس میں سلم دُرست نہیں۔

وجہ ترجیح

اس قول کی ترجیح کی وجہ یہ ہے کہ فلوسِ نافقہ میں سونے اور چاندی کی طرح تعامل جاری ہے، اور سونے چاندی کے جو وظائف ہیں، وہ فلوس بحسن وخوبی انجام دیتے ہیں، نیز زَر کی تعریف بتمامہ فلوس پر صادق آتی ہے، لہٰذا فلوس کو اثمان کہنا بجا ہے، اور ان کے ساتھ وہی معاملہ کرنا چاہئے جو نقود کے ساتھ ہوتا ہے۔

اور یہی وجہ ہے کہ جمہور اُمت فلوس میں ثمنیت کے قائل ہے، جن میں:-

اِمام محمدؒ، اِمام مالکؒ، اِمام احمدؒ، شمس الائمہ السرخسیؒ، شمس الائمہ الحلوانیؒ، محمد بن الفضلؒ، علامہ ابنِ تیمیہؒ، علامہ ابنِ قیمؒ اور اس زمانے کے تقریباً بیشتر علماء و فقہاء شامل ہیں۔



بابِ چہارم

بیعِ صَرف

بیعِ صَرف اور اس کی حقیقت

بیعِ صَرف لغۃً

''صَر ف'' کے لغوی کئی معانی ہیں:-

۱- نقل:-ایک جگہ سے دُوسری جگہ منتقل کرنا۔

۲- پھیرنا:-فلاں نے اس سے اپنا چہرہ پھیرا۔

۳- تخلیہ:-کسی کو چھوڑنا، مثلاً میں نے مزدور کو چھوڑ دیا۔

۴- اِنفاق:-خرچ کرنا، میں نے پیسے صَرف کئے، یعنی خرچ کئے۔

۵- بیع:-زیادت اور اِضافہ۔

۶- توبہ۔

۷- زینت اور خوبصورتی۔

۸- شور مچانا اور آواز نکالنا۔

لغت کے اعتبار سے ان سب معانی کے لئے لفظ ''صَر ف'' استعمال ہوتا ہے، اور اِسم فاعل اس سے ''صیر فی''، ''صیر وف''، اور ''صرّاف'' ہے۔

''عقدِ صَر ف'' کو صَرف اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں مقصود ہی اِضافہ ہوتا ہے، کیونکہ اس میں زَر کا مقابلہ زَر کے ساتھ ہوتا ہے، اور زَر اجناس کی طرح بذاتِ خود تو قابلِ

انتفاع ہے نہیں، جیسا کہ شروع میں اس کی تفصیل گزر چکی، بلکہ اس صورت میں اس سے مقصود تجارت اور ربح (نفع) ہے، جو زر کی ذات پر ایک اضافہ ہے، اور بعض حضرات نے اس کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی ہے کہ چونکہ جب سونے یا چاندی کو بوقتِ بیع ترازو میں رکھی جاتی ہے، تو اس سے ایک قسم کی آواز نکلتی ہے، اس لئے اس کو بیعِ صَرف کہا گیا۔ واللہ اعلم۔[1]

بیعِ صَرف اِصطلاحاً

حضراتِ حنفیہ، شافعیہ اور مالکیہ کے نزدیک ''بیعِ صَرف'' کی تعریف درج ذیل ہے:-

---

(۱) الدرالمختار وردالمحتار: هو(الصرف) لغةً الزيادة، وفي ردالمحتار: (هولغة الزيادة) "هذا احد معانيه ففي المصباح : صرفته عن وجهه صرفا من باب ضرب، وصرفت الاجير والصبي، خليت سبيله، وصرفت المال: انفقته، وصرفت الذهب بالدراهم بعته، واسم الفاعل من هذا صيرفي وصيروف، وصراف للمبالغة، قال ابن الفارس: الصرف فضل الدرهم في الجودة على الدرهم وصرفت الكلام : زينته (۷/۴۰۲)

ـــــــ فتح القدير :

" (الزيادة) وهذا العقد لايقصد به الا الزيادة دون الانتفاع بعين البدل الآخر في الغالب لانه لا ينتفع بعينه بخلاف نحو الطعام والثوب والحمار، والمراد ان قصد كل من المتعاقدين التجارة والربح فيه بالنقل والا خلا العقد عن الفائدة، والزيادة تسمى صرفا وبه سميت العبادة النافلة صرفا في قوله ﷺ: من انتمى الى غير ابيه لا يقبل الله منه صرفا ولا عدلا الخ "(۶/۲۵۹)

ـــــــ كذا في البحر الرائق (۶/۳۲۱)

ـــــــ ومجمع الانهر في شرح ملتقى الابحر،

الشيخي زاده، (العلامة عبدالرحمن بن محمد بن سلمان المتوفى ۱۰۷۸هـ) بيروت، دارالكتب العلمية، طبع اول ۱۴۱۹هـ (۳/۱۶۱)

ـــــــ كشاف القناع

، البهوتي، (العلامة منصور بن يونس المتوفى ۱۰۵۱ ه)، السعوديه العربيه، مطبعة الحكومة بمكة ۱۳۹۴ هـ۔

"سميت بذلك لصريفهماوهو تصويتهما في الميزان" (۳/۲۵۳)

''ثمن (یا زَر) کے مقابلے میں ثمن (یا زر) کی خرید و فروخت، خواہ دونوں کی جنس ایک ہو، یا مختلف ہو۔''

لیکن بابِ صَرف میں دونوں جانبوں میں ''ثمن'' سے مراد ثمنِ خلقی ہے، یعنی سونا اور چاندی، خواہ سونا یا چاندی کسی بھی شکل میں ہو، مثلاً دِرہم یا دِینار ہو، سونے یا چاندی کا برتن ہو، یا زیور ہو، یا ڈلی ہو۔

لہٰذا اگر کسی ایک جانب یا دونوں جانبوں میں عوضین ثمن عرفی ہو، مثلاً کرنسی نوٹ یا فلوس، تو اس کو بیع صَرف نہیں کہا جائے گا، اور اس پر بیعِ صَرف کے اَحکام جاری نہیں ہوں گے۔ تفصیل اگلے باب میں ملاحظہ فرمائیں۔

علامہ حصکفیؒ فرماتے ہیں:-

"وشرعاً بیع الثمن بالثمن ای ماخلق للثمنیة، ومنه المصوغ جنسابجنس اوبغیر جنس۔"

''اور شریعت میں بیعِ صَرف عبارت ہے ثمن کی ثمن کے ساتھ خرید وفروخت سے، یعنی جو خلقی طور پر ثمن ہو، اور اسی سے بنا ہوا برتن بھی ہے، خواہ جنس کا مقابلہ جنس کے ساتھ ہو، یا خلافِ جنس کے ساتھ ہو۔''(1)

علامہ مرغینانیؒ فرماتے ہیں:-

"سواء کانا یتعینان کالمصوغ اولا یتعینان کالمضروب، او یتعین احدهماولا یتعین الاخر، لا طلاق ماروینا، ولانه ان کان یتعین ففیه شبهة التعیین لکونه ثمنا خلقةً فیشترط قبضه اعتبارا للشبهة فی الربا۔"

(۱) الدرالمختارللحصکفی شرح تنویر الابصار للتمرتاشی ومتن رد المحتار لابن عابدین المعروف بالشامی (۴۰۲/۷)

"چاہے عوضین متعین کرنے سے متعین ہوتے ہوں، مثلاً دونوں طرف برتن ہوں، یا متعین نہ ہوتے ہوں، مثلاً دونوں طرف سکہ ہوں، یا ایک عوض متعین ہوتا ہو، اور دُوسرا نہ ہوتا ہو، (یہ سب صورتیں بیعِ صَرف میں داخل ہیں)، ایک تو حدیث مطلق ہے، اور دُوسری بات یہ کہ یہ چونکہ خلقی ثمن ہے، تو اس میں تعیین کے باوجود شبہ پایا جاتا ہے، اس لئے شبہ رِبا کی وجہ سے اس میں تقابض کو ضروری قرار دِیا۔"[1]

جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر ایک طرف سونے یا چاندی کا برتن یا زیور ہو، اور دُوسری طرف بھی سونے یا چاندی کا برتن یا زیور ہو، یا دونوں طرف دَراہم یا دَنانیر ہوں، یا ایک طرف دِرہم یا دِینار ہو، اور دُوسری طرف سونے یا چاندی کا برتن یا زیور ہو، تو یہ تمام صورتیں بیعِ صَرف کی ہیں، کیونکہ یہ تمام ثمنِ خلقی ہیں، لہٰذا ان تمام صورتوں میں تقابض ضروری ہوگا۔

علامہ نسفیؒ فرماتے ہیں:-

"وغالب الغش لیس فی حکم الدراهم والدنانیر فیصح بیعها بجنسها متفاضلا والتبایع والاستقراض بما یروج عددا او وزنا او بهماولا یتعین بالتعیین لکونها اثمانا۔"

"کھوٹ اگر غالب ہو، تو اس صورت میں یہ دَراہم یا دَنانیر کے حکم نہیں ہوں گے، لہٰذا ان کی ہم جنس کی بیع زیادتی کے ساتھ جائز ہوگی، اور رِواج کے مطابق ان کی خرید وفروخت اور قرض کا معاملہ وزن یا عدد کے اعتبار سے دُرست ہوگا، البتہ یہ متعین کرنے سے

---

(۱) الهدایة مع الفتح، المرغینانی (شیخ الاسلام برهان الدین ابو الحسن ابوبکر المرغینانی المتوفی ۵۹۳ھ) کوئٹه، پاکستان، مکتبه رشیدیه (۲۶۱/۶)

متعین نہیں ہوں گے، کیونکہ یہ اثمان ہیں۔"(۱)

اس پر علامہ ابنِ نجیمؒ فرماتے ہیں:۔

"قوله : "ولا يتعين بالتعيين لكونها اثمانا" يعني مادامت تروج لانها بالاصطلاح صارت اثمانا، فمادام ذلك الاصطلاح موجودا، لا تبطل الثمنية لقيام المقتضى۔"

"صاحبِ ہدایہ کی یہ بات کہ" یہ متعین کرنے سے متعین نہیں ہوتے، کیونکہ یہ اثمان ہیں" یعنی جب تک مروّج ہوں، کیونکہ یہ لوگوں کی اِصطلاح سے اثمان بنے ہیں، سو جب تک یہ اِصطلاح باقی رہے گی، اس کی ثمنیت بھی باقی رہے گی، اس لئے کہ مقتضی موجود ہے۔"(۲)

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر سونے یا چاندی میں کھوٹ غالب ہو، اور سونا یا چاندی کم ہو، اور وہ مروّج بھی ہو، تو ان کی بیع کمی بیشی کے ساتھ جائز ہے، اگرچہ عوضین ہم جنس کیوں نہ ہوں، لیکن اس کے باوجود یہ متعین کرنے سے متعین نہیں ہوں گے، کیونکہ یہ اثمان ہیں لیکن اثمانِ عرفیہ ہیں۔

اس سے یہ بات صاف طور پر معلوم ہوئی کہ اس میں ثُمن کا مقابلہ ثمن کے ساتھ ہے، لیکن چونکہ یہ ثمن خلقی نہیں، اس لئے اس کو بیعِ صَرف سے نکالا اور اس میں وحدتِ جنس کے باوجود تفاضل (زیادتی) کو جائز قرار دیا۔

فقہائے حنفیہ کی ان عبارات سے یہ بات صاف طور پر سامنے آتی ہے کہ بیعِ

---

(۱) كنز الدقائق مع البحر، النسفي (الامام ابو البركات عبد الله بن احمد بن محمود المعروف بحافظ الدين النسفي المتوفى ۷۱۰ هـ) بيروت، دارالكتب العلمية، طبع اول ۱۴۱۸ھ (۳۳۵/۶)۔

(۲) مرجع سابق

صَرف کے لئے صرف ثمن کا ہونا کافی نہیں، بلکہ ضروری ہے کہ وہ ثمنِ خلقی ہو، البتہ ثمنِ خلقی کسی بھی شکل میں ہوسکتا ہے۔

البتہ عدمِ تعیین کے لئے کسی شئ کا صرف ثمن ہونا کافی ہے۔

حنابلہ کی مشہور کتاب ''کشاف القناع'' میں ہے:-

"فصل في المصارفة، وهي بيع نقد بنقد، اتحد الجنس او اختلف۔"

''مصارفہ زَر کے مقابلے میں زَر کی خرید وفروخت کو کہتے ہیں، خواہ جنس ایک ہو یا مختلف ہو۔''[1]

یہ حضرات چونکہ تفصیل میں نقدین تثنیہ ذِکر کرتے ہیں، اسی طرح دِرہم ودِینار یا سونا چاندی ذِکر کرتے ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ہاں بھی بیعِ صَرف میں ''نقد'' سے مراد ثمنِ خلقی ہے۔

فقہِ شافعی کی مشہور کتاب ''مغنی المحتاج'' میں ہے:-

"(النقد بالنقد) والمراد به الذهب والفضة مضروبا كان او غير مضروب۔"

''(بیعِ صَرف نقد کے مقابلے میں نقد کی خرید وفروخت کو کہتے ہیں) اور اس سے مراد سونا چاندی ہے، خواہ سکہ کی شکل میں ہو، یا نہ ہو۔''[2]

اور اسی کتاب میں ہے:-

"تنبيه :بيع النقد بالنقد من جنسه وغيره يسمى صرفا۔"

''نقد کے مقابلے میں نقد کی بیع کو صَرف کہتے ہیں، خواہ جنس ایک ہو،

---

(۱) (۳/۲۵۳)

(۲) مغني المحتاج، الشربيني (الشيخ محمد الشربيني الخطيب) بيروت، داراحياء التراث العربي (۲/۲۴)

یا جنس مختلف ہو۔"(۱)

علامہ ابنِ تیمیہؒ فرماتے ہیں:-

"والثانية لا يشترط الحلول والتقابض، فان ذلك معتبر في جنس الذهب والفضة سواء كان ثمنا او كان صرفا او كان مكسورا بخلاف الفلوس ولان الفلوس هي في الاصل من باب لا عراض والثمنيه عارضة لها"

"اور دُوسری روایت یہ ہے کہ حلول (Cash Payment) اور تقابض ضروری نہیں، کیونکہ یہ چیزیں جنسِ سونا اور چاندی میں معتبر ہیں، خواہ وہ کسی قسم اور کسی شکل میں ہو، بخلاف فلوس کے (کہ وہ جنس سونا اور چاندی میں سے ہیں نہیں) اور اس لئے بھی کہ فلوس حقیقت میں سامان کے قبیل میں ہیں اور ثمنیت تو ان کو عارضی طور پر لاحق ہوگئی ہے۔"(۲)

یہ اِمام احمدؒ کی دُوسری روایت ہے، اس کا حاصل بھی وہی ہے کہ "صَرف" کے لئے ثمنِ خلقی کا ہونا ضروری ہے۔

علامہ زحیلی فرماتے ہیں:-

"وشرعاً هو بيع النقد بالنقد جنسا بجنس او بغير جنس: اى بيع الذهب بالذهب او الفضة بالفضة او الذهب بالفضة مصوغا او نقداً۔"

"اور شریعت صرف نقد کے مقابلے میں نقد کی خرید وفروخت کو کہتے ہیں، خواہ جنس کا جنس کے ساتھ مقابلہ ہو، یا غیر جنس کے ساتھ ہو، یعنی

---

(۱) حوالہ بالا

(۲) (مجموعة الفتاوى ۲۹/۴۵۹)

سونا بمقابلہ سونا کے، یا چاندی بمقابلہ چاندی کے یا سونا بمقابلہ چاندی کے، خواہ سکہ کی شکل میں ہو، یا کسی برتن وغیرہ کی شکل میں ہو۔"(۱)

کتاب "تطور النقود" میں ہے:-

"عرف الحنفية الصرف بانه بيع الا ثمان بعضها ببعض وارادوا من الا ثمان ما كان ثمنا خلقة اى من القدم وهو الذهب والفضة سواء كانا مسكوكين دنانير ودراهم وهى المعروفة بالنقدين او كانا مصوغين كالاقراط والاساور او كانا تبرا وعبر الشافعية والحنابلة عن الثمن بالنقد فقالوا: الصرف بيع النقد بالنقد من جنسه او غيره، ارادوا بالنقد كذلك الذهب والفضة مسكوكين او مصوغين او تبرا والحكم فى المذاهب الثلاثة هو ان الذهب والفضة اذا بيعا بجنسها كذهب بذهب او فضة بفضة وجب الحلول والتماثل وا لتقابض (الى قوله:) والتعريف السابق للصرف عند الائمة الثلاثة يفيد انه محصور فى الذهب والفضة اللذين لا يغلب عليهما الغش، فاذا كانت الدراهم مغشوشة ورائجة او كان النقد من الجانبين فلوسا رائجة لايجرى فيهما حكم الصرف الخ

"حضراتِ حنفیہؒ نے بیعِ صَرف کی تعریف یہ کی ہے کہ ثمن کو ثمن کے مقابلے میں فروخت کیا جائے۔ اوران کے نزدیک اثمان سے مراد وہ ہیں جو خلقۃً ثمن ہوں، یعنی زمانۂ قدیم سے، اوروہ سونا اور چاندی

(۱) الفقه الاسلامى وادلته للعلامة الزحيلى (۶۳۶/۴)

ہیں، خواہ سکہ کی شکل میں ہوں دَنانیر اور دَراہم، جو ''نقدین'' کے ساتھ مشہور ہیں، اور یا زیور کی شکل میں ہوں، جیسا کہ بالیاں اور چوڑیاں ہیں، اور یا ڈلی کی شکل میں ہوں، اور شافعیہ اور حنابلہ نے ثمن سے ''نقد'' کے ساتھ تعبیر کی ہے، سوانہوں نے کہا کہ ''صَرف'' ''نقد'' کے مقابلے میں نقد کی بیع کو کہتے ہیں، عوضین خواہ ہم جنس ہوں یا نہ ہوں، اور ان کے نزدیک بھی ''نقد'' سے مراد سونا چاندی ہی ہے، خواہ کسی بھی شکل میں ہوں، اور تینوں مذاہب کا حکم ایک ہے، اور یہ کہ سونا اور چاندی کی خرید و فروخت جب جنس کے ساتھ ہو، مثلاً سونے کو سونے کے ساتھ یا چاندی کو چاندی کے کے ساتھ تو اس صورت میں حلول (اُدھار نہ ہونا) تماثل (برابر ہونا) اور تقابض ضروری ہیں........ائمہ ثلاثہؒ کی صَرف کی مذکورہ تعریف سے معلوم ہوتا ہے کہ صَرف اس سونے اور چاندی میں منحصر ہے، جس میں کھوٹ غالب نہ ہو، لہٰذا اگر سونا یا چاندی جس میں کھوٹ غالب ہو، یا جانبین سے نقد فلوس رائجہ ہوں، تو اس عقد کو عقدِ صَرف نہیں کہا جائے گا۔''[1]

حاصل یہ کہ ائمہ ثلاثہؒ کے ہاں عقدِ صَرف کے لئے ثمن کا خلقی ہونا ضروری ہے، نیز یہ بھی ضروری ہے کہ کھوٹ کی صورت میں سونا چاندی غالب ہوں، نیز ان حضرات کے نزدیک اس عقد کو ''صَرف'' یا ''مصارفہ'' یا ''تصارف'' کہتے ہیں، کوئی اور اِصطلاح ان کے ہاں استعمال نہیں ہوتی، خواہ صَرف کی کوئی بھی شکل ہو۔

البتہ مالکیہؒ کے ہاں اس سلسلے میں تین اِصطلاحات رائج ہیں:-

مراطلہ، مبادلہ، صَرف

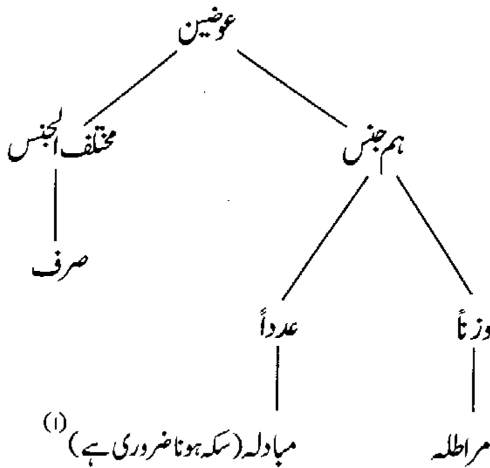
---

(۱) تطور النقود (ص ۱۴۱، ۱۵۴۳)

مراطلہ :- سونے کو سونے کے ساتھ یا چاندی کو چاندی کے ساتھ تول کر بیچنے کو مراطلہ کہتے ہیں، خواہ وہ کسی بھی شکل میں ہو، لہٰذا مراطلہ میں یہ ضروری ہے کہ جنس کا جنس کے ساتھ مقابلہ ہو۔

مبادلہ :- سکہ کو سکہ کے ساتھ عدداً فروخت کرنے کو "مبادلہ" کہتے ہیں، مثلاً دِینار بمقابلہ دِینار کے یا دِرہم دِرہم کے مقابلے میں، نیز اس میں یہ ضروری ہے کہ عوضین ہم جنس ہوں۔

صَرف :- سونے کو چاندی یا چاندی کو سونے کے ساتھ خرید و فروخت کو "صَرف" کہتے ہیں، سونا چاندی خواہ کسی بھی شکل میں ہوں، اور معاملہ خواہ وزناً ہو یا عدداً ہو۔



---

(۱) عقد الجواهر الثمنية، ابن شاس (جلال الدين عبد الله بن نجم ابن شاس المتوفى ۶۱۶ھ) دارالغرب الاسلامي، طبع اول ۱۴۱۵ھ
اس میں مصنفؒ نے صَرف، مراطلہ اور مبادلہ کے اَحکام بڑی تفصیل کے ساتھ بیان فرمائے ہیں۔ (۲/۳۵۱ تا ۳۹۶)۔

ـــــــــ الشرح الصغير على اقرب المسالك الى مذهب الامام مالك، الدردير (العلامة ابو البركات احمد بن محمد بن احمد الدردير) مصر، دار المعارف (۳/۴۸ تا ۸۵)

(باقی اگلے صفحے پر)

''بیع صَرف'' اور اس کی شرطیں

بیع صَرف کے شرعاً معتبر ہونے کی چار شرطیں ہیں، جن میں سے دو وجودی ہیں، یعنی ان کا پایا جانا ضروری ہے، اور دو عدمی ہیں، یعنی ان کا نہ پایا جانا ضروری ہے، اور وہ چار شرائط اِجمالاً درج ذیل ہیں:۔

۱۔تقابض ۲۔تماثل یا مماثلت	وجودی
۳۔خیارِ شرط ۴۔اجل (تاجیل)	عدمی

حقیقت میں شرطیں دو ہی ہیں، یعنی تقابض اور تماثل، کیونکہ آخری دو شرطیں تقابض ہی پر متفرّع ہیں، جیسا کہ تفصیل سے واضح ہو جائے گا۔

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

ـــــــــــــ کتاب الکافی فی فقه اهل المدینة المالکی، القرطبی (ابو عمر یوسف بن عبد الله بن محمد بن عبد البر النمر القرطبی) السعودیة، الریاض، مکتبة الریاض الحدیثیة، طبع دوم ۱۴۰۰ ھج (۲/۶۳۳)

ـــــــــــــ تطور النقود فی ضوء الشریعة الاسلامیة:

"اما المالکیة فلهم اصطلاح آخر فی بیع الاثمان، ذلک انهم یقسمونها الی ثلثة اقسام: المراطلة والمبادلة، والصرف، اما لمراطلة: فهی بیع الذهب با لذهب او الفضة با لفضة وزنا، سواء اکانا مسکوکین او مصوغین او تبرا۔ واما المبادلة: فهی بیع النقد المسکوک من الذهب او الفضة بجنسه عددا۔

ـــــــــــــ واما الصرف فهو بیع الذهب بالفضة او الفضة بالذهب او احدهمابالفلوس۔"(ص ۱۴۳)

اس عبارت کا خلاصہ وہی ہے جو تفصیل کے ساتھ متن میں ذکر ہوا ہے، لیکن یاد رکھیں کہ یہ صرف اِصطلاح کا فرق ہے، اَحکام میں مالکیہ کا مذہب حضراتِ اَئمہ ثلاثہؒ سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے، صرف مراطلہ میں یہ حضرات معمولی کمی بیشی کی گنجائش دیتے ہیں، باقی تقابض وغیرہ کے اَحکام میں یہ اَئمہ ثلاثہؒ کی طرح ہے۔

بلکہ اگر غور کیا جائے، تو بیعِ صَرف معتبر ہونے کے لئے ایک ہی شرط ہے، اور وہ تماثل ہے، کیونکہ مماثلت یا تماثل کے معنی یہاں برابری کے ہیں، اور جب ایک جانب قبضہ پایا جائے، اور دُوسری جانب قبضہ نہ پایا جائے، تو ظاہر ہے کہ ایک جانب جو جانبِ قبضہ ہے اس کو فضیلت حاصل ہوگئی، تو مماثلت نہ رہی، جیسا کہ علامہ مرغینانیؒ کی عبارت میں اس کی صراحت ہے:-

"ثم لا بد من قبض الآخر تحقيقا للمساواة فلا يتحقق الربا ولان احدهما ليس باولى من الآخر"

''پھر دُوسری جانب قبضہ ضروری ہے تاکہ برابری ثابت ہو، اور ربا لازم نہ ہو، اور اس لئے بھی کہ ایک جانب دُوسری جانب سے اَولیٰ نہیں۔''(۱)

فائدہ

بیعِ صَرف اور رِبا کا باہم گہرا تعلق ہے، کیونکہ صَرف بیع ہے، اس میں اتحادِ جنس کی صورت میں کسی ایک جانب زیادتی کی صورت میں رِبا الفضل وجود میں آتا ہے، اور اُدھار یا کسی ایک جانب قبضہ نہ ہونے کی صورت میں رِبا النساء لازم آتا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ ائمہ ثلاثہؒ کے ہاں رِبا اور صَرف ایک ساتھ اور ایک ہی باب میں ذِکر کرتے ہیں، بلکہ بعض اوقات ''صَرف'' کا عنوان ان کے ہاں ہوتا ہی نہیں، رِبا کا عنوان ہوتا ہے، اس میں صَرف کے مسائل ذِکر کرتے ہیں، گو حنفیہ کے ہاں دونوں کے لئے الگ الگ باب قائم کرتے ہیں۔

اب ہم مذکورہ شرائط کو ایک ایک کر کے قدرِ تفصیل کے ساتھ یہاں ذکر کرتے ہیں:-

---

(۱) هداية مع فتح القدير (۲۶۰/۶)-

تقابض (Possession)

''تقابض'' بابِ تفاعل ہے، جس کے معنی باہمی قبضہ کرنے کے ہیں، یعنی متعاقدین (Contractors) میں سے ہر ایک عوض پر مجلسِ عقد میں قبضہ کرے، تو بیعِ صَرف معتبر ہونے کے لئے یہ سب سے اہم اور عمومی شرط ہے، جو بیعِ صَرف کی تمام صورتوں میں بالاتفاق ضروری ہے، یعنی بیعِ صَرف کی کوئی بھی صورت ہو، خواہ عوضین کسی بھی شکل میں ہوں، یعنی سکی کی شکل میں ہوں، برتن یا زیور کی شکل میں ہوں، ڈلی کی شکل میں ہوں، وغیرہ، اور جنس کا جنس کے ساتھ مقابلہ ہو، یا غیر جنس کے ساتھ مقابلہ ہو، ان تمام صورتوں میں بیعِ صَرف معتبر ہونے کے لئے اس شرط کا پایا جانا ضروری ہے۔ [1]

---

(۱) علامہ مرغینانی فرماتے ہیں:-

"سواء كانا يتعينان كالمصوغ اولا يتعينان كالمضروب، او يتعين احدهماولا يتعين الاخر، لاطلاق مارويناً، ولانه ان كان يتعين ففيه شبهة التعيين لكونه ثمنا خلقةً فيشترط قبضه اعتبارا للشبهة في الربا۔"

''چاہے عوضین متعین کرنے سے متعین ہوتے ہوں، مثلاً دونوں طرف برتن ہوں، یا متعین نہ ہوتے ہوں، مثلاً دونوں طرف سکہ ہوں، یا ایک عوض متعین ہوتا ہو، اور دوسرا نہ ہوتا ہو، (یہ سب صورتیں بیع صرف میں داخل ہیں)، ایک تو حدیث مطلق ہے، اور دوسری بات یہ کہ یہ چونکہ خلقی ثمن ہے، تو اُس میں تعیین کے باوجود شبہ پایا جاتا ہے، اس لئے شبہ ربا کی وجہ سے اس میں تقابض کو ضروری قرار دیا۔''

الهداية مع الفتح، المرغيناني (شيخ الاسلام برهان الدين ابو الحسن ابوبكر المرغيناني المتوفى ۵۹۳هـ) كوئٹه، پاکستان، مكتبه رشيديه (۲۶۱/۶)۔

كذا في البحر الرائق (۳۲۱/۶)۔

______ الفقه الاسلامي وادلته للزحيلي:

"والتقابض شرط سواء اتحد الجنس او اختلف(۶۳۷/۴)"۔

______ تطور النقود:

"والحكم في المذاهب الثلاثة (الحنفيه والشافعيه والحنابله(عصمت) هو ان الذهب والفضة اذا بيعا بجنسها كذهب بذهب او فضة بفضة وجب الحلول والتماثل والتقابض، واذا بيع احدهما بالآخر وجب الحلول والتقابض وجاز التفاضل (ص ۱۴۱)"

اس شرط کو ضروری قرار دینے کی وجہ یہ ہے کہ اگر بیع میں کسی جانب بھی قبضہ نہ ہو، تو یہ "بیع الکالئی بالکالئی" ہے یعنی اُدھار کا اُدھار کے ساتھ معاملہ، جو شرعاً ناجائز ہے۔

چنانچہ ابنِ عمرؓ کی روایت ہے، جس کے الفاظ درج ذیل ہیں:-

اسحاق وابن شيبه والبزار عن ابن عمر :" نهى رسول الله ﷺ ان يباع كالئى بكالئى ــ يعنى دينا بدين ــ زاد البزار :وعن بيع عاجل بآجل وعن بيع الغرر"

"حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اُدھار کے مقابلے میں اُھار کی بیع سے منع فرمایا ہے، بزار کی روایت میں یہ اضافہ ہے کہ آپ نے اُدھار کے مقابلے میں نقد کی بیع سے منع فرمایا ہے، اور بیع غرر سے بھی منع فرمایا ہے۔"(۱)

اور فقط ایک جانب قبضہ ہو، تو اس صورت میں مساوات اور برابری فوت ہو جائے گی، اور اس شرط کی اہم دلیل اشیائے ستہ والی احادیث ہیں:-

"الذهب بالذهب مثلا بمثلا والفضة بالفضة مثلا بمثل، والتمر بالتمر مثلا بمثل والبر بالبر مثلا بمثل، والملح بالملح مثلا بمثل، والشعير بالشعير مثلا بمثل فمن زاد اوازداد فقد اربى، بيعوا الذهب بالفضة كيف شئتم يدا بيد، الحديث۔"

"سونے کو سونے کے بدلے میں برابر سرابر بیچو، چاندی کو چاندی کے بدلے میں برابر سرابر بیچو، کھجور کو کھجور کے بدلے میں برابر سرابر بیچو، گندم کو گندم کے مقابلے میں برابر سرابر بیچو، نمک کو نمک کے

(۱) الدرايه فى تخريج احاديث الهداية، العسقلانى (العلامة ابن حجر العسقلانى المتوفى ۸۵۲ هـ) پنجاب، شيخوپوره، المكتبة الا ثريه پاكستان (۱۵۷/۱)

بدلے میں برابر سرابر بیچو، جو کو جو کے بدلے میں برابر سرابر فروخت کرو، لیکن جو شخص اضافے کا لین دین کرے، وہ رِبا کا معاملہ کرے گا، البتہ سونے کو چاندی کے بدلے میں جس طرح چاہے، فروخت کرو، بشرطیکہ دست دَر دست ہو، اور جو کو کھجور کے بدلے میں جس طرح چاہو، فروخت کرو، بشرطیکہ دست دَر دست ہو۔"(۱)

"الذهب بالذهب وزنا بوزن مثلا بمثل والفضة بالفضة وزنا بوزن مثلا بمثل، فمن زاد او استزاد فهو ربا۔"

"سونا سونے کے مقابلے برابر سرابر بیچو، اور چاندی چاندی کے مقابلے میں برابر سرابر بیچو، جس نے بڑھایا یا زیادہ مانگا، تو یہ رِبا ہے۔"(۲)

عن ابن عمر ان عمر قال: لا تبیعوا الذهب بالذهب الا مثلا بمثل، ولا تبیعوا الورق بالذهب احدهما غائب والآخر ناجز"

"سونے کو سونے کے ساتھ برابر سرابر ہی بیچو، اور چاندی کو سونے کے ساتھ اس طرح مت بیچو کہ ایک حاضر ہو، اور دُوسری چیز غائب ہو۔"(۳)

فائدہ:- بیعِ صَرف میں "تقابض" کے شرط ہونے کا مطلب یہ ہے کہ عاقدین جسماً مجلسِ عقد نہ چھوڑیں، جسے عربی میں "افتراق بالابدان" کہتے ہیں، جس کی صورت

(۱) کنز العمال، المتقی (علاء الدین علی المتقی الهندی) عدد الحدیث ۹۶۶۹۔

(۲) اخرجه مسلم، کتاب المساقاة، باب الربا۔

(۳) نصب الرأية، الزيلعي (العلامة جمال الدين ابو محمد عبد الله الزيلعي الحنفي المتوفى ۷۶۲ هج) لبنان، مؤسسة الريان، طبع اول ۱۴۱۸ هج (۵۶/۴)

یہ ہوگی کہ مثلاً بیعِ صَرف کا معاملہ ہوگیا، اور عوضین پر قبضے سے قبل ایک عاقد اس طرف نکل گیا، اور دُوسرا عاقد دُوسری طرف نکل گیا، یا ایک عاقد مجلس میں موجود ہے، اور دُوسرا اُٹھ کر چلا گیا، تو اس صورت میں یہ عقد شرعاً باطل ہے، لیکن اگر اسی مجلس میں دونوں موجود ہیں، خواہ مجلس جتنی بھی لمبی ہو جائے، یا دونوں اس میں سو جائیں، تو اس کو ''اِفتراق'' نہیں کہا جائے گا، اسی طرح اگر مجلس میں عقد ہوا، اور متعاقدین دونوں ایک ساتھ مجلس سے اُٹھ گئے، اور ایک جانب ہی ایک ساتھ نکلیں، تو اس صورت کو بھی اِفتراق نہیں کہا جائے گا، اور اس سے عقد باطل نہیں ہوگا، اگر اس کے بعد عوضین پر قبضہ پایا گیا، تو صَرف معتبر ہو جائے گا۔ (۱)

مذکورہ شرط کی اہمیت

بیعِ صَرف میں ''تقابض'' کی شرط کی اہمیت حضرت عمر اور حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہما کی درج ذیل دو روایتوں سے معلوم ہوتی ہے:-

عن ابن عمر ان عمر قال: لا تبیعوا الذھب بالذھب الا مثلا بمثل ولا تبیعوا الورق بالذھب احدھما غائب والآخر ناجز وان استنظرك ان یلج بیته فلا تنظره الا یدا بید ھات وھات انی اخشی علیکم الربا۔

''حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ سونے کو سونے کے ساتھ مت بیچو مگر یہ کہ برابر سرابر ہو، اور چاندی کو سونے کے ساتھ مت بیچو جن میں سے ایک غائب ہو، اور دُوسرا حاضر ہو، اور اگر وہ تم سے گھر

(۱) البحر الرائق:

"واما التقابض فالمراد التقابض قبل الافتراق بابدانھما بان یاخذ ھذا فی جھة وھذا فی جھة، فان مشیا میلا او اکثر ولم یفارق احدھما صاحبه فلیسا بمتفرقین،، (۳۲۲/۶)

کذا فی الفقه الاسلامی وادلته : "کذلك لا یحصل التفرق ان ناما فی المجلس او اغمی علیھما او قاما عن المجلس فذھبا معا فی جھة واحدة وطریق واحد الخ"(۲۳۷/۴)

میں داخل ہونے کی مہلت مانگے، تو اس کو یہ مہلت مت دو، مگر یہ ہاتھ دَر ہاتھ ہو، یہ دیا اور یہ لیا، مجھے آپ لوگوں کے بارے میں رِبا کا خوف ہے۔"(۱)

غور فرمائیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ شرطِ تقابض کو بیع صَرف میں کیا اہمیت دیتے ہیں کہ بیع صَرف میں عوضین پر قبضے سے قبل گھر میں داخل ہونے کی بھی گنجائش نہیں ہے، اور اس سے بھی زیادہ اہمیت پر دال حضرت ابنِ عمرؓ کا قول ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں:-

"عن ابن عمر رضی الله عنه انه قال: وان وثب من سطح فثب معه"

"اور اگر وہ (احد العاقدین) چھت سے کود ے، تو تم بھی اس کے ساتھ ہی کودو (تاکہ مجلس ایک رہے)۔"(۲)

شرطِ تقابض پر متفرّع چند اہم مسائل

بیع صَرف کے معتبر ہونے کے لئے جب جانبین سے قبضہ ضروری ہوا، تو اس پر درج ذیل اہم مسائل متفرّع ہوتے ہیں:-

ابراء، ہبہ، صدقہ، استبدال، مقاصہ۔

تفصیل درج ذیل ہے:-

ابراء، ہبہ اور صدقہ

ان تینوں کا حکم ایک ہے، مطلب یہ ہے کہ مثلاً زید اور عمرو کے درمیان ایک دِینار کے مقابلے میں ایک دِینار کا معاملہ صَرف ہوا، زید نے عمرو کو مجلسِ عقد میں اس کا دِینار حوالہ کر دیا، تو زید بَری الذمہ ہوگیا، لیکن عمرو نے ابھی تک زید کو اس کا دِینار حوالے نہیں کیا

---

(۱) نصب الرایة (۵٦/۴) کذا فی فتح القدیر (۲٦۱/٦)

(۲) حوالہ بالا۔

ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ عمرو کے ذمہ ابھی تک زید کا ایک دِینار واجب ہے، تو زید جو صاحبِ حق ہے، اس نے عمرو سے اس مجلس میں کہا، یہ دِینار میں نے تمہیں ہبہ کردیا، یا میں نے تمہیں صدقے کے طور دے دیا، یا میں نے تمہیں اس سے بَری کردیا، اس اِبراء، یا ہبہ یا صدقے کا تعلق ''ثمن الصرف'' سے ہے، جو ایک دِینار ہے۔

اب دو صورتیں ہیں:-

۱-اگر عمرو نے کہا کہ میں نے یہ ہبہ یا صدقہ یا اِبراء قبول کیا، اس صورت میں عمرو بَری الذمہ ہوجائے گا، لیکن بیعِ صَرف باطل ہوجائے گی، کیونکہ ایک جانب سے قبضہ نہیں پایا گیا۔

۲-لیکن اگر عمرو نے اس کو قبول نہیں کیا، تو اس صورت میں اِبراء وغیرہ باطل ہوگیا، اور بیعِ صَرف علیٰ حالہ باقی ہے، کیونکہ یہاں اِبراء وغیرہ فسخِ عقد کے معنی میں ہے، گویا کہ زید اس عقد کو فسخ کرنا چاہتا ہے، اور عمرو اس پر راضی نہیں ہے، اور فسخ شرعاً یک طرفہ دُرست نہیں، اس میں جانبین کی رضامندی ضروری ہے، اب اگر دُوسری جانب سے بھی اِفتراق سے قبل دِینار پر قبضہ پایا جائے، تو بیعِ صَرف دُرست ہوجائے گی۔

اِستبدال

مثالِ مذکور میں اگر عمرو زید کو دِینار کے بدلے میں کپڑا دیدے، تو اس کو قبضہ نہیں کہا جائے گا، اور یہ سمجھا جائے گا، کہ قبضہ ابھی تک ہوا نہیں، لہٰذا اِستبدال باطل ہوگا، اور بیعِ صَرف علیٰ حالہ باقی ہوگا، اگر اِفتراق سے قبل زید نے دِینار پر قبضہ کرلیا، تو یہ عقد دُرست ہوجائے گا۔

مقاصہ (Set off)

مقاصہ کے معنی برابری کے ہیں، یعنی برابر سرابر کرنا، پھر مقاصہ کی دو قسمیں ہیں:-

۱- مقاصہ جبریہ (Compulsoy)

۲۔　　مقاصہ اختیاریہ (Voluntary)

مقاصہ جبریہ (Compulsoy)

مقاصہ جبریہ کا مطلب یہ ہے کہ عاقدین چاہیں یا نہ چاہیں، خود بخود مقاصہ ہو جاتا ہے، مثلاً زید کے عمرو پر ایک سو دِینار اُدھار ہیں، اب کسی معاملے میں عمرو کے زید کے پاس ایسے ہی ایک سو دِینار آ گئے، تو ان دونوں کے درمیان خود بخود مقاصہ ہو جائے گا، اور دونوں کا دَین ساقط ہو جائے گا، زید و عمرو اس پر راضی ہوں یا نہ ہوں، اب اگر دونوں دَینوں کی مقدار ایک ہو، تو ایک دُوسرے سے مطالبہ بالکل ساقط ہو جائے گا، اور اگر دونوں مقدار میں برابر نہ ہوں، تو کمی بیشی کو برابر کیا جائے گا۔

لیکن مقاصہ جبریہ میں ضروری ہے کہ:-

۱- ہر شخص ایک دُوسرے کی نسبت سے دائن (Creditor) بھی ہو، اور مدین (Debtor) بھی ہو۔

۲- دونوں دَین جنس، نوع، صفت، اور کیفیت میں مماثل ہوں، جنس ایک ہو مثلاً دونوں زَر ہوں، نوع ایک ہوں مثلاً دونوں دِرہم ہوں، صفت اور کیفیت ایک ہوں، مثلاً دونوں کھرے یا دونوں کھوٹے ہوں۔ مقاصہ میں کمیت (مقدار) کا ایک ہونا ضروری نہیں۔

مقاصہ اِختیاریہ (Optionaly)

مقاصہ اِختیاریہ جو اَصحابِ حق کی باہمی رضامندی سے ہو، مثلاً زید کا عمرو کے ذمہ دس دِینار واجب ہیں، اور عمرو کا زید کے ذمہ ایک من گندم ہے، اب دونوں اس بات پر راضی ہو گئے کہ ہم ان دونوں کا مقاصہ کرتے ہیں کہ زید اپنا حق چھوڑے اور عمرو اپنا حق چھوڑے، تو یہ جائز ہے۔

جب یہ تمہید سمجھ میں آ گئی تو اب اصل مسئلے کی تفصیل یہ ہے کہ:-

مثلاً زید نے عمرو کے ہاتھ ایک دِینار کے بدلے میں دس دِرہم بیچے، تو دَراہم دینا زید کے ذمہ واجب ہے، اور دِینار دینا عمرو کے ذمہ واجب ہے۔

زید ۱۰ دِرہم ⇦ ⇨ دِینار عمرو

عمرو نے زید کو دِینار دے دیا، اور دس دِرہم ابھی زید کے ذمہ عمرو کے لئے واجب ہیں، لیکن عمرو کے ذمہ زید کے بھی کسی اور معاملے میں دِرہم واجب الاداء ہو گئے:-

زید ۱۰ دِرہم صرف ⇦ ۱۰ ⇨ دِرہم (کسی اور معاملے میں) اور ایک دِینار عمرو

اب دونوں مقاصہ کرنا چاہتے ہیں، تو کیا مقاصہ ہوسکتا ہے؟

تین صورتیں ہیں:-

۱- عمرو کے ذمہ زید کے دس دِرہم عقدِ صَرف سے قبل کسی وجہ سے واجب ہو چکے تھے، اس صورت میں یہ مقاصہ اِستحساناً دُرست ہوگا، اگرچہ قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ یہ مقاصہ دُرست نہ ہو، کیونکہ ایک جانب قبضہ نہیں پایا گیا، اور یہ مقاصہ اختیاریہ ہوگا، یعنی اگر دونوں مقاصہ کرنا چاہیں، تو کر سکتے ہیں، ورنہ نہیں۔

۲- عمرو کے ذمہ زید کے دس دِرہم عقدِ صَرف کے بعد کسی قبضِ مضمون (قبضہ جو موجبِ ضمان ہو مثلاً غصب وغیرہ) کے ساتھ واجب ہو گئے، مثلاً عمرو نے زید سے دس دِرہم غصب کیے، اس صورت میں جبری مقاصہ ہوگا۔

۳- عمرو کے ذمہ زید کے دس دِرہم عقدِ صَرف کے بعد کسی عقد کی وجہ سے واجب ہوں، مثلاً عمرو نے زید سے دس دِرہم میں کپڑا خریدا اب یہ دس دِرہم عمرو کے ذمہ اس عقدِ بیع کی وجہ سے زید کے لئے واجب الاداء ہیں، اس صورت میں جبری مقاصہ تو بالاتفاق جائز نہیں، البتہ باہمی رضامندی سے اگر یہ دونوں مقاصہ کرنا چاہیں، تو صحیح روایت کے مطابق دونوں مقاصہ کر سکتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ پہلی اور تیسری صورت میں مقاصہ اختیاریہ ہوگا، اور دُوسری صورت

میں مقاصہ جبر یہ ہوگا۔[1]

تماثل/مماثلت (Similarity)

تماثل یا مماثلت کے معنیٰ ''برابری'' کے ہیں، بیعِ صَرف میں اس کا مطلب یہ ہے کہ جب عوضین ہم جنس ہوں، مثلاً دِینار کے مقابلے میں دِینار یا دِرہم کے مقابلے میں دِرہم کی بیع ہو رہی ہو، تو اس صورت میں کسی ایک جانب کسی قسم کی کوئی زیادتی جائز نہیں، خواہ وہ کسی بھی شکل میں ہو، اور اس سلسلے میں جید (عمدہ) اور ردّی (گھٹیا) برابر ہیں، برتن کی شکل میں ہوں، زیور کی صورت میں ہوں، ڈلی کی شکل میں ہوں، یا سکہ کی شکل میں ہوں، کیونکہ اس سلسلے میں وارِد احادیث مطلق ہیں، وہ اطلاق کی وجہ سے تمام صورتوں کو شامل ہیں، چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

> ''الذهب بالذهب والفضة بالفضة (الى ان قال:) مثلا بمثل سواء بسواء يدا بيد فاذا اختلفت هذه الاصناف فبيعوا كيف شئتم اذا كان يدا بيد۔''
>
> ''سونا سونا کے مقابلے میں اور چاندی چاندی کے مقابلے میں .... برابر سرابر اور ہاتھ دَر ہاتھ بیچو، جب یہ قسمیں مختلف ہوجائیں، تو پھر جس طرح مرضی ہو، بیچو، لیکن اس صورت میں بھی ہاتھ دَر ہاتھ بیچنا ضروری ہے۔''[2]

البتہ عوضین اگر ہم جنس نہ ہوں، تو اس صورت میں تماثل ضروری نہیں، مثلاً ایک جانب دِرہم ہے، اور دُوسری جانب دِینار ہے، تو اس صورت میں تفاضل (زیادتی) جائز

---

(۱) البحر الرائق (۲/۲۲۲) فتح القدير (۲/۲۵۸) الفقه الاسلامي وادلته (۴/۲۳۹)

(۲) رواه البخاري في كتاب البيوع باب ۸، ۸۱، ۸۳، ومسلم في كتاب المساقاة حديث ۷۶، ۸۱، ابوداؤد في كتاب البيوع باب ۱۲، ۱۷، الترمذي في كتاب البيوع باب ۴۲-۴۴، وغيرها۔

ہے، جیسا کہ حدیثِ مذکور میں اس کی صراحت ہے کہ جب اقسام مختلف ہوں، تو جیسی مرضی ہو فروخت کیا کرو، البتہ تقابض اس صورت میں بھی ضروری ہوگا۔

اس شرط پر متفرّع چند اہم مسائل

۱- ۲ دِرہم + دِینار = ۲ دِینار + دِرہم

یہ معاملہ جمہور احناف کے نزدیک جائز ہے، کیونکہ اس میں:-

دو دِرہم = دو دِینار اور ایک دِینار = ایک دِرہم

جنس مختلف ہونے کی وجہ سے اس میں کمی بیشی جائز ہے۔

۲- ۱۱ دِرہم = ۱۰ دِرہم + دِینار

یہ عقد دُرست ہے، کیونکہ اس میں:-

۱۰ دِرہم = ۱۰ دِرہم اور دِرہم = دِینار

دس دِرہم دس دِرہم کے مقابلے میں آ کر مساوات ثابت ہوگئی اور ایک دِرہم ایک دِینار کے مقابلے میں آیا، جس میں جنس مختلف ہونے کی وجہ سے مساوات ضروری نہیں۔

۳- ۱۰ دِرہم = ۹ دِرہم + دُوسری کوئی چیز (یا)

۱۰ دِینار = ۹ دِینار + دُوسری کوئی چیز

اس کی تین صورتیں ہیں:-

۱- ''دُوسری چیز'' کی قیمت ایک دِرہم (پہلی مثال میں) یا ایک دِینار (دُوسری مثال میں) کے برابر ہے۔

۲- ''دُوسری چیز'' کی قیمت ایک دِرہم یا ایک دِینار سے کم ہے۔

۳- ''دُوسری چیز'' کی کوئی قیمت نہیں۔

پہلی صورت میں یہ عقد بلا کراہت جائز ہے، دُوسری صورت میں کراہت کے

ساتھ جائز ہے، اور تیسری صورت میں یہ عقد دُرست ہی نہیں۔

اس دُوسری صورت میں یہ حیلہ ممکن ہے کہ ایک جانب جو سونا یا چاندی زائد ہے، اس کو اس ''دُوسری چیز'' کے مقابلے میں رکھا جائے، تو خلافِ جنس ہونے کی وجہ سے کوئی کراہت نہ ہو، لیکن اس کے باوجود یہ صورت مکروہ قرار پائی، کیونکہ اگر اس کی اجازت دی جائے، تو لوگ اس کو رِبا الفضل کے جواز کے لئے ایک حیلہ بنالیں گے، اور اس طرح رِبا الفضل کا دروازہ کھل جائے گا، چنانچہ حضرت اِمام محمدؒ سے جب اس صورت کے بارے میں پوچھا گیا کہ:-

كيف تجده في قلبك ؟

''آپ دِل میں یہ صورت کیسی ہے؟''

تو انہوں نے فرمایا:-

مثل الجبل---

''پہاڑ کی طرح''(۱)

خیارِشرط (Optional Condition)

اس کو سمجھنے سے قبل خیار کی مشہور قسموں کا مختصر تعارف ضروری ہے، تو یاد رکھنا چاہئے کہ خیار کی تین مشہور قسمیں ہیں:-

۱۔ خیارِشرط

۲۔ خیارِرُؤیت

۳۔ خیارِعیب

خیار کی تعریف

خیار(Option) کی تعریف یہ کی گئی ہے:-

(۱) الهداية مع فتح القدير (۲۶۷/۶ تا ۲۷۱)

"حق العاقد فی فسخ العقد او امضاء ہ لظھور مسوغ شرعی
او بمقتضی اتفاق عقدی۔"
''فسخِ عقد یا تنفیذِ عقد کا وہ حق جو عاقد کو اس وقت حاصل ہوتا ہے، جب معاملے میں کوئی شرعی مجوّز ظاہر ہو جائے، یا کسی ایسے معاہدے کی وجہ سے جو عقد میں ہوا ہوتا ہے۔''(۱)

خیارِ شرط

اس میں اِضافت مسبّب کی سبب کی طرف ہے، یعنی وہ خیار جو شرط کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے، یعنی اگر یہ شرط نہ ہوتی، تو یہ خیار بھی حاصل نہ ہوتا۔(۲)

خیارِ شرط کی تعریف یہ کی گئی ہے:-

"ان یشترط فی العقد او بعدہ الخیار لاحد المتعاقدین
او کلیھما فی فسخ العقد وامضاء ہ"
''عقد میں یا بعد میں کسی ایک عاقد یا دونوں کے لئے فسخِ عقد یا تنفیذِ عقد کی شرط لگائی جائے۔''

یعنی خیارِ شرط کا مطلب یہ ہے کہ عقد میں کسی ایک عاقد یا دونوں کا اس بات کا اِختیار دیا جائے کہ اگر وہ چاہے یا چاہیں، تو اس عقد کو اتنے دنوں میں فسخ کرے یا کریں، اور یا اس کو نافذ کرے یا کریں، اب اس شرط کی بنیاد پر جس کو اِختیار حاصل ہو، وہ مقرّرہ مدّت کے اندر اس شرط کے مطابق اپنا اِختیار اِستعمال کر سکتا ہے، چاہے تو اس عقد کو ختم کرے، اور چاہے، تو اس کو نافذ کرے، مثلاً زید عمرو سے کہتا ہے کہ میں تم سے یہ گھڑی خرید تا ہوں لیکن مجھے تین دن کا اِختیار رہے گا۔

---

(۱) الخیار واثرہ فی العقود، ابو غدہ (الدکتور عبد الستار ابو غدہ)، الکویت، مطبعۃ مقھوی، طبع دوم ۱۴۰۵) (۱/۴۳)

(۲) حوالہ بالا (۱/ ۱۹۴)

خیارِ شرط کے لئے مدّت مقرر کرنا ضروری ہے، اور یہ مدّت اِمام صاحبؒ کے نزدیک زیادہ سے زیادہ تین دن ہیں، اور حضراتِ صاحبینؒ کے نزدیک تین دن سے زیادہ بھی ہوسکتی ہے۔ (۱)

خیارِ رُؤیت

اس میں بھی اِضافتِ سببیہ ہے، یعنی وہ خیار جو رُؤیت کی وجہ سے مشتری کو حاصل ہو، بلکہ عدمِ رُؤیت کی وجہ سے حاصل ہو۔

خیارِ رُؤیت کی تعریف یہ کی گئی ہے:-

"حق يثبت به للمتملك الفسخ او الامضاء عند رؤية محل المعين الذی عقد عليه ولم يره۔"

"وہ حق ہے جس کی وجہ سے مالک بننے والے کو فسخ یا تنفیذ کا اِختیار حاصل ہوتا ہے، جب وہ اس معین محل کو دیکھا جائے جس پر عقد واقع ہو، اور اس کو دیکھا نہ ہو۔"

اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی نے جو چیز کو نہ دیکھا ہو، اور بن دیکھے اس کو خریدے، تو دیکھنے کے بعد مشتری کو اِختیار ہوتا ہے کہ چاہے تو اس عقد کو باقی رکھے، اور چاہے تو اس عقد کو نافذ کرے۔

خیارِ عیب

یعنی وہ خیار جو عیب کی وجہ سے مشتری کو حاصل ہو۔ (۲)

اور خیارِ عیب کی تعریف یہ ہے:-

"ماثبت بسبب نقص يخالف ما التزمه البائع عرفا فی زمان ضمانه۔"

(۱) حوالہ بالا (۱/ص ۱۰۳)

(۲) فتح القدير ۲/۲)

''جو ایسے نقصان کی وجہ سے حاصل ہو، کہ جس کا بائع نے زمانۂ ضمان میں عرفاً اِلتزام کیا ہو، اس کے خلاف ہو۔''

اس کا مطلب یہ ہے کہ بائع نے اس بات کو اِلتزام کیا ہے کہ وہ مشتری کو صحیح سالم شئ دے گا، لیکن مبیع میں کوئی ایسا نقص نکل آتا ہے، جو اس بائع کے اِلتزام کے خلاف ہوتا ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ بائع کا اِلتزام باقی نہ رہا لہٰذا وہ ضامن ہوگا۔ (۱)

ان تینوں خیارات میں عقد خطرہ میں رہتا ہے، یعنی فسخ بھی ہوسکتا ہے، اور نافذ بھی ہوسکتا ہے۔

اب اصل مسئلہ یہ ہے کہ ''بیعِ صَرف'' میں یہ تینوں خیارات جاری ہوسکتے ہیں یا نہیں؟ تو خوب سمجھنا چاہئے کہ بیعِ صَرف میں چونکہ مجلسِ عقد میں عوضین پر قبضہ کرنا ضروری ہوتا ہے، اس لئے اس میں خیارِ شرط کا تصور بھی نہیں ہوسکتا، یعنی زید عمرو سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں تم سے دِینار کے بدلے میں دِینار یا دِرہم خریدتا ہوں، لیکن مجھے یا ہم دونوں کو تین دن تک فسخ یا تنفیذ کا اِختیار رہے گا۔

البتہ خیارِ عیب عقدِ صَرف میں جاری ہوسکتا ہے، کہ دونوں عوضین پر قبضہ کریں، تو ظاہر ہے کہ بیع ہوگئی، اور عقد مکمل اور حتمی ہوگیا، اور ملکیت منتقل ہوگئی، لیکن بعد میں کسی ایک جانب میں عیب نکل آیا کہ مثلاً دِرہم میں کھوٹ غالب تھا، تو اَب اس کو خیارِ عیب حاصل ہوگا، اور اسی طرح خیارِ رُؤیت بھی بیعِ صَرف کے لئے مضر نہیں ہے، لیکن بیعِ صَرف میں جہاں مقابلہ زر کا زَر کے ساتھ ہو، یعنی تعیین سے متعین نہ ہوتے ہوں، تو اس میں خیارِ رُؤیت کا تصور نہیں ہوسکتا، کیونکہ یہاں عقد کا تعلق عین سے ہے نہیں، تو رُؤیت کا کوئی فائدہ بھی نہیں، البتہ اگر زیور ہو، یا برتن ہو، یا ڈلی ہو، جو تعیین سے متعین ہوتی ہے، تو وہاں خیارِ رُؤیت کارگر ہوگا۔ (۲)

---

(۱) الخیار واثرہ عن الحطاب علی الخلیل ۴/۴۲۷) (۲/۳۴۷)

(۲) الفقہ الاسلامی وادلتہ (۴/۶۳۸)

فائدہ:- اگر بیعِ صَرف میں عاقدین میں سے دونوں یا کسی ایک کے لئے خیارِ شرط رکھا گیا، تو عقد فاسد ہو جائے گا، البتہ اگر اسی مجلس میں اس خیار کو ختم کر دیا، اور جانبین سے مجلس میں قبضہ پایا گیا، تو عقد دوبارہ دُرست ہو جائے گا، لیکن اگر خیار کے ساتھ ہی مجلس برخاست ہوگئی، تو اَب فساد پکا ہو جائے گا، بعد میں اگر خیار ساقط بھی کیا جائے، تو اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ (۱)

اجل (Deferred Payment)

یہ بھی بیعِ صَرف کی عدمی شرائط میں سے ہے، یعنی اس کا نہ ہونا بیعِ صَرف کی صحت کے لئے ضروری ہے، اور اس کے ہونے سے بیعِ صَرف باطل ہوگی، اور اس کی وجہ بالکل ظاہر ہے، کیونکہ بیعِ صَرف میں جب عوضین پر قبضہ ضروری ہوا، تو اگر کسی ایک جانب ثمن مؤجل ہو، تو مجلسِ عقد میں قبضے کا تحقق نہیں ہوگا، اس وجہ سے بیعِ صَرف کسی بھی جانب اجل کو قبول نہیں کرتی۔

واضح رہے کہ ''اجل'' کا تعلق عام بیوعات میں ثمن سے ہوتا ہے، عام بیوعات اس لئے کہا کہ بیع سلم میں اجل کا تعلق مبیع (Subjet Matter) سے ہوتا، اور صرف میں عوضین میں ہر ایک مبیع بھی ہے، اور ثمن بھی ہے، لہٰذا جانبین کے کسی بھی ثمن اجل کو قبول نہیں کرے گا۔

خیارِ شرط کی طرح اگر معاملہ مؤجل ہوا، لیکن اسی مجلس میں اجل کو ساقط کر دیا گیا، اور تقابض پایا گیا، تو اس صورت میں بیعِ صَرف دُرست ہو جائے گی، اور اگر تقابض کے بغیر مجلس برخاست ہوئی، تو یہ فساد مستحکم ہو جائے گا، اور بعد میں اجل ساقط کرنا کارگر نہیں ہوگا۔

خلاصہ یہ کہ بیعِ صَرف کے معتبر ہونے کے لئے ان چار شرطوں کا وجوداً اور عدماً ہونا نہایت ضروری ہے، یعنی تقابض اور تماثل کا وجوداً ہونا ضروری ہے، اور خیارِ شرط اور اَجل کا عدماً ہونا ضروری ہے۔

(۱) الفقه الاسلامي وادلته (۴/ ۶۳۸)

چند اہم متفرق مسائل

۱- یہ قاعدہ ہے کہ جن اشیاء کی بیع میں تفاضل جائز ہوتا ہے، ان میں مجازفہ (تولے ناپے بغیر اندازہ سے) بھی جائز ہوگا، اور جن اشیاء میں تفاضل اور زیادتی جائز نہیں، ان میں مجازفہ بھی جائز نہیں، اور یہ قاعدہ چاروں مذاہب میں متفق علیہا ہے، لہٰذا سونے کی سونے کے ساتھ بیع یا چاندی کی چاندی کے ساتھ بیع یا گندم کی گندم کے ساتھ بیع مثلاً مجازفۃً حرام ہے۔ لیکن چاندی کی سونے کے ساتھ یا گندم کی جو کے ساتھ بیع مجازفۃ دُرست ہے۔

۲- اگر کسی نے مثلاً سونے کو سونے کے ساتھ مجازفۃ بیچا، تو یہ ناجائز ہے، لیکن اگر پھر اسی مجلس میں دونوں کو تولا گیا، اور دونوں برابر تھے، تو اِستحساناً یہ عقد دُرست ہو جائے گا، اور اگر مجلس برخاست ہوگئی، اور اس کے بعد دونوں کو تولا اور دونوں برابر نکلیں، تو اس صورت میں یہ عقد بدستور فاسد ہی رہے گا۔

۳- تلوار تلوار کے مقابلے میں یا تانبے کے کسی برتن کو تانبے کے دُوسرے برتن کے ساتھ مجازفۃ فروخت ہوا، تو اگر عرف و دستور عدداً فروخت کرنے کا ہو، تو یہ عقد جائز ہے، کیونکہ ''عددی ہونا'' کسی کے نزدیک علتِ رِبا نہیں، اور اگر عرف وَزناً بیچنے کا ہو، تو اس صورت میں یہ عقد باطل ہے، کیونکہ وزن + جنس علتِ رِبا ہے، تو اس میں مجازفت دُرست نہ ہوگی۔

۴- چاندی میں اگر کھوٹ شامل ہو، یا سونے میں کھوٹ شامل ہو، اور اس کو کسی اور دھات کے ساتھ فروخت کیا، تو دیکھا جائے گا، اگر چاندی غالب ہے، تو یہ خالص چاندی کے حکم میں ہے، اور اسی طرح سونا غالب ہو، تو یہ خالص سونے کے حکم میں ہے، لہٰذا اس طرح کھوٹ والی چاندی یا سونے کو اپنے ہم جنس کے ساتھ تفاضلاً فروخت کرنا دُرست نہ ہوگا، اور اگر کھوٹ غالب ہے، تو اس کا حکم عام دھات کا ہے، لہٰذا جس

دھات کے ساتھ اس کا مقابلہ ہو رہا ہے، وہ اگر اس کا ہم جنس ہو، تو اس عقد میں تفاضل جائز نہ ہوگا، ورنہ جائز ہوگا۔

یاد رہے کہ ان مسائل میں ''برابر'' غالب کے حکم میں ہے، یعنی اگر سونے یا چاندی میں سونا یا چاندی کھوٹ کے برابر ہو، تب بھی یہ سمجھا جائے گا کہ یہ خالص چاندی یا خالص سونا ہے، اور اس پر وہی چاندی اور سونے کے اَحکام جاری ہوں گے۔

۵- جس تلوار پر چاندی چڑھائی گئی ہو، اس کو "سیف مُفَضَّض" کہا جاتا ہے، اور جس تلوار پر سونے کا کام ہوا ہو، اس کو "سیف مُذَہَّب" کہا جاتا ہے، اس قسم کی تلوار کی بیع اگر سونے یا چاندی کے ساتھ ہو، تو اگر تلوار میں لگا زیور ثمن والے زَر کے جنس سے مختلف ہو، مثلاً سیف مفضض ہے، اور اس کی بیع سونے کے ساتھ ہوئی، یا سیف مذہب ہے اور اس کی بیع چاندی کے ساتھ ہوئی، تو یہ بیع تو دُرست ہے، کیونکہ یہاں کمی بیشی جائز ہے، لیکن اگر ہم جنس کے ساتھ ہوا، یعنی تلوار کے زیور اور ثمن والا زَر ہم جنس ہیں، تو اس صورت میں دیکھا جائے گا، اگر:-

۱- تلوار میں سونا اس سونے سے یا تلوار میں چاندی اس چاندی سے زیادہ ہے، جو ثمن ہے، تو یہ بیع جائز ہے، یعنی ثمن کی مقدار تلوار والے سونے یا چاندی سے زیادہ ہے، تو یہ معاملہ جائز ہے، یہ شکل بنے گی:-

ثمن کا سونا یا چاندی	=	تلوار کا سونا یا چاندی
بقیہ ثمن	=	تلوار کا نیام وغیرہ

تلوار میں جتنا سونا یا چاندی ہے، ثمن میں سے اس کی بقدر سونا یا چاندی اس سونے یا چاندی کے مقابلے میں ہو جائے گی، اور ثمن میں سے جو باقی زائد حصہ ہے، وہ تلوار کے نیام وغیرہ کے مقابلے میں آجائے گا، جو مختلف جنس ہیں، تو اس طرح عقد دُرست ہوگا، اس سلسلے میں حضراتِ حنفیہ کا ایک مشہور قاعدہ ہے کہ:-

''مبیع جب مختلف اشیاء پر مشتمل ہو، جن میں کوئی شئ ثمن کی ہم جنس

ہو، اور کوئی شئ ثمن کی ہم جنس نہ ہو، تو اس صورت میں ثمن اپنے ہم
جنس کے ساتھ لگے گا، اور اس طرح بیع دُرست ہو جائے گی۔''

مثلاً سیف مفضض میں پچاس دِرہم کی چاندی تھی، اور اس کو سو دِرہم میں خریدا، یعنی:-

سیف+۵۰ = ۱۰۰دِرہم

اور مشتری نے ۱۰۰دِرہم میں سے صرف ۵۰ دِرہم ادا کئے، اور پچاس دِرہم ابھی ادا نہیں کئے، تو یہ معاملہ جائز ہے، کیونکہ اس میں:-

۵۰=۵۰⇐صرف

بقیہ ۵۰ = تلوار⇐عام بیع

صرف پچاس دِرہم تک یہ معاملہ صَرف کا ہے، جس میں تقابض پایا گیا، لہٰذا یہ معاملہ دُرست ہوا، اور تلوار کی حد تک یہ معاملہ عام بیع ہے، جس میں قبضہ ضروری نہیں۔

۶- اسی سیف مفضض کے مسئلے میں اگر پچاس دِرہم پر قبضہ نہیں پایا گیا، تو ۵۰ = ۵۰ دِرہم کی حد تک چونکہ یہ معاملہ صَرف کا ہے، لہٰذا عدمِ تقابض کی وجہ سے پہلا معاملہ باطل ہو گیا، لیکن دُوسرا معاملہ جو تلوار کا ہے، اس معاملے میں دُرست ہے، یا نہیں؟ تو اس میں یہ تفصیل ہے کہ اگر:-

الف:- چاندی کو الگ کرنے سے تلوار کو غیر معمولی نقصان پہنچتا ہے، تو تلوار میں معاملہ بھی فاسد ہے، گویا اس صورت میں دونوں معاملے فاسد ہو گئے۔

ب:- لیکن اگر چاندی تلوار سے بآسانی الگ ہو سکتی ہے، تو اس صورت میں تلوار کا معاملہ دُرست ہوگا، اور بائع تلوار سے اپنی چاندی الگ کر کے تلوار کو ۵۰ دِرہم کے بدلے میں مشتری کے حوالہ کر دے گا۔

۷- لیکن اگر مذکورہ مسئلے میں ثمن تلوار والے سونے یا چاندی کے برابر یا اس سے کم ہو، تو اس صورت میں یہ عقد جائز نہ ہوگا، اور اس کا جائز نہ ہونا بالکل ظاہر ہے، کیونکہ اس

میں رِبا الفضل ہے۔

۸-ایک باندی ہے، جس کی قیمت ایک ہزار دِرہم ہے، اور اس کے گلے میں ایک ہزار کا ہار بھی ہے، اس باندی کا سودا دو ہزار دِرہم میں ہوگیا، پھر مشتری نے صرف ایک ہزار دِرہم مجلس میں بائع کو ادا کئے، تو یہ عقد دُرست ہے، کیونکہ:-

۱۰۰۰ دِرہم = ۱۰۰۰ درہم (ہار)

بقیہ ۱۰۰۰ دِرہم = باندی

پہلا معاملہ صِرف صَرف کا ہے، اور اس میں تقابض پایا گیا، لہٰذا وہ دُرست ہوا، اور دُوسرا معاملہ عام بیع کا ہے، جس میں تقابض شرط نہیں، اور یہاں دُوسرا معاملہ بہرحال دُرست ہے کیونکہ ہار باندی سے الگ کرنا ہر حال میں آسان ہے، بخلاف سیف مفضض کے۔

۹-اسی مسئلے میں اگر ایک ہزار مشتری نے ادا کئے اور ایک ہزار اُدھار رکھ لئے، تو اَجل کا تعلق صَرف سے نہیں ہوگا، لہٰذا صَرف دُرست ہوجائے گا، اور باندی کے مقابلے میں جو ایک ہزار دِرہم ہیں وہ مؤجل ہیں، جو کہ عام بیع ہے، لہٰذا وہ مؤجل ہونے کے باوجود دُرست ہوگی۔

۱۰-ایک اہم مسئلہ یہ ہے کہ چاندی کا ایک برتن ہے، اس کو کسی نے مثلاً ایک سو میں فروخت کیا، پھر مجلس میں ۵۰ پر قبضہ پایا گیا، اور ۵۰ پر نہیں، تو ۵۰ کی حد تک یہ معاملہ دُرست سمجھا جائے گا، اور ۵۰ کی حد تک نہیں، لہٰذا یہ برتن بائع اور مشتری کے درمیان مشترک ہوگا۔[1]



(۱) الھدایۃ مع فتح القدیر (۲۶۵/۶)، کنز الدقائق مع البحر الرائق (۳۲۴/۶)، الفقہ الاسلامی وادلتہ (۲۵۶/۴)۔

ضمیمہ (Appendix)

سونے چاندی، اور زیورات کے چند اہم مسائل

چونکہ ان مسائل کا ''صَرف'' سے گہرا تعلق ہے، اور ان کو ذِکر کرنا اس مقام پر مفید ہے، اس لئے ان مسائل کو بعنوان ضمیمہ بیان کئے جاتے ہیں، لیکن اصل مسائل ذِکر کرنے سے قبل چند مقدمات بیان کرنا ضروری ہے، تا کہ ان سے اصل مسائل سمجھنے میں آسانی ہو:-

چند ضروری مقدمات

مقدمہ ۱

جب دونوں طرف سونا یا دونوں طرف چاندی ہو، تو لین دین میں ضروری ہے کہ ہاتھ دَر ہاتھ اور مقدار میں برابر ہو۔ البتہ اگر ایک طرف سونا اور دُوسری طرف چاندی ہو، تو مقدار میں کمی بیشی ہوسکتی ہے، لیکن ہاتھ دَر ہاتھ ہونا اس میں بھی ضروری ہے۔

"الذهب بالذهب مثلا بمثلا والفضة بالفضة مثلا بمثل، والتمر بالتمر مثلا بمثل والبر بالبر مثلا بمثل، والملح بالملح مثلا بمثل، والشعير بالشعير مثلا بمثل فمن زاد اوازداد فقد اربى، بيعوا الذهب بالفضة كيف شئتم يدا بيد، الحديث [1]

---

(۱) كنز العمال، المتقى (علاء الدين على المتقى الهندى) عدد الحديث ۴۲۶۹۔

"سونے کو سونے کے بدلے میں برابر سرابر بیچو، چاندی کو چاندی کے بدلے میں برابر سرابر بیچو، کھجور کو کھجور کے بدلے میں برابر سرابر بیچو، گندم کو گندم کے مقابلے میں برابر سرابر بیچو، نمک کو نمک کے بدلے میں برابر سرابر بیچو، جو کو جو کے بدلے میں برابر سرابر فروخت کرو، لیکن جو شخص اضافے کا لین دین کرے، وہ رِبا کا معاملہ کرے گا، البتہ سونے کو چاندی کے بدلے میں جس طرح چاہے، فروخت کرو، بشرطیکہ دست دَر دست ہو، اور جو کو کھجور کے بدلے میں جس طرح چاہو، فروخت کرو، بشرطیکہ دست دَر دست ہو۔"

مقدمہ ۲

جب سونے کا سونے سے یا چاندی کا چاندی سے تبادلہ کیا جائے، تو مقدار کا برابر ہونا واجب ہے اگرچہ ایک طرف سونا چاندی خالص ہو، اور دُوسری طرف سونے چاندی میں کچھ کھوٹ ملا ہو۔

عن الشعبی ان عبدالله بن مسعود باگ نفاية بيت المال زيوفا وقسيانا دراهم دون وزنها فنهاه عمر عن ذلك وقال: اوقد عليها حتى يذهب مافيها من حديد او نحاس وتخلص ثم بع الفضة بوزنها۔

شعبی کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیت المال کی ردّی یعنی کم و زیادہ کھوٹ ملے دِراہم کو کھرے دِراہم کے عوض کمتر وزن میں فروخت کیا، تو حضرت عمرؓ نے انہیں اس سے منع کیا، اور فرمایا کہ اس کو آگ پر تپاؤ یہاں تک کہ اس میں ملا ہوا لوہا اور تانبا علیحدہ ہو جائے اور خالص چاندی رہ جائے، پھر اس کو برابر وزن

کی چاندی کے عوض فروخت کرو۔"(1)

محمد بن سيرين قال: خطب عمر بن الخطاب فقال: الا ان الدرهم بالدرهم والدينار بالديناعينا بعين سواء بسواء مثلا بمثل فقال له عبدالرحمن بن عوف: تزيف علينا اوراقنا فنعطى الخبيث وناخذ الطيب فقال عمر: لا، ولكن ابتع بها عرضا فاذا قبضته وكان لك فبعه واهضم ماشئت وخذ اى نقد شئت۔

محمد بن سیرینؒ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے خطبہ دیا اور کہا کہ خبردار دِرہم کی بیع دِرہم کے عوض اور دِینار کی بیع دِینار کے عوض میں نقد و نقد اور برابر سرابر ہونی چاہئے، عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے پوچھا کہ ہماری چاندی کھوٹی ہوجاتی ہے ہم گھٹیا چاندی دے کر (کم مقدار میں) عمدہ چاندی عوض میں خرید لیتے ہیں، حضرت عمرؓ نے جواب دیا کہ یہ جائز نہیں، البتہ اپنی گھٹیا چاندی کے عوض کچھ سامان خرید لو، جب تم اس پر قبضہ کرلو، اور وہ تمہارا ہوجائے، تو اس کو فروخت کردو۔"(2)

مقدمہ ۳

ہمارے موجودہ رِواج میں روپیہ دھات کے سکے کا نام ہے، یہ سکہ ایسے ہی جیسے پچیس پیسے یا پچاس پیسے کے سکے ہوتے ہیں، دس روپے کے کاغذ کا نوٹ دھات کے روپے کے سکے کا متبادل ہے، قیامِ پاکستان سے قبل روپے کا سکہ چاندی کا ہوتا تھا، لیکن

(1) اعلاء السنن، العثمانی، (علامہ ظفر احمد العثمانی) کراتشی، ادارة القرآن والعلوم الاسلامية (298/14)

(2) ایضاً

موجودہ دور میں روپے کا چاندی یا سونے کا تعلق نہیں ہے، اس لئے یہ فلوس یعنی تانبے کے سکوں کے حکم میں ہے، جب روپیہ چاندی کا ہوتا تھا اس وقت اس سے متعلق اَحکام اور تھے، اور اَب جب وہ تانبے پیتل کا ہے، اس کے اَحکام مختلف ہیں۔

مقدمہ ۴

سونے چاندی کے روپوں کے عوض اُدھار خرید وفروخت جائز ہے، لیکن سودے کے وقت ایک جانب سے قبضہ ضروری ہے۔

"وفی شرح الطحاوی : لو اشتری مائة فلس بدرهم وقبض الفلوس او الدراهم ثم افترقا جاز البيع لانهما افترقا عن عين بدين۔"

''اور شرح طحاوی میں ہے کہ اگر کسی نے ایک دِرہم کے بدلے سو فلس خریدیں، اور فلوس یا دَراہم پر قبضہ کرلیا، اور پھر دونوں الگ الگ ہوگئے، تو یہ بیع جائز ہے، کیونکہ اس میں دَین کے بدلے میں عین کا سودا کر کے جدا ہوگئے۔''[1]

"سئل الحانوتي عن بيع الذهب بالفلوس نسئية فاجاب بانه يجوز اذا قبض احد البدلين لما في البزازية:

''علامہ حانوتیؒ سے فلوس کے بدلے سونے کو اُدھار فروخت کرنے کے بارے میں سوال کیا گیا، تو انہوں نے جواب دیا کہ یہ جائز ہے، بشرطیکہ ایک بدل پر قبضہ ہو، کیونکہ بزازیہ میں مذکور ہے کہ اگر کوئی شخص سو فلس ایک دِرہم کے بدلے خریدے، تو ایک جانب سے قبضہ کافی ہے، فرمایا، اسی طرح اگر فلوس کے بدلے چاندی یا سونے کو بیچا۔''

---

(۱) فتح القدير (۲۷۸/۶)

علامہ سرخسیؒ کا رُجحان بھی اسی طرف ہے، چنانچہ فرمایا:-

واذا اشترى الرجل فلوسا بدراهم ونقد الثمن ولم تكن الفلوس عند البائع فالبيع جائز، لان الفلوس الرائجة ثمن كالنقود، وقد بينا ان حكم العقد فى الثمن وجوبها ووجودها معا ولا يشترط قيامها فى ملك بائعها لصحة العقد كما لا يشترط ذلك فى الدراهم والدنانير۔

''جب ایک آدمی دَراہم کے بدلے میں فلوس خریدے، اور ثمن (دَراہم ادا کیے) ادا کیا، اور فلوس بائع کے پاس نہیں تھے، تو یہ جائز ہے، کیونکہ فلوس رائجہ نقود کی طرح ثمن ہیں، اور ہم یہ بیان کر چکے ہیں کہ ثمن میں عقد کا حکم صرف اس کا وجوب اور وجود ہے، اور ثمن کا بوقتِ عقد بائع کی ملکیت میں ہونا صحتِ عقد کے لئے ضروری نہیں، جیسا کہ یہ دَراہم اور دَنانیر میں یہ شرط نہیں ہے۔''(۱)

چونکہ روپے بھی فلوس کے حکم میں ہے، لہٰذا مندرجہ بالا عبارات کی روشنی میں سونے چاندی کی خرید وفروخت روپے کے عوض میں جائز ہے، البتہ یہ شرط ہے کہ ایک جانب سے مال پر قبضہ جدا ہونے سے پہلے کرلیا جائے، دونوں طرف اُدھار ہو، تو یہ جائز نہیں، خواہ کتنی ہی تھوڑی مدّت کے لئے ہو، کیونکہ اس صورت میں یہ بیع الکالی بالکالی کے حکم میں ہوگا، اور اس سے احادیث میں ممانعت آئی ہے۔

عن ابن عمر رضى الله تعالىٰ عنه: ان النبى ﷺ نهى عن بيع الكالى بالكالى

''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ

---

(۱) المبسوط للسرخسی (شمس الدین السرخسی) بیروت، لبنان، دار المعرفة، طبع ۱۴۱۴ھ (۲۴/۴)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُدھار کی اُدھار کے عوض بیع سے منع فرمایا ہے۔"(۱)

سونے کے زیور کی سونے کے عوض اور چاندی کے زیور چاندی کے عوض خرید وفروخت

سونے کے زیور کی سونے کے عوض اور چاندی کے زیور چاندی کے عوض خرید و فروخت کمی بیشی کے ساتھ فروخت کرنا جائز نہیں۔

"عن ابی رافع قالم مربی عمر بن الخطاب ومعه ورق فقال : اصنع لینا اوضاحا لصبی لنا، قلت: یا امیر المؤمنین عندی اوضاح معمولة فان شئت اخذت الورق واخذت الاوضاح فقال عمر مثلا بمثل، فقلت: نعم فوضع الورق فی کفة المیزان والاضاح فی الکفة الاخری فلما استوی المیزان اخذ باحدی یدیه واعطی بالاخری۔"

"ابورافع کہتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطابؓ میرے پاس آئے، آپ کے پاس چاندی تھی، اور کہا کہ ہماری ایک بچی کے لئے پازیب بنادو، میں نے کہا کہ اے امیر المومنین! میرے پاس بنے ہوئے پازیب رکھے ہیں، آپ چاہیں تو چاندی میں لے لیتا ہوں، اورآپ پازیب لے لیں، حضرت عمرؓ نے پوچھا، برابر وزن دینے میں تیار ہو، میں نے کہا جی ہاں، تو حضرت عمرؓ نے چاندی ترازو کے ایک پلڑے میں رکھی، اور پازیب دُوسرے میں، جب ترازو سیدھی

---

(۱) الدرایة فی تخریج احادیث الهدایةللعسقلانی(شهاب الدین احمد بن علی بن محمد بن حجر العسقلانی المتوفی ۸۵۲ھ)المکتبة الاثریة شیخوپوره پنجاب (۱/۱۵۷)

ہوگئی، تو اپنے ایک ہاتھ سے پازیب کولیا، اور دُوسرے ہاتھ سے چاندی پکڑائی۔'' (معانی الآثار)

"عن ابی رافع انه قال لعمر انی اصوغ الذهب فابیعه بوزنه واخذ عمالة یدی اجرا قال لا تبع الذهب بالذهب الا وزنا بوزن والفضة بالفضة الا وزنا بوزن ولا تاخذ فضلا۔"

''ابورافع سے روایت ہے کہ انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ میں سونے کو ڈھالتا ہوں، یعنی اس کا زیور بناتا ہوں، اور اس کو اتنے ہی وزن کے سونے کے عوض فروخت کرتا ہوں، اور ساتھ ہی میں اپنی مزدوری لیتا ہوں، حضرت عمرؓ نے فرمایا: سونے کو سونے کے عوض میں اور چاندی کو چاندی کے عوض میں مت فروخت کرو مگر برابر سرابر اور زائد مت لو۔''

"عن ابی رافع مولی رسول الله ﷺ قال: احتجنا فاخذت خلخال امرأتی فی السنة التی استخلف فیها ابوبکر فلقینی ابوبکر فقال ما هذا فقلت : احتاج الحی الی نفقة فقال ان معی ورقا ارید بها فضة فدعا بالمیزان فوضع الخلخالین فی کفة ووضع الورق فی کفة فشف الخلخالین نحو امن دانق فقرضه، فقلت: یا خلیفة رسول الله ﷺ هو لك حلال، فقال : یا ابارافع انك ان احللته فان الله لا یحله سمعت رسول الله ﷺ یقول : الذهب بالذهب وزنا بوزن والفضة بالفضة وزنا بوزن الزائد والمستزید فی النار۔"

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام ابورافع کہتے ہیں کہ جس سال حضرت ابوبکر صدیقؓ خلیفہ بنے، اس سال ہمیں ضرورت

لاحق ہوئی، تو میں نے اپنی بیوی کا پازیب لیا، راستے میں حضرت ابوبکر صدیقؓ ملے، تو انہوں نے پوچھا کہ یہ کیا ہے میں نے جواب دیا کہ گھر والے خرچے کے محتاج ہوگئے ہیں، اس پر حضرت ابوبکرؓ نے کہا: میرے پاس چاندی کے سکے ہیں، میں ان کے بدلے چاندی کا زیور لینا چاہتا ہوں، پھر انہوں نے ترازو منگوائی اور دونوں پازیب ایک پلڑے میں رکھے، اور چاندی دُوسرے پلڑے میں، پازیب ایک دانق کے بقدر وزن زائد ہوگئے، تو حضرت ابوبکرؓ نے پازیب میں سے اتنی چاندی توڑ دی، میں کہا کہ اے رسول اللہ کے خلیفہ! یہ آپ کے لئے حلال ہے، تو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا: ابورافع! اگر تم اس کو حلال کردو، تو اللہ اس کو حلال نہیں کرتے ہیں، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ سونے کو ہم وزن سونے کے عوض فروخت کرو، اور چاندی کو ہم وزن چاندی کے عوض فروخت کرو، زائد وزن دینے والا اور زائد وزن لینے والا جہنم میں ہوں گے۔"

"عن مجاهد انه قال : كنت مع عبدالله بن عمر فجاءه صائغ فقال يا اباعبدالرحمن انى اصوغ الذهب ثم ابيع الشئى من ذلك باكثر من وزنه فاستفضل من ذلك قدر عمل يدى فنهاه عبدالله بن عمر فجعل الصائغ يردد عليه المسئلة وعبدالله ينهاه حتى انتهى الى باب المسجد او الى دابته يريد ان يركبها ثم قال عبدالله : الدينار بالدينار والدرهم بالدرهم لا فضل بينهما هذا عهد نبينا اليناوعهدنا اليكم۔"

''حضرت مجاہدؒ کہتے ہیں کہ میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے پاس تھا کہ ایک سناران کے پاس آیا اور کہا کہ اے ابوعبدالرحمٰن! میں زیور بناتا ہوں، پھر اس کو زائد سونے کے عوض فروخت کرتا ہوں، اور زائد وزن اپنی مزدوری کے بقدر طے کرتا ہوں، حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اس کو اس طرح کرنے سے منع فرمایا، سنار بار بار اپنا سوال دُہراتا رہا اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ بار بار اس کو منع کرتے رہے یہاں تک کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ مسجد کے دروازے تک آئے یا اپنی سواری تک آئے جس پر ان کو سوار ہونا تھا، پھر حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا کہ دِینار کو دِینارُ کے عوض اور دِرہم کو دِرہم کے عوض فروخت کرو، مگر کسی طرف زائد نہ ہو، اسی کی تعلیم ہمیں ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے دی اور اسی کی تعلیم ہم تمہیں دیتے ہیں۔''

"عن عطا بن یسار ان معاویة بن ابی سفیان باع سقایة من ذهب او ورق باکثر من وزنها فقال له ابو الدرداء سمعت رسول الله ﷺ ینهی عن مثل هذا الا مثلا بمثل فقال له معاویة : ماارى بمثل بذا باسا فقال ابوالدرداء : من یعذرنی من معاویة انا اخبره من رسول الله ﷺ ویخبرنی عن رایه لا اساکنك بارض انت بها ثم قدم ابوالدرداء علی عمر بن الخطاب فذکر له ذلك فکتب عمر الی معاویة الا یبیع مثل ذلك الا مثلا بمثل وزنا بوزن۔"

''عطا بن یسارؒ کہتے ہیں کہ حضرت معاویہ بن ابی سفیانؓ نے سونے یا چاندی کا کٹورا اس سے زائد وزن کے عوض میں فروخت کیا، تو ان سے حضرت ابودرداءؓ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کو اس جیسے سودے سے منع کرتے ہوئے سنا ہے، اِلّا یہ کہ برابر برابر وزن کے ہوں، جواب میں حضرت معاویہؓ نے ان سے کہا کہ میں تو اس میں کچھ حرج نہیں پاتا، اس پر حضرت ابودرداءؓ نے کہا کہ کون مجھے معاویہؓ سے معذور رکھتا ہے میں ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات بتاتا ہوں، اور یہ مجھے اپنی رائے بتلاتے ہیں، پھر حضرت معاویہؓ سے کہا کہ جس جگہ آپ ہوں گے تو وہاں آپ کے ساتھ نہیں رہوں گا، پھر حضرت ابودرداءؓ حضرت عمر فاروقؓ کے پاس (مدینہ منوّرہ) چلے آئے، اور ان سے ساری بات ذِکر کی، تو حضرت عمر فاروقؓ نے حضرت معاویہؓ کو لکھا ایسے سودے نہ کرو، مگر ہم وزن اور برابر سرابر۔" (الکل مأخوذ من اعلاء السنن ۱۴/ ۲۸۹،۲۸۸)

نتیجہ

ان تمام آثار وروایات سے یہ بات اچھی طرح واضح ہوگئی کہ سونے کے تیار زیور کو زائد سونے کے عوض میں اور چاندی کے تیار زیور کو زائد چاندی کے عوض میں فروخت کرنا جائز نہیں، اگرچہ اس اِضافے کو مزدوری کا نام دیا جائے، اس اِضافے کو مزدوری کے طور پر لیا جائے۔

آج کل بھی مسئلہ یہی ہے کہ سونے کے تیار زیور کو زیادہ سونے اور چاندی کے تیار زیور کو زائد چاندی کے بدلے میں فروخت کرنا جائز نہیں، اگرچہ اِضافہ مزدوری کے طور پر ہو، بلکہ مزدوری کی صورت یہ ہے کہ بجائے سونے یا چاندی میں اِضافہ کرنے کے نقد رقم لی جائے، جسے بنوائی کہتے ہیں۔

تفریعات

۱- ایک سنار اپنے یہاں کچھ زیور تیار کرتا ہے جس میں ۲۲ کیرٹ کا سونا لگاتا

ہے، نگینے وغیرہ لگاتا ہے، پھر اس زیور کو دُکاندار کے پاس فروخت کرنے کے لئے لے جاتا ہے، دُکاندار اس زیور کو پسند آنے پر اپنے یہاں رکھ لیتا ہے، پھر مزدوری تو اسی وقت یا کچھ دن کے بعد دے دیتا ہے، اور زیور کے وزن کے مساوی خالص سونا کچھ دن بعد یکمشت یا قسطوں میں ادا کرتا ہے، کیا یہ صورت جائز ہے؟

جواب یہ ہے کہ جس میں کچھ کچھ کھوٹ ملا ہو، لیکن کھوٹ مغلوب ہو، یعنی سونے کی مقدار سے کم ہو، اس کی خرید وفروخت میں اس کا حکم وہی ہوتا ہے جو خالص سونے کا ہوتا ہے جیسا کہ اُوپر مقدمہ ۲ میں گزرا۔ اور اس میں چونکہ دونوں طرف سونا ہے، اس لئے اس کی اُدھار بیع ناجائز ہے، جیسا کہ مقدمہ ۱ میں گزرا۔

اس کی متبادل جائز صورت یہ ہے کہ دُکاندار سنار سے زیور اُدھار روپوں میں خرید لے، اور پھر قیمت یکمشت یا قسطوں میں ادا کرے، یہاں اُدھار جائز ہے، کیونکہ ایک طرف سونا ہے، جو ثمنِ خلقی ہے، اور دُوسری طرف کرنسی ہے جو ثمنِ عرفی ہے، جس کا لین دین بیعِ صَرف نہیں، لہٰذا اس میں اُدھار جائز ہے، بشرطیکہ زیور پر قبضہ ہو جائے، تاکہ بیع الکالی بالکالی لازم نہ آئے۔

۲- سنار حضرات دُکاندار سے آرڈر لے کر یا خود اس کے آرڈر دینے پر اپنے سونے سے مختلف چیزیں بنا کر اسے دے دیتے ہیں، وہ اسے مزدوری اسی وقت یا بعد میں جب سنار کو ضرورت ہو دے دیتا ہے، اور سونا جب سنار کو ضرورت ہو، اور وہ مطالبہ کرے، اس وقت یکمشت یا تھوڑا تھوڑا کر کے دیتا ہے، کیا یہ صورت جائز ہے؟

جواب یہ ہے کہ یہ صورت بھی ناجائز ہے، کیونکہ یہ سونے کی سونے کے عوض بیع ہے، اور اس میں اُدھار ہو رہا ہے، جو بیعِ صَرف ہونے کی وجہ سے ناجائز ہے، اس کا بھی متبادل طریقہ وہی ہے، جو نمبر ۲ میں گزر چکا۔

۳- بہت سے لوگ اپنی رقم لگا کر مکمل زیورات تیار کرنے کا کام کرتے ہیں، ان زیورات میں اصلی جواہرات یا نقلی نگینے جڑے ہوئے ہوتے ہیں، کچھ زیورات بغیر نگینوں

کے ہوتے ہیں یعنی سادہ ہوتے ہیں، تیار زیورات عام طور پر بنانے والے دُکانداروں کے ہاتھ فروخت کرتے ہیں، ان کے لین دین کا مروّجہ طریقہ یہ ہے کہ تمام زیورات کل وزن کی بنیاد پر فروخت کیے جاتے ہیں۔

کل وزن کے بدلے خالص سونا لیا جاتا ہے، اور مزدوری بھی وزن کے حساب سے مقرر ہوتی ہے، عام طور پر فروخت کرنے والے کو خالص سونا اور رقم حاصل ہوتی ہے، اس کا تصوّر یہ ہے کہ کل وزن کے بدلے جو خالص سونا مل رہا ہے، وہ زیور میں موجود ملاوٹ شدہ سونا اس کی چھیجت اور نگینوں کی قیمت کے عوض ملتا ہے، اور نقد رقم مزدوری کے بدلے مل رہی ہے: واضح رہے کہ مزدوری کی رقم کا تعین نگینوں کی عمدہ یا ناقص اقسام اور کام کی عمدہ بناوٹ اور خوبصورتی کی بنیاد پر کیا جاتا ہے۔ تو کیا ملاوٹ شدہ سونے کے بدلے خالص سونا لینا اور نگینوں کے بدلے خالص سونا لینا جائز ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ پہلے تو یہ بات معلوم کر لینا ضروری ہے کہ سنار اپنا زیور دُکاندار کے ہاتھ فروخت کر رہا ہے، دُکاندار کے سونے کے دُکاندار کا مطلوبہ عمل نہیں کر رہا، لہٰذا مزدوری کا جو ذِکر کیا گیا ہے وہ حقیقت میں مزدوری نہیں ہے بلکہ زیور کی قیمت ہی کا ایک حصہ ہے۔

مثلاً پانچ تولے جڑاؤ زیور کے بدلے پانچ تولے سونا اور دو ہزار روپے مزدوری کے نام جو طے ہوئے ہوں، تو درحقیقت پانچ تولے جڑاؤ زیور کی قیمت پانچ تولے خالص سونا اور دو ہزار روپے ہوئی۔

اب اگر زیور جڑاؤ ہے اور نگینے جڑے ہوئے ہیں، اور اس میں ملاوٹ شدہ سونا مثلاً تین تولہ ہو، اور نگینوں کا وزن دو تولہ ہو، تو بشرطیکہ دونوں طرف لین دین نقد و نقد ہو، یا کم از کم زیور کے ساتھ ساتھ اس میں موجود ملاوٹ شدہ سونے کے وزن کے مقابل خالص سونے پر بھی قبضہ جدا ہونے سے پہلے ہو جائے، تو یہ سودا دُرست ہے کیونکہ زیور میں موجود ملاوٹ شدہ سونے کے مقابلے میں اتنی مقدار میں خالص سونا ہو جائے گا، اور نگینوں کے

مقابلے میں دو تولے خالص سونا اور دو ہزار روپے بن جائیں گے۔

لیکن اگر زیور سادہ ہو، تو پھر یہ معاملہ ناجائز اور سودی ہو جائے گا، کیونکہ اس وقت پانچ تولے سادہ زیور کے مقابلے میں پانچ تولے خالص سونا اور دو ہزار روپے ہوں گے، یہ دو ہزار روپے بلا بدل ہو کر سود بن جائیں گے۔

میناکاری والے زیورات کی سونے چاندی کے عوض خرید وفروخت

کچھ زیورات پر میناکاری کی جاتی ہے، مینا ایک خالص قسم کا رنگ دار شیشہ ہوتا ہے، جس کو باریک پیس کر سونے پر چپکایا جاتا ہے، اور بیل بوٹے بنائے جاتے ہیں، ان زیورات کے لین دین میں بھی پورے وزن کے بدلے سونا دیا جاتا ہے، یعنی میناکاری کا وزن کاٹ کر نہیں دیا جاتا، یہ صورت جائز ہے، بشرطیکہ دونوں طرف سے لین دین نقد ہو، اُدھار نہ ہو، قیمت میں سے کم سے کم اتنی مقدار کے سونے پر قبضہ ضروری ہے جتنا کہ زیور میں کھوٹ ملا سونا موجود ہے۔

چند مزید مسائل

۱- دو تولے سونا اور ایک تولہ چاندی کو ایک تولہ سونا اور پچاس تولے چاندی کے عوض فروخت کرنا صحیح ہے، اور یوں سمجھیں گے کہ دو تولے سونا پچاس تولے چاندی کے عوض میں ایک تولہ چاندی ایک تولہ سونا کے عوض میں ہے، ایسا ہم اس وقت سمجھیں گے جب خرید وفروخت کرنے والوں نے اپنی زبان سے کچھ اور نہ کہا ہو، اور اگر انہوں نے کہا کہ دو تولے سونا ایک تولے سونے کے عوض میں اور ایک تولہ چاندی پچاس تولے چاندی کے عوض میں ہے، تو اَب ان کی تصریح کا اِعتبار ہوگا، اور یہ معاملہ سودی ہو جائے گا۔ (سونا، چاندی اور ان کے زیورات کے اسلامی اَحکام، مفتی عبدالواحد، دارالافتاء جامعہ مدنیہ، کریم پارک، لاہور، تاریخ اشاعت ۱۹۹۷ء)۔

۲- اپنی انگوٹھی کسی کی انگوٹھی سے بدل لی، تو دیکھو:

الف:- اگر دونوں پر نگ لگا ہے، تب تو بہر حال یہ بدل لینا جائز ہے، چاہے دونوں کی چاندی یا دونوں سونا برابر ہو یا کم زیادہ، سب دُرست ہے، البتہ ہاتھ در ہاتھ ہونا ضروری ہے۔

ب:- اور دونوں بے نگ ہوں، تو برابر ہونا ضروری ہے، اگر ذرا کمی بیشی ہوگئی ہو، تو سود ہو جائے گا۔

ج:- اگر ایک پر نگ ہو، اور دُوسری سادی ہو، تو اگر سادی میں زیادہ چاندی ہو یہ بدلنا جائز ہے ورنہ حرام اور سود ہے، اسی طرح اگر اسی وقت دونوں طرف لین دین نہ ہو، ایک نے تو ابھی دے دی، دُوسرے نے کہا کہ میں ابھی تھوڑی دیر میں فلاں جگہ سے آ کر دے دُوں گا، تو یہ بھی ناجائز ہے۔ (بہشتی زیور)

۳- ایک (چاندی کا) کامدار دوپٹہ یا ٹوپی وغیرہ دو تولے چاندی کے عوض خریدی گئی، تو دیکھیں گے کہ اس دوپٹے یا ٹوپی میں کتنی چاندی لگی ہے، اگر اس میں مثلاً پانچ تولے چاندی کا کام ہوا ہے، تو پانچ تولے چاندی تو اسی وقت دینا ضروری ہے، اور باقی پانچ تولے چاندی بعد میں بھی دے سکتے ہیں۔

یہی حکم جڑاؤ زیور وغیرہ کی خرید کا بھی ہے، مثلاً جڑاؤ زیور جس میں دو تولے چاندی ہے، پانچ تولے چاندی کے عوض خریدا، تو خریدار پر لازم ہے کہ وُہ دو تولے چاندی تو اسی وقت دے دے، قیمت کے باقی تین تولے بعد میں بھی دے سکتا ہے۔ [1]

چند ناجائز صورتوں کی متبادل جائز صورتیں

۱- کھوٹی اور خراب چاندی دے کر اچھی چاندی خریدنا ہے، اور اچھی چاندی وزن میں کھوٹی کے برابر نہیں مل سکتی، تو اس کی تدبیر یہ ہے کہ پہلے خراب چاندی روپوں میں فروخت کی جائے، اور جو رقم ملے، اس پر قبضہ کرنے کے بعد اس سے اچھی چاندی خریدی جائے۔ [2]

(۲،۱) بہشتی زیور التھانوی (مولانا اشرف علی) کراچی، دارالاشاعت آرام باغ، (ص ۳۹۵)۔

۲- اگر کوئی ایسی چیز ہے کہ چاندی کے علاوہ اس میں کچھ اور بھی لگا ہے، مثلاً جوشن (بازوبند) کے اندر لاکھ بھری ہوئی ہے، اور نونگوں پر نگ جڑے ہیں، انگوٹھیوں پر نگینے رکھے ہیں یا جوشنوں میں لاکھ تو نہیں ہے، لیکن تاگوں میں گندھے ہوئے ہیں، ان چیزوں کو چاندی کے عوض خریدا، تو دیکھو اس چیز میں کتنے وزن چاندی ہے، قیمت کی چاندی کے برابر ہے یا اس سے کم ہے یا زیادہ ہے، اگر قیمت کی چاندی سے اس چیز کی چاندی یقیناً کم ہو، تو یہ معاملہ جائز ہے، اور اگر برابر یا زیادہ ہو، تو سود ہوا، سود سے بچنے کی ترکیب یہ ہے کہ قیمت کی چاندی زیور کی چاندی سے کم رکھو اور قیمت میں باقی روپے شامل کردو، مثلاً دونوں طرف پانچ پانچ تولے چاندی ہو، تو قیمت کی چاندی کو پانچ تولے سے کچھ کم کردو مثلاً ساڑھے چار تولہ کردو اور قیمت میں آدھا تولہ چاندی کے بجائے کچھ روپے مثلاً پچاس روپے ملالو، تو یہ معاملہ جائز ہوجائے گا۔ (۱)

۳- اگر سونے یا چاندی کا زیور یا برتن سونے چاندی کے عوض خریدا، اور اس وقت قیمت دینے کے لئے نہیں ہے، یا اُدھار کرنا مقصود ہے، تو اس کے جائز ہونے کا طریقہ یہ ہے کہ فروخت کنندہ سے اتنا سونا یا چاندی قرضہ لے لو، اور اس قرض سے قیمت کی ادائیگی کردو، پھر قرض بعد میں اُتار دو۔ (۲)

نیارا (زرگروں کی مٹی) کی خرید و فروخت کا مسئلہ

زرگروں کی مٹی جس میں سونے یا چاندی کے ذرّات شامل ہوتے ہیں، اور بعض لوگ اس کو خرید کر اس میں سے سونا چاندی علیحدہ کر لیتے ہیں، اس سے متعلق چند اہم مسائل درج ذیل ہیں:-

۱- روپوں کے عوض میں اس مٹی کی خرید و فروخت جائز ہے۔

۲- مخالف جنس کے عوض بھی خرید و فروخت ہر طرح سے جائز ہے، مثلاً سونے کی

(۱، ۲) بہشتی زیور التھانوی (مولانا اشرف علی) کراچی، دارالاشاعت آرام باغ، (ص ۳۹۵)۔

مٹی چاندی کے عوض اور چاندی کی مٹی سونے کے عوض اگرچہ دونوں طرف کے وزن میں فرق ہو، جائز ہے، البتہ ہاتھ دَر ہاتھ لین دین ضروری ہے۔

۳- سونے کی مٹی سونے کے عوض میں اور چاندی کی مٹی چاندی کے عوض صرف اسی وقت جائز ہے جب دونوں طرف سونے چاندی کا وزن یکساں ہو، اور لین دین بھی ہاتھ دَر ہاتھ ہو، اگر کسی طرف بھی سونا یا چاندی زیادہ ہو، تو بیع دُرست نہیں، خالص سونے چاندی کا وزن بھی مٹی میں ملے سونے چاندی سے زیادہ نہ ہونا چاہئے، کیونکہ اس مٹی کی اپنی کچھ قیمت نہیں ہوتی، لہٰذا اس کے مقابلے میں سونے چاندی میں کچھ کو قیمت کے طور پر نہیں سمجھا جائے گا۔

پُرانے زیور سے نئے زیور کا تبادلہ

۱- گاہک پُرانا مال لاتا ہے، تو اس کی قیمت علیحدہ مقرّر کی جاتی ہے، اور نئے مال کی قیمت علیحدہ مقرّر کی جاتی ہے، اس میں جو فرق ہوتا ہے، صرف اس کا لین دین کرلیا جاتا ہے، تبادلے میں بسا اوقات ایسی صورت بھی پیش آتی ہے کہ مثلاً پُرانے مال کا کل وزن ۶ تولہ ہوتا ہے، اور قیمت پندرہ ہزار روپے مقرّر ہوتی ہے، اور نئے مال کا وزن ۴ تولہ ہوتا ہے، اور قیمت پندرہ ہزار روپے مقرّر طے ہوتی ہے، یعنی صرف مال کا تبادلہ ہوتا ہے، نقد روپوں کا کوئی دخل نہیں ہوتا، واضح رہے کہ پرنے کا مال کا وزن ہمیشہ زیادہ ہوتا ہے، یہ طریقہ ناجائز ہے۔

۲- اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب مذکورہ صورت ناجائز ہوگئی، تو پُرانے زیور کے نئے زیور سے تبادلے کی جائز صورت کیا ہوگی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ کہ جو عام فہم اور آسان طریقہ ہے وہ یہ ہے کہ دُکاندار گاہک سے روپوں میں اس کا پُرانا زیور خرید لے، اور گاہک کو روپے ادا کردے، اس کے بعد گاہک جو نیا زیور خریدے اس کی قیمت اس سے وصول کرلے، اس کے لئے دُکاندار کو

صرف اتنا اہتمام کرنا پڑے گا کہ اپنے پاس نقدی کی ایک مقدار حاضر رکھنی پڑے گی، لیکن یہ کوئی مشکل بات نہیں۔

اگر زیور کا زیور سے تبادلہ کرنا ہو، تو مندرجہ ذیل چند اُصول کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے:-

الف:- اگر دونوں طرف زیور سادہ ہو، اور دُکاندار کا زیور گاہک کے زیور کے وزن کے مساوی ہو، یا اس سے وزن میں کم ہو، اور دُکاندار مزید گاہک سے کچھ لینا چاہتا ہو، تو اپنے زیور کے ساتھ (Immitation) کی مثلاً بالیاں ساتھ کردے۔

اور اگر دُکاندار کا زیور گاہک کے زیور سے زیادہ وزن کا ہے، تو دُکاندار گاہک سے زائد روپے بھی لے سکتا ہے۔

ب:- اگر زیور جڑاؤ ہو، تو ہر طرح سے زیور کا زیور کے بدلے تبادلہ جائز ہوگا، اس وقت ایک طرف کا زائد سونا بمعہ روپے کے (اگر ہو) دُوسرے کے نگینوں کی قیمت ہوجائے گی، ایسا دونوں طرف سے سمجھا جائے گا۔

ج:- اگر ایک طرف سادہ زیور ہو اور دُوسری طرف جڑاؤ ہو، اور دُکاندار گاہک سے مزید لینا چاہتا ہو تو:-

۱- اگر جڑاؤ زیور دُکاندار کا ہو، اور سادہ زیور گاہک کا ہو، تو خواہ گاہک کے زیور کا سونا دُکاندار کے زیور میں موجود سونے سے کم ہو یا زیادہ ہو، یا اس کے برابر ہو، ہر صورت میں زائد روپے لینا جائز ہے۔

۲- اگر سادہ زیور دُکاندار کا ہو، اور جڑاؤ گاہک کا ہو، تو اگر گاہک کے زیور میں سونا دُکاندار کے سونے سے کم ہو، تو دُکاندار گاہک سے روپے لے سکتا ہے، اور اس کے زیور میں موجود مساوی سونا ہو، یا زائد ہو، تو دُکاندار گاہک سے مزید روپے نہیں لے سکتا۔

پیشگی سودا لیکن لین دین بیک وقت

۱- آج سونے کا بھاؤ مثلاً دس ہزار روپے فی تولہ ہے، سودا ابھی کریں، مال تھوڑی

دیر بعد ملے گا، ادائیگی جس وقت مال ملے گا فوری ہوگی، ادائیگی کے وقت تک اکثر بھاؤ میں کمی بیشی ہوجاتی ہے، ایسی صورت میں ادائیگی کے وقت جو بھاؤ ہے اس کے مطابق ادائیگی ہوگی یا طے شدہ بھاؤ سے ہوگی، اس سلسلے میں عرض یہ ہے کہ یہ طریقہ اگر بیع کے طریقے پر ہو، تو ناجائز ہے، کیونکہ یہ دَین کے عوض دَین کی بیع ہے، جو ممنوع ہے، البتہ اگر اس کو وعدے کے طریقے پر کیا جائے، تو صحیح ہوسکتا ہے، یعنی فریقین آپس میں یہ وعدہ کرلیں کہ فلاں دن ہم یہ بیع کریں گے، اور پھر اس وقت یعنی لین دین کرلیا جائے، جس قیمت کا آج وعدہ کیا ہے، لین دین کے وقت اسی کا اعتبار ہوگا، اور باہمی رضامندی سے چاہیں، تو قیمت میں کمی بیشی بھی کرسکتے ہیں۔

۲- اس کے علاوہ مختلف طریقوں سے سودے کئے جاتے ہیں، مثلاً:-

الف:- یہ کہ سونے کا بھاؤ موجودہ بھاؤ سے دس پندرہ روپے فی تولہ سے کم یا زیادہ لیا جائے گا، لیکن مال اگلے روز ملے گا، اور ادائیگی مال ملنے پر کل ہی کی جائے گی۔

ب:- سونے کا بھاؤ موجودہ بھاؤ سے ۲۵ روپے تولہ کم یا زیادہ ہوگا، لیکن مال سات دن کے اندر اندر فروخت کرنے جب چاہے خریدار کے حوالے کرے گا، اور ادائیگی اسی وقت کرنا ہوگی۔

ج:- سونے کا بھاؤ موجودہ بھاؤ سے مزید کچھ کم یا زیادہ لیا جائے گا، مگر شرط یہ ہے کہ سودا ابھی طے کریں، لیکن مال سات دن کے اندر اندر خریدنے والا جب چاہے منگواسکتا ہے، ادائیگی مال ملنے پر فوراً ہوگی۔

یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ تمام سودے زبانی ہوتے ہیں، اور کوئی گواہ بھی نہیں ہوتا، مندرجہ بالا معاہدوں میں کسی ایک فریق کی طرف سے انکار کی صورت میں بھاؤ کا فرق مانگ لیا جاتا ہے، معاملے کے یہ تمام طریقے ناجائز ہیں، اور کسی ایک فریق کے انکار پر دُوسرے کا اس سے بھاؤ کا فرق لینا کھلا سود ہے۔

ٹانکے کا مسئلہ

زیور بنانے کے لئے سونے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو جوڑ کر مختلف چیزیں تیار کی جاتی ہیں، جوڑنے کے لئے ٹانکا استعمال ہوتا ہے جو کہ ضروری ہے، ٹانکے کی تفصیل یہ ہے کہ وہ ایسا سونا یا ایسی دھات ہو جو زیور کے سونے سے پہلے پگھل جائے، اور دو ٹکڑوں کو آپس میں جوڑ دے۔

ٹانکہ بنانے کے لئے سونے میں مزید ملاوٹ کرنی پڑتی ہے جو زیورات کو جوڑنے کے بعد اُن میں موجود رہتی ہے، کاریگر حضرات سے جب زیورات لئے جاتے ہیں، تو مکمل وزن کر کے لئے جاتے ہیں، اور ان کے بدلے پورا سونا دیا جاتا ہے، نظریہ یہ ہوتا ہے کہ ٹانکے کے بدلے کا سونا زیور بنانے کی چھیجت کے طور پر دِیا جاتا ہے۔

ٹانکے کی دُوسری قسم بھی ہے، کاڈیم (Cadamium) ایک قسم کی دھات ہے جس کی تھوڑی سی مقدار سونے میں ملانے سے حسبِ ضرورت ٹانکہ حاصل ہو جاتا ہے، زیور بنانے کے لئے بہت سے لوگ مذکورہ ٹانکہ استعمال کرواتے ہیں، اور چھیجت کی مد میں مقررہ شرح سے کاریگر کو اضافی سونا دیتے ہیں۔

ٹانکے کے بدلے خالص سونا لینا جائز ہے، لیکن مذکورہ تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ کہ زیور اور ٹانکے کے بدلے خالص سونا اتنے ہی وزن کا لیا جاتا ہے، اور مزدوری اس کے علاوہ ہوتی ہے، چونکہ دُکاندار کاریگر کو اپنا سونا دے کر زیور نہیں بنوا رہا ہے بلکہ کاریگر کو زیور کے بدلے سونا دے رہا ہے، لہٰذا یہ زیور کی سونے کے عوض میں بیع ہے، جس میں برابری اور نقد دَر نقد ہونا ضروری ہے، اور وزن جب دونوں طرف کا برابر ہو گیا، تو مزدوری بلاعوض ٹھہرے گی، اور سود بن جائے گی، لہٰذا یہ سودا روپوں میں ہونا چاہئے، ورنہ معاملہ سود کا ہو جائے گا اور سود کا گناہ ہوگا۔

اگر بغیر ٹانکہ لگائے زیور تیار ہو سکتا ہے پھر بھی کوئی اپنے فائدے کے لئے

مناسب حد تک ٹانکہ لگائے، کیا یہ جائز ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ سنار ٹانکے کے مقابلے میں خالص سونا لیتا ہے، لہٰذا جہاں ٹانکے کی ضرورت ہو، وہاں تک تو جائز ہے، اور اگر ضرورت نہ ہو، تو ٹانکہ لگا کر گاہک یا دُکاندار کو جہاں ٹانکے کی ضرورت نہیں ہے وہاں ٹانکے کی ضرورت ظاہر کر کے دھوکا دیتا ہے جو مسلمان کی شان کے خلاف ہے، اس لئے مذکورہ صورت ناجائز ہے۔

چھیجت (Wastage)

یہ ایک مُسلّمہ حقیقت ہے کہ زیور بنانے کے ہر ہر مرحلے میں سونا گھٹتا ہے، یعنی ضائع ہوتا ہے یہ ضیاع سونے کے باریک باریک ذرّات کی شکل میں ہوتا ہے، جن کو مکمل طور پر جمع نہیں کیا جاسکتا، اس حقیقت کو سمجھتے ہوئے بازار میں لوگوں نے اس گھٹت کی شرحیں مقرر کردی ہیں مثلاً کاریگر اگر ایک تولے کا زیور بنا کر دیتا ہے، تو اس کو اس پر ایک ماشہ چھیجت دی جاتی ہے، یعنی ایک ماشہ اضافی سونا دیا جاتا ہے۔

الف:- کاریگر کو زیور بنانے کے دوران جو سونا گھٹنے کی صورت میں نقصان ہوتا ہے، اس کی مقدار کبھی مندرجہ بالا شرح سے کچھ زیادہ ہوتی ہے، اور کبھی کچھ کم ہوتی ہے۔

اگر زیور بنانے میں اس کے پاس سونا کم گھٹتا ہے، تو اس کو کچھ سونا بچ جاتا ہے اور اگر گھٹت مقرّرہ شرح سے زیادہ ہوتی ہے، تو نقصان ہوتا ہے، مگر چھیجت اس کو مقرّرہ شرح کے مطابق ہی دی جاتی ہے، واضح رہے کہ ایک زیور بنانے میں کل کتنا سونا گھٹتا ہے، اس کا پورا پورا حساب رکھنا مشکل ہے۔

ب:- چھیجت کی مقرّرہ شرحوں میں ایک بات یہ بھی ہے کہ بہت سے زیورات ایسے بھی ہوتے ہیں جن میں گھٹت بالکل نہیں ہوتی، مگر دی جاتی ہے۔

ج:- اور کچھ زیور ایسے بھی بنتے ہیں جن میں گھٹت ہوتی ہے مگر چھیجت نہیں دی جاتی، اب ان صورتوں کا شرعاً کیا حکم ہے؟

ہم نے اس مسئلے پر خاصا غور کیا، تو معلوم ہوا کہ چھیجت کا مسئلہ بذاتِ خود کوئی پیچیدہ مسئلہ نہیں ہے، اس مسئلے کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں:-

پہلی صورت

کاریگر نے اپنے سونے سے زیور بنایا اور دُکاندار کے ہاتھ فروخت کیا، پھر یا تو کل روپوں کے عوض میں فروخت کیا، یا اس کے عوض سونا لیا۔

سونے کے عوض فروخت کرنا

کاریگر نے مثلاً تین تولے زیور بنایا، تقریباً تین ماشے چھیجت ہوئی، تو کاریگر کو یہ تین تولے تین ماشے کا پڑا، مزدوری کے دوسو روپے فی تولہ ہوئے، سونا پانچ ہزار روپے تولہ ہو تو کل لاگت ۱۶۸۵۰ روپے ہوئی، کاریگر ریٹ بتاتے ہوئے دُکاندار کو چھیجت کی شرح بتا بھی دے، تو دیانت داری کو ملحوظ رکھتے ہوئے بتانے میں کچھ حرج نہیں ہے، البتہ زیور کا سودا کل ۱۶۸۵۰ روپے کے عوض ہو، یوں تفصیل کے ساتھ بل نہ بنائے کہ تین تولے سونے کے ۱۵۰۰۰ روپے اور چھیجت کے تین ماشے کے ۱۲۵۰ روپے اور مزدوری کے ۶۰۰ روپے، کیونکہ ہو سکتا ہے کہ چھیجت فی الواقع تین ماشے سے کم ہو اور یوں کاریگر غلط بیانی کا مرتکب ہو جائے۔

اگر ایسا زیور ہو جس میں گھٹت نہیں ہوتی مگر دی جاتی ہے تو اس صورت میں بھی تین تولے کے زیور کی قیمت ۱۶۸۵۰ روپے بتائی جائے، ریٹ بتاتے ہوئے تفصیل کو ذِکر کرنے میں کوئی حرج نہیں، لیکن جب دُکاندار کاریگر کو کہتا ہے کہ یہ زیور مجھے دے دو، تو اس وقت سودا ۱۶۸۵۰ روپے میں ہونا طے پائے، بہتر ہے کہ دُکاندار یوں کہہ دے کہ میں نے ۱۶۸۵۰ روپے میں خریدا یا کاریگر یوں کہے کہ یہ میں نے تمہارے ہاتھ ۱۶۸۵۰ روپے میں فروخت کیا، یا یہ میں نے تمہیں ۱۶۸۵۰ روپے میں دیا۔

اگر زیور میں گھٹت ہوتی ہے مگر چھیجت نہیں دی جاتی، تو اس صورت میں کل

روپوں میں جو قیمت طے پائے اس کے عوض فروخت کیا جائے۔

غرض کاریگر جب اپنے سونے سے زیور بنائے، تو وہ اس زیور کو جتنا ہے اور جیسا ہے کی بنیاد پر دُکاندار کو فروخت کرسکتا ہے۔

سونے کے عوض فروخت کرنا

اگر زیور سادہ ہو اور مثلاً ۲۰ کیرٹ کا ہو، تو اس کو خالص سونے کے عوض فروخت کرسکتا ہے، البتہ یہ ضروری ہے کہ دونوں طرف کا سونا برابر وزن کا ہو، اور لین دین دونوں طرف ہاتھ دَر ہاتھ ہو، نہ تو اُدھار ہو اور نہ ہی چھیجت وغیرہ کے نام پر زائد سونا یا رقم ہو۔

اور اگر زیور جڑاؤ ہو، تو زائد وزن پر بھی فروخت کیا جاسکتا ہے، لیکن زیور میں جتنا سونا ہے اس کے بقدر عوض کے سونے پر قبضہ کرنا آپس میں جدا ہونے سے پہلے ضروری ہے۔

دُوسری صورت

کاریگر نے دُکاندار کے سونے سے زیور بنا کر دُکاندار کو دِیا ہو، اس صورت میں چونکہ کاریگر اَجیر ہے، اور اس کو اپنے کام کی اُجرت ملتی ہے، لہٰذا چھیجت کا اعتبار کرتے ہوئے اُجرت طے کی جاسکتی ہے، البتہ چھیجت کو اُجرت کا جزو نہیں بنایا جاسکتا، کیونکہ جیسا کہ اُوپر مذکور ہوا کہ چھیجت میں کمی بیشی ہوتی ہے، لہٰذا مجہول مقدار میں ہے، پھر دُکاندار کاریگر کو چھیجت کا سونا ہبہ کرے۔

تیسری صورت

یہ ہے کہ دُکاندار نے کاریگر کو زیور بنانے کے لئے سونا دیا اور کاریگر نے اپنے سونے سے زیور بنایا، چونکہ اس طرح کا بھی رواج ہے، اس لئے رواج وعرف کو دلیل بنا کر سمجھا جائے گا کہ دُکاندار نے اپنا سونا کاریگر کو قرض دیا ہے، اور بنے ہوئے زیور کو قرض میں سے وصول کیا ہے، یہ صورت بھی دُوسری صورت کی طرح ہوگی اور دُکاندار

چھیجت کاریگر کو ہبہ کردے۔

دُکاندار جب آگے گاہک کو زیور فروخت کرتا ہے، تو وہ بھی تفصیلی بل بناتے ہوئے پالش یا چھیجت اور مزدوری ذِکر کرتا ہے، اور دُکاندار نے کاریگر کو ایک تولے پر ایک ماشہ چھیجت دی ہوتی ہے، جبکہ وہ خود گاہک سے ڈیڑھ ماشہ چھیجت وصول کرتا ہے، چونکہ چھیجت کا ایک خاص مطلب ہے یعنی زیور بناتے ہوئے سونے میں جو گھٹت ہوئی لہٰذا یہ صحیح نہیں کہ دُکاندار اپنے گاہک کو چھیجت میں واقع سے زیادہ مقدار بتائے، وہ اپنی مزدوری یا نفع کے نام سے عوض لے سکتا ہے، مثلاً تین تولے سونا ہے اور تین ماشے چھیجت ہے، تو ایک صورت تو یہ ہے کہ دُکاندار تین تولے سونا اور ساڑھے چار ماشے چھیجت لگائے اور مزدوری کے ڈیڑھ ہزار روپے لگائے، اور دُوسری صورت یہ ہے کہ وہ تین تولے سونا اور تین ماشے چھیجت اور ۲۱۲۵ روپے مزدوری کے لگائے، نتیجہ ایک ہی ہے، لیکن پہلی صورت میں غلط بیانی ہوگی کہ بجائے ایک ماشہ تولے کے ڈیڑھ ماشہ تولے چھیجت لگائی، متبادل جائز طریقے کو اِختیار کرنا کچھ مشکل نہیں۔

سونے چاندی کے کاروبار میں بعض مروّج جدید طریقے

پہلا طریقہ

آج کل فاریکس (Forex) اور کامیکس (Comex) کے نام سے کاروبار کرنے والی نئی کمپنیاں وجود میں آئی ہیں، اس کاروبار کی جو تفصیلات سامنے آئی ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کاروبار کی وہ تمام تر صورتیں جو عام طور سے اختیار کی جاتی ہیں ناجائز ہیں۔

کاروبار کا طریقۂ کار

ایک شخص دس ہزار ڈالر کمپنی میں جمع کرا کے اس سکیم کا رُکن بن سکتا ہے، کمپنی والے پھر اس کی رہنمائی کرتے ہیں کہ وہ کب اور کونسی کرنسی یا جنس خرید لے کہ جس کو بعد میں فروخت کر کے نفع کی اُمید کی جاسکتی ہے، ہر کرنسی یا شئی کی خرید کی کم سے کم مقدار مقرر

کی ہوئی ہے جس کو "لاٹ" (Lot) کہتے ہیں، مثلاً باسٹھ ہزار پانچ سو برطانوی پاؤنڈ کی یا ایک لاکھ پچیّس ہزار جرمن مارک کی ایک لاٹ ہوتی ہے، اشیاء میں کپاس، چینی، اور گندم اور زَر میں سونا اور چاندی شامل ہے۔ سونے کی لاٹ ایک سو اونس اور چاندی کی لاٹ پانچ ہزار اونس پر مشتمل ہوتی ہے۔

جب آپ کسی کرنسی یا مذکورہ اشیاء میں سے کسی ایک کی کوئی ایک لاٹ خریدنا چاہیں، اور کمپنی کو اپنا آڈر دیں، تو کمپنی ان جمع دہ دس ہزار ڈالر میں سے دو ہزار ڈالر بطور بیعانہ یا تحفظ کے مختص کر لیتی ہے، اور آرڈر مرکزی دفتر کو پہنچا دیتی ہے جو آرڈر کی تکمیل کر کے لاٹ کی خرید کی اطلاع دیتا ہے۔

یہ خرید بھی دو طرح کی ہوتی ہے، ایک نقد جس کو "Cash Trading" یا "Spot Trading" کہتے ہیں، اور دُوسری مستقبلیات کی بیع ہوتی ہے، جس کو "Future Trading" کہا جاتا ہے، نقد میں تو مبیع خریدی ہوئی شئ پر فوری قبضہ مل سکتا ہے، جبکہ مستقبلیات میں یہ طے پاتا ہے کہ کہ بائع ایک مقررہ مدّت بعد طے شدہ مہینے میں فلاں تاریخ کو وہ لاٹ مہیا کرے گا، قیمت بھی طے کر لی جاتی ہے۔

اس کاروبار میں کمپنی کا کردار

اس کردار کی وضاحت ایک کمپنی (Empire Resources) نے اس طرح کی ہے:-

> The objects for which the Company is established are as follows:
> To install equipment operate and provide faciliteis of communication through monitors and appratice link up to as a commission house between the clienets and brokerage house in the various finance trading centres of the world.

اس عبارت کا حاصل یہ ہے کہ کہ کمپنی اپنے موکلین اور دُنیا کے مختلف تجارتی مراکز

میں موجود دلالوں کے درمیان کمیشن ایجنٹ کے طور پر کام کرتی ہے۔

ہر سودا جو کمپنی کراتی ہے اس پر وہ پچاس یا ساٹھ ڈالر کمیشن لیتی ہے، خواہ سودے میں موکل کو نفع ہو یا نقصان ہو یا نہ نفع ہو یا نہ نقصان۔

پھر جو لاٹ خریدی، اگر خریداری کے دن ہی فروخت کردی گئی، تو کمپنی صرف کمیشن وصول کرے گی، اور اگر فروخت میں کچھ دن لگ گئے، تو کمپنی کمیشن کے علاوہ پانچ یا چھ ڈالر یومیہ کے حساب سے سود بھی وصول کرے گی، بعض صورتوں میں موکل کو سود ملتا ہے، Empire Resoureces کی وضاحت یوں ہے:-

Interest /Premium are paid of charged basing on the number of days for a position trade.

کاروبار کی اَقسام

قسمِ اوّل Spot/Cash Trading

کمپنی کی اپنی وضاحت کے مطابق وہ اپنے موکلین اور دلالوں کے درمیان رابطہ کراتی ہے، اور کمیشن پر سودے کرواتی ہے، اس صورت میں سودا موکل اور تجارتی مرکز میں موجود دلال کے مابین ہوتا ہے، لیکن چونکہ موکل پوری رقم کی ادائیگی تو کرتا ہے نہیں، لہٰذا کرنسی اور سونے چاندی کی خرید کی صورت میں سودا دو وجہ سے ناجائز ہے:-

الف: یہ بیع الدین بالدین ہے، بائع اور خریدار دونوں کی طرف سے قرض ہے، کیونکہ نہ تو بائع نے خریدار کو خرید کردہ پر قبضہ دیا، اور نہ ہی خریدار نے قیمت کی ادائیگی کی، اور بیع الدین بالدین ناجائز ہے۔ چنانچہ الدر المختار میں ہے:-

فی الدر المختار: باع فلوسا بمثلها او بدراهم او بدنانير فان نقد احدهما جاز وان تفرقا بلاقبض احدهما لم يجز۔

فلوس فلوس کے بدلے میں فروخت کئے، یا فلوس کو دَراہم کے بدلے فروخت کئے، یا دَنانیر کے عوض فروخت کئے، اگر فریقین میں سے

کسی ایک فریق نے ادائیگی کی، تو سودا دُرست ہے، اور اگر ادائیگی کے بغیر دونوں الگ الگ ہوگئے، تو یہ سودا جائز نہیں۔ (۱)

اس کی وجہ علامہ شامیؒ نے یہ بیان فرمائی:-

لانه يكون افتراقا عن دين بدين وهو غير صحيح

کیونکہ یہ دَین کے بدلے میں دَین ہے، جو دُرست نہیں۔ (۲)

ب:- خرید پر جتنے دن گزریں گے، خریدار یعنی موکل یومیہ کے حساب سے سود ادا کرے گا، یہ بھی حرام ہے۔

اور اگر اس کے برعکس ہم یہ فرض کرلیں کہ کمپنی خود لاٹ خرید لیتی ہو، یا اس کے پاس موجود ہو، تو پھر اس کی دو صورتیں ہیں:-

الف:- کمپنی اپنے لئے خریدتی ہو اور پھر خود موکل کے ہاتھ فروخت کرتی ہو تو اس میں مذکورہ دونوں خرابیاں تو ہیں ہی، ان کے علاوہ یہاں کمپنی کمیشن بلا وجہ لے رہی ہے۔

ب:- کمپنی موکل کے لئے خریدتی ہو اور اپنے پاس سے مکمل ادائیگی کر کے مبیع پر قبضہ کرلیتی ہو، اس صورت میں اگرچہ یہ بیع الدین بالدین تو نہیں بنتی، لیکن سود سے بچاؤ تو اس میں بھی نہیں۔

قسمِ ثانی Future Trading

یہ اگرچہ بیعِ سلم کی شکل ہے، لیکن اس میں بیعِ سلم کی بعض شرائط نہیں پائی جاتیں، یعنی یہ کہ سودا طے پانے کی مجلس میں رأس المال کی ادائیگی نہیں ہوتی۔

علاوہ ازیں بیعِ سلم میں یہ ضروری ہے کہ جب تک مسلم فیہ (خرید کردہ سامان) پر قبضہ نہ ہوجائے، اس میں کسی قسم کا تصرف نہ کیا جائے، لیکن زیرِ بحث کاروبار میں اصل یہی ہے کہ مسلم فیہ پر قبضہ کئے بغیر مہیا کئے جانے کی تاریخ سے قبل ہی اس کو آگے فروخت کردیا

(۱) الدر المختار (۵/۱۷۹)

(۲) رد المحتار (۵/۱۷۹)

جاتا ہے، الدر المختار میں ہے:-

ولا یجوز التصرف للمسلم الیه فی راس المال ولا لرب السلم فی المسلم فیه قبل قبضه بنحو بیع الخ

مسلم الیہ کے لئے رأس المال میں اور ربّ السلم کے لئے مسلم فیہ میں قبضے سے قبل خرید وفروخت جیسے تصرفات جائز نہیں۔ (۱)

یہ خرابیاں اس صورت میں ہیں جب خرید کردہ کرنسی یا اجناس واشیاء ہوں، اور اگر خرید کردہ چیز سونا یا چاندی ہو، تو اس میں بیعِ سلم جائز ہی نہیں، کیونکہ بیعِ سلم مثمن میں ہوتی ہے، ثمن میں نہیں ہوتی۔ بدائع میں ہے:-

واما السلم فی الفلوس عددا فجائز عندابی حنیفة وابی یوسف وعند محمد لا یجوز بناء علی ان الفلوس اثمان عنده فلایجوز السلم فیها کما لا یجوز السلم فی الدراهم والدنانیر۔

جہاں تک فلوس میں عدد کے اعتبار سے سلم کا تعلق ہے، تو یہ حضرات اِمام ابوحنیفہ اور ابو یوسف رحمہما اللہ کے نزدیک جائز ہے، اور اِمام محمدؒ کے نزدیک جائز نہیں، کیونکہ فلوس اثمان ہیں، تو ان میں بیعِ سلم جائز نہیں ہوگی، جیسا کہ دَراہم اور دَنانیر میں بیعِ سلم جائز نہیں۔ (۲)

Future contracts are firm commitments to make or accept delivery of a specified quantity and quality of a commodity during as specific month in the future at a price agreed upon at the time the commitments was made . The unique attraction of future contracts is that they offer an efficient and affordable way of participating in the commodities

---

(۱) الدر المختار (۲۱۸/۵)

(۲) بدائع الصنائع (۲۰۸/۵)

markets without all the complications associated with owning the physical matereriol -such as arranging for delivery . Storage and insurance.
Less than three percent of all future contracts traded each year result in delivery of the undrlying commodity. Instead traders genrally offset their futrure positions before their contract muture realsizing the profit of loss which is the diference between the initial purchase or sale price and the price of the offsetting transaction.

دُوسرا طریقہ: ایک اور مروّجہ صورت

کاروبار کی ایک شکل جو آج کل رائج ہے کہ مثلاً ایک مہینے کے اُدھار پر سونے کی ایک مخصوص مقدار مثلاً دس تولے کا سودا کرلیا جاتا ہے، خریدار سونے پر قبضہ نہیں کرتا جب ادائیگی کی تاریخ آتی ہے، تو سونے کے اس دن کے نرخ کو دیکھ لیا جاتا ہے، خرید کے دن اور ادائیگی کے دن کے سونے کے نرخوں میں جو فرق ہوتا ہے، اس کی ادائیگی کر دی جاتی ہے، مثلاً خرید کے دن سونے کا نرخ پانچ ہزار روپے تولہ تھا، ادائیگی کے دن پانچ ہزار ایک سو روپے تولہ ہوگیا تو خریدار بائع سے ایک سو روپے فی تولہ کے حساب سے ایک ہزار روپے وصول کرلے گا، اور اگر نرخ گر کر چار ہزار نو سو رہ گیا تو خریدار بائع کو ایک ہزار روپے دے گا نہ تو مشتری سونے پر قبضہ کرتا ہے نہ بائع قیمت پر قبضہ کرتا ہے بس نرخ میں کمی بیشی سے جو فرق آتا ہے اس کا لین دین کر لیتے ہیں، کاروبار کی یہ شکل بالکل ناجائز اور حرام ہے جیسا کہ مقدمہ ۴ میں اس کی وجہ گزر گئی۔ (۱)



(۱) سونے چاندی کے یہ مسائل زیادہ تر رسالہ ''سونا چاندی اور ان کے زیورات کے اسلامی اَحکام مؤلفہ ڈاکٹر مفتی عبدالواحد'' سے لئے گئے ہیں، دارالافتاء جامعہ مدنیہ، کریم پارک، راوی روڈ لاہور پاکستان۔

باب پنجم

کرنسی اور فلوس کا تبادلہ

بیعِ صَرف اور فلوس

باب چہارم کے شروع میں یہ بات تفصیل سے گزر چکی ہے کہ ''بیعِ صَرف'' کے لئے حنفیہ، شافعیہ اور حنابلہ کے ہاں عوضین کا ثمن خلقی ہونا ضروری ہے، چند عبارات بمع ترجمہ یہاں بھی ملاحظہ ہوں:-

علامہ حصکفیؒ فرماتے ہیں:-

"وشرعاً بيع الثمن بالثمن اى ماخلق للثمنية، ومنه المصوغ جنسابجنس اوبغير جنس۔"

''اور شریعت میں بیعِ صَرف عبارت ہے ثمن کی ثمن کے ساتھ خرید و فروخت سے، یعنی جو خلقی طور پر ثمن ہو، اور اسی سے بنا ہوا برتن بھی ہے، خواہ جنس کا مقابلہ جنس کے ساتھ ہو، یا خلافِ جنس کے ساتھ ہو۔''(۱)

علامہ مرغینانی فرماتے ہیں:-

"سواء كانا يتعينان كالمصوغ اولا يتعينان كالمضروب، اويتعين احدهماولا يتعين الاخر، لاطلاق ماروينا، ولانه

(۱) الدرالمختارللحصكفي شرح تنوير الابصار للتمرتاشي ومتن رد المحتار لابن عابدين المعروف بالشامي (۴۰۲/۷)

ان كان يتعين ففيه شبهة التعيين لكونه ثمنا خلقةً فيشترط قبضه اعتبارا للشبهة في الربا۔"

''چاہے عوضین متعین کرنے سے متعین ہوتے ہوں، مثلاً دونوں طرف برتن ہوں، یا متعین نہ ہوتے ہوں، مثلاً دونوں طرف سکہ ہوں، یا ایک عوض متعین ہوتا ہو، اور دُوسرا نہ ہوتا ہو، (یہ سب صورتیں بیعِ صَرف میں داخل ہیں)، ایک تو حدیث مطلق ہے، اور دُوسری بات یہ کہ یہ چونکہ خلقی ثمن ہے، تو اس میں تعین کے باوجود شبہ پایا جاتا ہے، اس لئے شبہ رِبا کی وجہ سے اس میں تقابض کو ضروری قرار دِیا۔''(۱)

جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر ایک طرف سونے یا چاندی کا برتن یا زیور ہو، اور دُوسری طرف بھی سونے یا چاندی کا برتن یا زیور ہو، یا دونوں طرف دَراہم یا دَنانیر ہوں، یا ایک طرف دِرہم یا دِینار ہو، اور دُوسری طرف سونے یا چاندی کا برتن یا زیور ہو، تو یہ تمام صورتیں بیعِ صَرف کی ہیں، کیونکہ یہ تمام ثمن خلقی ہیں، لہٰذا ان تمام صورتوں میں تقابض ضروری ہوگا۔

علامہ نسفیؒ فرماتے ہیں:-

"وغالب الغش ليس في حكم الدراهم والدنانير فيصح بيعها بجنسها متفاضلا والتبايع والاستقراض بما يروج عددا او وزنا او بهما ولا يتعين بالتعيين لكونها اثمانا۔"

''کھوٹ اگر غالب ہو، تو اس صورت میں یہ دَراہم یا دَنانیر کے حکم نہیں ہوں گے، لہٰذا ان کی ہم جنس کی بیع زیادتی کے ساتھ جائز

---

(۱) الهداية مع الفتح، المرغيناني (شيخ الاسلام برهان الدين ابو الحسن ابوبكر المرغيناني المتوفى ۵۹۳ھ) كوئٹه، پاكستان، مكتبه رشيديه (۲۶۱/۶)۔

ہوگی، اور رِواج کے مطابق ان کی خرید وفروخت اور قرض کا معاملہ وزن یا عدد کے اعتبار سے دُرست ہوگا، البتہ یہ متعین کرنے سے متعین نہیں ہوں گے، کیونکہ یہ اثمان ہیں۔"[1]

اس پر علامہ ابنِ نجیمؒ فرماتے ہیں:-

"قوله : "ولا يتعين بالتعيين لكونها اثمانا"يعني مادامت تروج لانها بالاصطلاح صارت اثمانا، فمادام ذلك الاصطلاح موجودا، لا تبطل الثمنية لقيام المقتضى-"

"صاحبِ ہدایہ کی یہ بات کہ "یہ متعین کرنے سے متعین نہیں ہوتے، کیونکہ یہ اثمان ہیں" یعنی جب تک مروّج ہوں، کیونکہ یہ لوگوں کی اِصطلاح سے اثمان بنے ہیں، سو جب تک یہ اِصطلاح باقی رہے گی، اس کی ثمنیت بھی باقی رہے گی، اس لئے کہ مقتضی موجود ہے۔"[2]

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر سونے یا چاندی میں کھوٹ غالب ہو، اور سونا یا چاندی کم ہو، اور وہ مروّج بھی ہو، تو ان کی بیع کمی بیشی کے ساتھ جائز ہے، اگرچہ عوضین ہم جنس کیوں نہ ہوں، لیکن اس کے باوجود یہ متعین کرنے سے متعین نہیں ہوں گے، کیونکہ یہ اثمان ہیں لیکن اثمان عرفیہ ہیں۔

اس سے یہ بات صاف طور پر معلوم ہوئی کہ اس میں ثمن کا مقابلہ ثمن کے ساتھ ہے، لیکن چونکہ یہ ثمن خلقی نہیں، اس لئے اس کو بیعِ صرف سے نکالا اور اس میں وحدتِ جنس

---

(۱) كنز الدقائق مع البحر، النسفي (الامام ابو البركات عبد الله بن احمد بن محمود المعروف بحافظ الدين النسفي المتوفى ۷۱۰ هـ) بيروت، دارالكتب العلمية، طبع اول ۱۴۱۸ھ (۶/۳۳۵)-

(۲) ایضًا-

کے باوجود تفاضل (زیادتی) کو جائز قرار دیا۔

فقہائے حنفیہ کی ان عبارات سے یہ بات صاف طور پر سامنے آتی ہے کہ بیعِ صَرف کے لئے صرف ثمن کا ہونا کافی نہیں، بلکہ ضروری ہے کہ وہ ثمنِ خلقی ہو، البتہ ثمنِ خلقی کسی بھی شکل میں ہوسکتا ہے۔

البتہ عدمِ تعیین کے لئے کسی شی کا صرف ثمن ہونا کافی ہے۔

حنابلہ کی مشہور کتاب ''کشاف القناع'' میں ہے:-

"فصل في المصارفة، وهي بيع نقد بنقد، اتحد الجنس او اختلف۔"

''مصارفہ زَر کے مقابلے میں زَر کی خرید وفروخت کو کہتے ہیں، خواہ جنس ایک ہو، یا مختلف ہو۔''(1)

یہ حضرات چونکہ تفصیل میں نقدین تثنیہ ذِکر کرتے ہیں، اسی طرح دِرہم و دِینار یا سونا چاندی ذِکر کرتے ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ہاں بھی بیعِ صَرف میں ''نقد'' سے مراد ثمنِ خلقی ہے۔

فقہِ شافعی کی مشہور کتاب "مغني المحتاج" میں ہے:-

"(النقد بالنقد) والمراد به الذهب والفضة مضروبا کان او غير مضروب۔"

''(بیعِ صَرف نقد کے مقابلے میں نقد کی خرید وفروخت کو کہتے ہیں) اور اس سے مراد سونا چاندی ہے، خواہ سکہ کی شکل میں ہو، یا نہ ہو۔''(۲)

---

(۱) (۳/۲۵۳)

(۲) مغني المحتاج، الشربيني (الشيخ محمد الشربيني الخطيب) بيروت، داراحياء التراث العربي (۲/۲۴)

اور اسی کتاب میں ہے:-

"تنبیه: بیع النقد بالنقد من جنسه وغیره یسمی صرفا۔"

''نقد کے مقابلے میں نقد کی بیع کو صَرف کہتے ہیں، خواہ جنس ایک ہو، یا جنس مختلف ہو۔''(۱)

علامہ ابنِ تیمیہؒ فرماتے ہیں:-

"والثانية لا يشترط الحلول والتقابض، فان ذلك معتبر في جنس الذهب والفضة سواء كان ثمناً او كان صرفا او كان مكسوراً بخلاف الفلوس ولان الفلوس هي في الاصل من باب لا عراض والثمنيه عارضة لها"

''اور دُوسری روایت یہ ہے کہ حلول (Cash Payment) اور تقابض ضروری نہیں، کیونکہ یہ چیزیں جنسِ سونا اور چاندی میں معتبر ہیں، خواہ وہ کسی قسم اور کسی شکل میں ہو، بخلاف فلوس کے (کہ وہ جنس سونا اور چاندی میں سے ہیں نہیں) اور اس لئے بھی کہ فلوس حقیقت میں سامان کے قبیل میں ہیں اور ثمنیت تو ان کو عارضی طور پر لاحق ہوگئی ہے۔''(۲)

یہ اِمام احمدؒ کی دُوسری روایت ہے، اس کا حاصل بھی وہی ہے کہ ''صَرف'' کے لئے ثمنِ خلقی کا ہونا ضروری ہے۔

علامہ زحیلی فرماتے ہیں:-

"وشرعاً هو بيع النقد بالنقد جنسا بجنس او بغير جنس: اي بيع الذهب بالذهب او الفضة بالفضة او الذهب

(۱) حوالہ بالا

(۲) (مجموعة الفتاوى ۳۵۹/۲۹)

بالفضة مصوغا او نقداً۔"

''اور شریعت صرف نقد کے مقابلے میں نقد کی خرید وفروخت کو کہتے ہیں، خواہ جنس کا جنس کے ساتھ مقابلہ ہو، یا غیر جنس کے ساتھ ہو، یعنی سونا بمقابلہ سونا کے، یا چاندی بمقابلہ چاندی کے یا سونا بمقابلہ چاندی کے، خواہ سکہ کی شکل میں ہو، یا کسی برتن وغیرہ کی شکل میں ہو۔''(۱)

کتاب "تطور النقود" میں ہے:-

"عرف الحنفية الصرف بانه بيع الاثمان بعضها ببعض وارادوا من الاثمان ما كان ثمنا خلقة اى من القدم وهو الذهب والفضة سواء كانا مسكوكين دنانير ودراهم وهى المعروفة بالنقدين او كانا مصوغين كالاقراط والاساور او كانا تبرا وعبر الشافعية والحنابلة عن الثمن بالنقد فقالوا: الصرف بيع النقد بالنقد من جنسه او غيره، ارادوا بالنقد كذلك الذهب والفضة مسكوكين او مصوغين او تبرا والحكم فى المذاهب الثلاثة هو ان الذهب والفضة اذا بيعا بجنسها كذهب بذهب او فضة بفضة وجب الحلول والتماثل وا لتقابض (الى قوله:) والتعريف السابق للصرف عند الائمة الثلاثة يفيد انه محصور فى الذهب والفضة اللذين لا يغلب عليهما الغش، فاذا كانت الدراهم مغشوشة ورائجة او كان النقد من الجانبين فلوسا رائجة لا يجرى فيهما حكم الصرف الخ۔

(۱) الفقه الاسلامى وادلته للعلامة الزحيلى (۶۳۶/۴)

''حضراتِ حنفیہؒ نے بیعِ صَرف کی تعریف یہ کی ہے کہ ثمن کو ثمن کے مقابلے میں فروخت کیا جائے۔ اور ان کے نزدیک اثمان سے مراد وہ ہیں جو خلقۃً ثمن ہوں، یعنی زمانۂ قدیم سے، اور وہ سونا اور چاندی ہیں، خواہ سکہ کی شکل میں ہوں دَنانیر اور دَراہم، جو ''نقدین'' کے ساتھ مشہور ہیں، اور یا زیور کی شکل میں ہوں، جیسا کہ بالیاں اور چوڑیاں ہیں، اور یا ڈلی کی شکل میں ہوں، اور شافعیہ اور حنابلہ نے ثمن سے ''نقد'' کے ساتھ تعبیر کی ہے، سو انہوں نے کہا کہ ''صَرف'' ''نقد'' کے مقابلے میں نقد کی بیع کو کہتے ہیں، عوضین خواہ ہم جنس ہوں یا نہ ہوں، اور ان کے نزدیک بھی ''نقد'' سے مراد سونا چاندی ہی ہے، خواہ کسی بھی شکل میں ہوں، اور تینوں مذاہب کا حکم ایک ہے، اور یہ کہ سونا اور چاندی کی خرید و فروخت جب جنس کے ساتھ ہو، مثلاً سونے کو سونے کے ساتھ یا چاندی کو چاندی کے کے ساتھ تو اس صورت میں حلول (اُدھار نہ ہونا) تماثل (برابر ہونا) اور تقابض ضروری ہیں......... ائمہ ثلاثہؒ کی صَرف کی مذکورہ تعریف سے معلوم ہوتا ہے کہ صَرف اس سونے اور چاندی میں منحصر ہے، جس میں کھوٹ غالب نہ ہو، لہٰذا اگر سونا یا چاندی جس میں کھوٹ غالب ہو، یا جانبین سے نقد فلوس رائجہ ہوں، تو اس عقد کو عقدِ صَرف نہیں کہا جائے گا۔''(۱)

ان تمام عبارات کا حاصل یہ ہے کہ ائمہ ثلاثہؒ کے ہاں عقدِ صَرف کے لئے ثمن کا خلقی ہونا ضروری ہے، نیز یہ بھی ضروری ہے کہ کھوٹ کی صورت میں سونا چاندی غالب ہوں۔ اس لئے ''فلوس'' کی بیع صَرف میں داخل نہیں، بلکہ سونے یا چاندی میں اگر ''غش''

(۱) تطور النقود (ص ۱۴۱، ۱۵۴۳)

(کھوٹ) غالب ہو، اور بحیثیت سکہ کے یہ سونا یا چاندی رائج ہو، تب بھی اس کی بیعِ صَرف نہیں، جیسا کہ کنز الدقائق کی عبارت سے واضح ہے:-

"وغالب الغش ليس في حكم الدراهم والدنانير فيصح بيعها بجنسها متفاضلا والتبايع والاستقراض بما يروج عددا او وزنا او بهماولا يتعين بالتعيين لكونها اثمانا۔"

"کھوٹ اگر غالب ہو، تو اس صورت میں یہ دَراہم یا دَنانیر کے حکم نہیں ہوں گے، لہٰذا ان کی ہم جنس کی بیع زیادتی کے ساتھ جائز ہوگی، اور رِواج کے مطابق ان کی خرید وفروخت اور قرض کا معاملہ وزن یا عدد کے اعتبار سے دُرست ہوگا، البتہ یہ متعین کرنے سے متعین نہیں ہوں گے، کیونکہ یہ اثمان ہیں۔"(۱)

یاد رکھنا چاہئے کہ "رِبا" "صَرف" سے مختلف ہے، یہ ہوسکتا ہے کہ رِبا کسی صورت میں ہو، اور وہ صَرف نہ ہو، مثلاً اگر حطہ (گندم) حطہ کے مقابلے میں تفاضلاً بیچا جائے، تو یہ رِبا ہے، اور ناجائز ہے، لیکن صَرف نہیں، اسی طرح اگر ایک فلس دو فلسوں کے مقابلے میں فروخت کیا جائے، اور غیر معین ہو، تو حنفیہ اور مالکیہ کے ہاں بالاتفاق یہ رِبا ہے، اور حرام ہے، لیکن حنفیہ کے ہاں یہ "صَرف" نہیں، اور صَرف نہ ہونے کا فائدہ یہ ہوگا کہ اگر جنس کا غیر جنس کے ساتھ مبادلہ ہو، تو تفاضل جائز ہوگا، خیارِ شرط قبول کرے گا، اجل قبول کرے گا، اور تقابض ضروری نہیں ہوگا، بلکہ ایک جانب سے قبضہ کافی ہوگا، تاکہ بیع الکالئی بالکالئی نہ ہو، فتح القدیر میں مذکور ہے:-

"ان يبيع فلسا بغير عينه بفلسين بغير اعيانهمالا يجوزلان

---

(۱) كنز الدقائق مع البحر، النسفي (الامام ابو البركات عبد الله بن احمد بن محمود المعروف بحافظ الدين النسفي المتوفى ۷۱۰ هـ) بيروت، دارالكتب العلمية، طبع اول ۱۴۱۸هـ (۳۳۵/۶)

الفلوس الرائجة امثال متساوية قطعاً لاصطلاح الناس علی سقوط قيمة الجودة منها فيكون احدهما فضلا خاليا مشروطا في العقد وهو الربا۔"

''غیر معین فلس کو اگر دو غیر معین فلسوں کے ساتھ بیچا، تو یہ جائز نہیں، کیونکہ فلوس رائجہ امثالِ متساویہ ہیں کیونکہ لوگوں نے ان میں جودت کی قیمت کو ساقط کر دیا ہے، تو ایک فلس مشروط طور پر خالی عن العوض ہو جائے گا، اور یہی رِبا ہے۔''[1]

اس عبارت سے یہ بات واضح ہے کہ اگر غیر معین فلس کا غیر معین فلسین کے ساتھ تبادلہ ہو، تو اس صورت میں یہ معاملہ بالاتفاق حرام ہے، کیونکہ فلوس امثالِ متساویہ ہیں (یعنی ایک فلس دُوسرے فلس کا ہم مثل ہے۔) تو جب ایک فلس دو کے مقابلے میں ہو، تو ایک جانب میں ایک فلس خالی عن العوض ہوا، اور یہی رِبا ہے، تو رِبا کی تعریف اس پر صادق ہے، لہٰذا یہ صورت حرام ہے، البتہ اگر فلوس کو معاملے کے وقت معین کیا جائے، مثلاً یہ کہا جائے کہ یہ ایک فلس میں تم کو تمہارے ان دو فلسوں کے مقابلے میں فروخت کرتا ہوں، تو اس صورت میں حضراتِ شیخینؒ کے نزدیک یہ صورت جائز ہے، کیونکہ تعیین سے فلوس سامان کے حکم میں آ گئے، اور عروض میں تفاضل جائز ہے، تو فلوس میں بھی جائز ہوگا، گویا کہ فلس لوگوں کی اِصطلاح سے ثمن بنا تھا، اور عاقدین کی اِصطلاح سے اس کی ثمنیت باطل ہوگئی، لیکن حضرت اِمام محمدؒ کے نزدیک یہ صورت بھی جائز نہیں، کیونکہ وہ فرماتے ہیں کہ جب فلس اِصطلاح سے ثمن بن گیا، تو اَب صرف عاقدین کو یہ اِختیار حاصل نہیں کہ وہ اس کی ثمنیت کو باطل کریں، البتہ سارے لوگ اس کی ثمنیت کے بطلان پر متفق ہو جائیں، تو وہ الگ بات ہے۔

''رِبا'' (Interest) کے مسئلے میں علامہ کاسانیؒ فرماتے ہیں:-

---

(۱) فتح القدير (۱۶۲/۶)

"ویجوز بیع المعدودات المتقاربة من غير المطعومات بجنسها متفاضلاً عند ابى حنيفة وابى يوسف بعد ان يكون يداًبيد كبيع الفلس بالفلسين باعيانهما، وعند محمد لا يجوز۔وجه قوله، ان الفلوس اثمان فلايجوز بيعها بجنسها متفاضلاكالدراهم والدنانير، ودلالة الوصف عبارة عما تقدر به مالية الاعيان ومالية الاعيان كما تقدر بالدراهم والدنانير تقدر بالفلوس فكانت اثمانا، ولهذا كانت اثمانا عند مقابلتها بخلاف جنسها، وعند مقابلتها بجنسها حالة المساواة، وان كانت ثمنا فالثمن لا يتعين وان عين كا الدراهم والدنانير فالتحق التعين فيهما بالعدم فكان بيع الفلس بالفلسين بغير اعيانهما، وذا لا يجوز، ولا نها اذا كانت اثمانافالواحد يقابل الواحد فبقى الآخر فضل مال لا يقابله عوض فى عقد المعاوضة وهذا تفسير الربا الخ"

''کھانے جانے والی اشیاء کے علاوہ جو اشیاء ''معدوداتِ متقاربہ'' میں سے ہوں، ان کی بیع بجنسہا زیادت کے ساتھ اِمام ابوحنیفہؒ اور اِمام ابویوسفؒ کے نزدیک جائز ہے، لیکن اس میں یہ ضروری ہے کہ ہاتھ دَر ہاتھ ہو، جیسا کہ ایک فلس کے مقابلے میں دوفلسوں کی بیع جائز ہے، جبکہ یہ دونوں معین ہوں، اور اِمام محمدؒ کے نزدیک یہ جائز ہیں۔ اِمام محمدؒ کے قول کی وجہ یہ ہے کہ فلوس اثمان ہیں، لہٰذا دَراہم اور دَنانیر کی طرح ان کی بیع بجنسہا زیادتی کے ساتھ جائز نہیں، اور وصفِ (ثمنیت) کی دلیل یہ ہے کہ جس چیز سے اشیاء کی مالیت کا

اندازہ کیا جاتا ہے، اور اشیاء کی مالیت کا اندازہ جس طرح دَراہم اور دَنانیر کے ساتھ کیا جاتا ہے، اس طرح فلوس کے ساتھ بھی کیا جاتا ہے، لہٰذا فلوس اثمان ہوں گے، اور یہی وجہ ہے کہ فلوس کا مقابلہ جب غیر جنس کے ساتھ ہو، یا جنس کے ساتھ ہو، لیکن دونوں طرف مساوی ہوں، تو فلوس کو اثمان قرار دِیا جاتا ہے، اور جب جب فلوس اثمان ہیں، تو ثمن تعیین سے متعین نہیں ہوتے، جیسا کہ دَراہم اور دَنانیر کا معاملہ ہے، لہٰذا ان میں "تعیین" کالعدم ہوگئی، تو اَب یہ سمجھا جائے گا، کہ یہاں غیر معین فلس کی غیر معین فلسین کے ساتھ بیع ہوئی، اور یہ جائز نہیں، اور اسی لئے بھی کہ جب یہ اثمان ہیں، تو ایک فلس ایک فلس کے مقابلے میں آجائے گا، اور ایک فلس عوض سے خالی رہ جائے گا، اور یہی رِبا کی تفسیر ہے۔"[1]

اور ہدایہ میں ہے:-

ویجوز بیع الفلس بالفلسین اعیانهما عند ابی حنیفة وابی یوسف، قال محمد : لا یجوز، لان الثمنیة تثبت باصطلاح الکل فلاتبطل باصطلاحهما واذا بقیت اثمانا لا تتعین فصار کما اذا کانا بغیر اعیانهما، وکبیع الدرهم بالدرهمین ولهما ان الثمنیة فی حقهما تثبت باصطلاحهما اذلا ولایة للغیر علیهما فتبطل باصطلاحهما واذا بطلت الثمنیة تتعین بالتعیین۔۔۔۔فصار کالجوزة بالجوزتین بخلاف النقود لانها للثمنیة خلقةً۔[2]

---

(۱) بدائع الصنائع، الکاسانی (الامام العلامة علاء الدین ابی بکر بن مسعود الکاسانی) کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی، طبع اول ۱۳۲۸ھج

(۲) الهدایة مع الفتح (۱۶۲/۶)

اس عبارت کا حاصل وہی ہے، جو ہم نے اُوپر ذکر کیا۔

فلس بفلسین کی فتح القدیر وغیرہ میں چار صورتیں تحریر ہیں، ان میں سے تین صورتیں بالاتفاق حرام اور ناجائز ہیں، اور ایک صورت اختلافی ہے، جس کی تفصیل گزر گئی:-

ا-	فلس غیر معین	=	فلسین غیر معینین	حرام اتفاقاً
۲-	فلس معین	=	فلسین غیر معینین	
۳-	فلس غیر معین	=	فلسین معینین	اختلافی[1]
۴-	فلس معین	=	فلسین معینین	

فلوس میں تاجیل جائز ہونے کی صورت علامہ سرخسیؒ نے یہ بیان فرمائی ہے:-

واذا اشترى الرجل فلوسا بدراهم ونقد الثمن ولم تكن الفلوس عند البائع فالبيع جائز، لان الفلوس الرائجة ثمن كالنقود، وقد بينا ان حكم العقد في الثمن وجوبها ووجودها معا ولا يشترط قيامها في ملك بائعها لصحة العقد كما لا يشترط ذلك في الدراهم والدنانير۔

"جب ایک آدمی دَراہم کے بدلے میں فلوس خریدے، اور ثمن (دَراہم ادا کئے) ادا کیا، اور فلوس بائع کے پاس نہیں تھے، تو یہ جائز ہے، کیونکہ فلوس رائجہ نقود کی طرح ثمن ہیں، اور ہم یہ بیان کر چکے ہیں کہ ثمن میں عقد کا حکم صرف اس کا وجوب اور وجود ہے، اور ثمن کا بوقتِ عقد بائع کی ملکیت میں ہونا صحتِ عقد کے لئے ضروری نہیں، جیسا کہ یہ دَراہم اور دَنانیر میں یہ شرط نہیں ہے۔"[2]

(۱) فتح القدير (۱۶۲/۶)

(۲) المبسوط للسرخسي (شمس الدين السرخسي) بيروت، لبنان، دار المعرفة، طبع ۱۴۱۴ھ (۲۴/۴)

نیز علامہ سرخسیؒ ایک مسئلے کے آخر میں فرماتے ہیں:-

وبيع الفلوس بالدراهم ليس بصرف الخ "

" اور فلوس کی بیع دراہم کے ساتھ صَرف ہے نہیں۔"[1]

اور جب ایک جانب دِرہم ہو اور ایک جانب فلس ہو، تو یہ صَرف نہیں، تو جب دونوں طرف فلس ہو، تو وہ بطریقِ اَوْلیٰ صَرف نہیں ہوگا۔

یہاں تک یہ بات واضح طور پر سامنے آئی کہ ائمہ ثلاثہؒ کے ہاں فلوس کی بیعِ صَرف نہیں ہے، اب آیئے مالکیہ کی نصوص دیکھتے ہیں:-

فلوس کی بیع کے صرف ہونے یا نہ ہونے سے متعلق مالکیہ کا نقطۂ نظر

"قلت : ارأيت ان اشتريت فلوسا بدراهم فافترقنا قبل ان ان نتقابض، قال: لا يصلح هذا في قول مالك، وهذا فاسد، قال:لي مالك : لا خير فيها نظرة بالذهب ولا بالورق، ولو ان الناس اجازوا بينهم الجلود حتى تكون لها سكة وعين لكرهتها ان تباع بالذهب والورق نظرة۔قلت: ارأيت ان اشتريت خاتم فضة او خاتم ذهب او تبر ذهب بفلوس فافترقنا قبل ان نتقابض ايجوزهذا في قول مالك ؟ قال: لا يجوز فلس بفلسين۔۔۔قال الليث بن سعد عن يحي بن سعيد وربيعة انهما كرها الفلوس بالفلوس وبينهما فضل اور نظرة وقالا : انها صارت سكة مثل سكة الدنانير والدراهم۔"

" میں نے کہا: آپ یہ بتائیں کی میں اگر دَراہم کے بدلے فلوس

(۱) حوالہ بالا (۱۴/ ۲۴)۔

خریدوں اور پھر ہم قبضہ کئے بغیر الگ ہو جائیں، فرمایا: یہ اِمام مالک کے قول میں دُرست نہیں، اور یہ فاسد ہے، مجھے اِمام مالکؒ نے فرمایا: فلوس اگر سونے یا چاندی کے مقابلے میں اُدھار ہوں، تو اس معاملے میں کوئی خیر نہیں، اور اگر لوگ کھالوں میں تعامل شروع کریں، یہاں تک کہ یہ سکہ اور ذات بن جائیں، تو میں ان کھالوں کا تبادلہ سونے چاندی کے ساتھ اُدھار مکروہ قرار دُوں گا۔ میں نے کہا: آپ یہ بتائیں کہ میں اگر فلوس کے بدلے چاندی یا سونے کی انگوٹھی خریدوں، اور پھر قبضہ کئے بغیر الگ ہو جائیں، تو یہ اِمام مالکؒ کے نزدیک جائز ہے؟ فرمایا: یہ اِمام مالکؒ کے نزدیک جائز نہیں، کیونکہ اِمام مالکؒ نے فرمایا: فلس کا فلسین کے مقابلے میں معاملہ جائز نہیں ....لیث بن سعد یحییٰ بن سعید اور ربیعہ سے روایت کرتے ہیں کہ یہ دونوں فلوس کا فلوس کے مقابلے میں ایسا معاملہ کو مکروہ فرماتے ہیں جس میں زیادتی یا اُدھار ہو، اور یہ فرمایا: کیونکہ یہ دَنانیر اور دَراہم کی طرح سکہ ہو گیا۔''(۱)

"وقال مالك : اكره ذلك في الفلوس ولا اراه حراما كتحريم الدنانير والدراهم، قلت: ارأيت ان اشتريت فلسا بفلسين ايجوز هذا عند مالك ؟ قال: لا يجوز فلس بفلسين۔

''اور اِمام مالکؒ نے فرمایا: میں اس کو فلوس میں مکروہ سمجھتا ہوں، اور میں اس معاملے کو دَنانیر اور دَراہم کی حرمت کی طرح حرام نہیں سمجھتا

(۱) المدونة الكبرى، الاصبحي (الامام مالك بن انس الاصبحي المتوفى ۱۷۹، بيروت، دارالكتب العلمية، طبع اول ۱۴۱۵ هج (۳/۵، ۶)

ہوں، میں نے کہا: آپ یہ بتائیں کہ اِمام مالکؒ کے نزدیک ایک فلس کی بیع دو فلسوں کے ساتھ جائز ہے؟ فرمایا: ایک فلس کی بیع دو فلسوں کے ساتھ جائز نہیں۔"(۱)

اللیث عن یزید بن ابی حبیب وعبید الله بن ابی جعفر قالا: وشیوخنا کلهم انهم کانوا یکرهون صرف الفلوس بالدنانیر والدراهم الا یدا بید۔ وقال یحی بن ایوب: قال یحی بن سعید: اذا صرفت درهما فلوسا فلاتفارقه حتی تأخذ کله۔

"ہمارے سارے مشائخ فلوس کا دَنانیر اور دَراہم کے ساتھ صَرف کو ناپسند فرماتے تھے، مگر یہ کہ ہاتھ دَر ہاتھ ہو۔"(۲)

حضراتِ مالکیہ کی ان عبارات سے صاف طور پر یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ان کے ہاں راجح یہی ہے کہ صَرف کے لئے ثمن کا خلقی ہونا ضروری نہیں، بلکہ فلوس کی بیع بھی صَرف میں داخل ہے، اور اس میں تقابض ضروری ہے، اور اُدھار ان کا معاملہ جائز نہیں۔

کیا کرنسی نوٹوں کا تبادلہ بیعِ صَرف میں داخل ہے؟

بابِ سوم میں یہ بات گزر چکی ہے کہ "نوٹ" کی شرعی حیثیت میں چار مشہور نظریئے ہیں:۔

۱-نوٹ دَین (Debt) کی "سند" (Certificate) ہے۔

۲-نوٹ "سامان" (Goods) ہے۔

۳-نوٹ سونے اور چاندی کا "بدل" یا قائم مقام (Substitute) ہے۔

۴-نوٹ بذاتِ خود "ثمنِ عرفی" ہے، اور فلوس کے حکم میں ہے۔

---

(۱) حوالہ بالا۔

(۲) حوالہ بالا (۳/ ۵،۶)۔

یہ مسئلہ ان ہی نظریات پر متفرع ہوتا ہے، اور نظریات میں اختلاف کی وجہ سے یہ مسئلہ بھی اختلافی بن جاتا ہے۔

چنانچہ جو حضرات پہلے نظریے کے قائل ہیں، ان کے نزدیک نوٹوں میں بیعِ صَرف کا تصوّر نہیں، کیونکہ بیعِ صَرف میں تقابض ضروری ہے، اور نوٹ پر قبضہ اصل پر قبضہ ہے نہیں، بلکہ اس کی سند پر قبضہ ہے، تو تبادلے میں تقابض نہ ہوگا، تو بیعِ صَرف متصوّر بھی نہیں۔

امداد الفتاویٰ میں مذکور ہے:-

سوال:- اگر سو روپے کے کوئی شخص یداً بید کسی کے ہاتھ سو سے کم یا زیادہ کو بدلے یا فروخت کرے تو کیسا ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب:- معاملہ نوٹ حوالہ ہے، بیع نہیں، اس لئے یہ دونوں صورتیں[1] حرام اور سود ہیں، کمی بیشی جائز نہیں، اور یہ بہت ہی ظاہر ہے۔

ایک دُوسرے مفصل سوال کے جواب میں فرمایا:-

الجواب:- نوٹ کی حقیقت حوالہ ہے، اور حوالے میں کمی بیشی جب معروف یا مشروط ہو رہا ہے الخ۔[2]

فتاویٰ دار العلوم دیوبند معروف بعزیز الفتاوی میں ایک سوال کے جواب میں مذکور ہے:-

الجواب:- بیع اس کی زائد و کم کو اس مقدار سے جو اس کے اندر تحریر ہے دُرست نہیں، اور در حقیقت اس کی (نوٹ) بیع نہیں ہوسکتی بلکہ

---

(۱) امداد الفتاویٰ، تھانوی (مولانا محمد اشرف علی تھانوی) کراچی، مکتبہ دار العلوم کراچی (۳/۷۶)۔

(۲) حوالہ بالا (۳/۷۸)۔

بطریقِ حوالہ اس کا انتقال ہوتا رہتا ہے الخ۔[1]

فتاویٰ رشیدیہ میں تحریر ہے:-

سوال:- نوٹ کی خرید و فروخت کمی یا زیادتی پر جائز ہے یا نہیں؟ بالتفصیل ارقام فرمائیں۔

جواب:- نوٹ کی خرید و فروخت برابر قیمت پر بھی دُرست نہیں، مگر اس میں حیلہ حوالہ ہوسکتا ہے، اور بحیلہ عقد حوالہ کے جائز ہے، مگر کم زیادہ پر بیع کرنا رِبا اور ناجائز ہے فقط۔[2]

ہندوستانی علماء میں سے ان حضرات کے نزدیک چونکہ نوٹ سندِ دَین ہے، جیسا کہ بابِ سوم میں اس کا تذکرہ گزر چکا ہے، اس لئے ان کے نزدیک نوٹوں میں بیع جائز ہی نہیں، مماثلۃً بھی جائز نہیں، اور تفاضلاً بھی جائز نہیں۔

البتہ اگر کسی نے بیع کی، تو اس کو عقدِ حوالہ کہا جائے گا، اور اسی تاویل سے اس معاملے کو دُرست قرار دِیا جائے گا، بشرطیکہ تساوی کے ساتھ تبادلہ ہو، اور حوالے کا مطلب یہ ہے کہ زید عمرو کو دس روپے کا نوٹ دے رہا ہے، گویا زید اپنا دَین اس کے حوالے کر رہا ہے، اور عمرو اس کو دس روپے کا نوٹ دے رہا ہے، گویا وہ اپنا دَین اس کے حوالے کر رہا ہے، البتہ کمی بیشی جس طرح بیع میں ناجائز ہے، اسی طرح عقدِ حوالہ میں بھی ناجائز ہے۔

جو حضرات کہتے ہیں کہ ''نوٹ'' عروض اور سامان کے حکم میں ہے، ان کے نزدیک بھی نوٹوں کا تبادلہ بیعِ صَرف نہیں، کیونکہ صَرف کے لئے عوضین کا زَر (نقد) ہونا ضروری ہے، ان کے ہاں صَرف صرف سونے اور چاندی میں منحصر ہے۔

علمائے ہند میں سے علمائے رام پور اور احمد رضا خان بریلوی صاحب اسی کے قائل ہیں، چنانچہ وہ اپنے رسالے میں فرماتے ہیں:-

(۱) عزیز الفتاویٰ، مفتی عزیز الرحمٰن صاحب، کراچی، دارالاشاعت کراچی، طبع اول (ص ۶۳۶)۔

(۲) فتاویٰ رشیدیہ، مولانا مفتی رشید احمد گنگوہی (۴۰۰)۔

سوال: هل يجوز بيع النوط بازيد من رقمه او انقص ؟
فاقول :نعم، يجوز بيعه بازيد من رقمه وبانقص منه كيفما تراضيا(الى قوله) نص علماء نا قاطبة ان علة حرمة الربا القدر المعهود بكيل او وزن مع الجنس فان وجدا حرم الفضل والنساء، وان عدما، حلا، وان وجد احدهما حل الفضل وحرم النساء، وهذه قاعدة غير منخرمة وعليها تدور جميع فروع الباب، ومعلوم ان لا اشتراك في النوط والدراهم في جنس ولا قدر، اما الجنس فلان هذا قرطاس، وتلك فضة، واما القدر فلان الدرهم موزونة ولا قدر للنوط اصلا لا مكيل ولا موزون، فيجب ان يحل الفضل، والنساء جميعا، فاذن ليس النوط من الاموال الربوية الخ

''سوال:- کیا نوٹ کی بیع اس میں لکھی ہوئی قیمت سے کمی بیشی کے ساتھ فروخت کرنا دُرست ہے؟ میں کہتا ہوں کہ ہاں اس کی بیع اس میں لکھی ہوئی قیمت سے کمی بیشی کے ساتھ جائز ہے، جس طرح عاقدین راضی ہوجائیں........ہمارے سارے علماء نے اس بات کی تصریح کی ہے کہ حرمتِ رِبا کی علت قدر (کیل، وزن) اور جنس ہے، دونوں باتیں اگر موجود ہوں، تو زیادتی اور نساء دونوں ناجائز ہیں، اور اگر دونوں باتیں معدوم ہوں، تو زیادتی اور نساء دونوں جائز ہیں، اور اگر ایک بات موجود ہو، تو زیادتی جائز اور نساء ناجائز ہے، یہ ٹوٹنے والا قاعدہ نہیں، اس پر بابِ رِبا کے تمام جزوی مسائل کا مدار ہے، اور یہ بات بالکل معلوم ہے کہ نوٹ اور دِرہم میں کوئی جنسی

اِشتراک نہیں، کیونکہ نوٹ ایک کاغذ ہے، اور دِرہم چاندی ہے، اسی طرح قدر کی بھی بات ہے، کہ دِرہم موزونات میں سے ہے، اور نوٹ کا کوئی وزن نہیں، کیونکہ یہ نہ موزونات میں سے ہے، اور نہ مکیلات میں سے ہے، لہٰذا واجب ہے کہ اس میں زیادتی اور نساء دونوں جائز ہوں، لہٰذا نوٹ اموالِ ربویہ میں سے نہیں۔ [1]

فتاویٰ رضویہ میں ایک سوال کے جواب کے آخر میں لکھتے ہیں:-

''پس حسبِ ضابطہ مقرّرہ یہاں فضل ونسیئہ دونوں حلال ہونا چاہئے۔'' [2]

اور فتاویٰ سعدیہ میں مذکور ہے:-

"فتعين انها سلع يثبت لها مايثبت لسائر السلع من زيادة ونقصان وجواز بيع بعضها ببعض متماثلا او متفاضلا من جنس او اجناس الخ"

''تو یہ بات ثابت ہوگئی کہ یہ نوٹ سامان ہے، دُوسرے سامان کی طرح اس میں بھی کمی بیشی جائز ہوگی خواہ دونوں نوٹ ہم جنس ہوں یا مختلف الجنس ہوں۔''

اور شیخ سلیمان الحمدان اپنے ایک فتویٰ میں فرماتے ہیں:-

"اذا علم هذا فلامانع من بيع الورق على اختلاف انواعه ومسمياته من الريالات او الدنانير او الجنيهات باحد النقدين باحد النقدين الذهب والفضة متفاضلاً او نساء

(۱) كفل الفقيه الفاهم فى احكام القرطاس والدراهم (ص ٦٤)۔

(۲) فتاویٰ رضویہ، بریلوی (مولوی احمد رضا خان بریلوی) کراچی، مدینہ پبلشنگ کمپنی، ایم اے جناح روڈ کراچی (۷/۲۴۵ باب الصرف)۔

ولا دخل للربا في شئي من ذلك لان الورق ليس من الاموال الربوية ولان الربا مختص بالمكيلات والموزونات والورق ليس بمكيل ولا موزون۔"

"........نوٹوں کے تبادلے میں رِبا کا کوئی دخل نہیں، کیونکہ نوٹ اموالِ رِبویہ میں سے نہیں، اور اس لئے بھی کہ رِبا خاص ہے مکیلات اور موزونات کے ساتھ اور نوٹ نہ مکیل ہے، اور نہ موزون۔"[1]

اور جن حضرات کے نزدیک "نوٹ" سونے چاندی کا قائم مقام اور سونے چاندی کا بدیل ہے، ان کے نزدیک نوٹوں کے اَحکام وہی ہوں گے، جو سونے چاندی کے ہیں، لہٰذا ان کے نزدیک نوٹوں کا تبادلہ بیعِ صَرف میں داخل ہے۔

مولانا محمد عبدالحی صاحب لکھنوی کی عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی اس نظریے کے قائل ہیں، اور ان کے نزدیک نوٹ ثمن تو ہے، لیکن اس پر اَحکام سونے چاندی کے لاگو ہوں گے، نہ کہ فلوس کے، نوٹ کے بارے میں ایک جگہ وہ فرماتے ہیں:-

"پس پیسے (فلوس) اگرچہ عرفاً ثمن ہیں، مگر عینِ ثمن خلقی نہیں سمجھے گئے ہیں، بخلاف نوٹ کے کہ یہ عین ثمن خلقی ہے، گو ثمینت خلقیہ نہیں، بلکہ ثمنیت عرفیہ ہو، پس تفاضل بیع فلوس میں جائز ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ نوٹ میں بھی جائز ہو، کیونکہ پیسے غیر جنس ثمن ہیں، حقیقۃً بھی اور عرفاً بھی، گو بوجہ اِصطلاح اور عرف کے اس میں بھی ثمنیت کی صفت آگئی ہو، پس جبکہ نوٹ عرفاً جمیع اَحکام میں عین ثمن خلقی سمجھا گیا، بابِ تفاضل میں اسی بناء پر حکم دیا گیا جائے گا، اور تفاضل اس میں حرام ہوگا۔"[2]

---

(۱) جريدة البلاد السعودية العدد ۲۹۱۷ (۱۳۷۸/۶/۲۲ھ)۔

(۲) مجموعۃ الفتاویٰ لکھنوی (مولانا عبدالحی) کراچی، ایچ ایم سعید، پاکستان چوک (۲/۷ ۱۳)۔

شیخ عبدالرزاق عفیفی فرماتے ہیں:-

"لما كان الامر كذلك كانت الاوراق النقدية بدلا عما حلت محله من عملات الذهب او الفضة التى سبقتها فى التعامل---وعلى هذا تجب فيها الزكوة كاصلها ويقدر فيها النصاب بما قدر بها فى اصلها وتجرى فيها ربا الفضل والنسيئة"(۱)

اس عبارت کا حاصل یہی ہے کہ کرنسی نوٹ جب سونے چاندی کی کرنسی کے قائم مقام ہوگئے، تو اب اس پر اس کے سارے اَحکام جاری ہوں گے، اور کرنسی نوٹوں میں دیگر اَحکام کی طرح رِبا الفضل اور رِبا النسیہ دونوں قسمیں جاری ہوں گی۔ ان عبارات سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ کرنسی نوٹوں کا تبادلہ بیعِ صَرف ہوسکتا ہے۔

اور جن حضرات کے نزدیک کرنسی نوٹ مستقل زَر ہے، اور اَحکام میں فلوس کی طرح ہے، ان کے نزدیک کرنسی نوٹوں کا تبادلہ "بیعِ صَرف" نہیں۔

حاصل یہ کہ مذکورہ چار موقفوں میں سے صرف تیسرے موقف کے مطابق کرنسی نوٹوں کا تبادلہ بیعِ صَرف ہے، باقی تین موقفوں کے مطابق نوٹوں کا تبادلہ بیعِ صَرف نہیں، اور بیعِ صَرف نہ ہونے کی وجہ الگ الگ ہے، یعنی:-

موقفِ اوّل کے مطابق نوٹ پر قبضہ سند پر قبضہ ہے، تو قبضہ نہ ہونے کی وجہ سے بیعِ صَرف کیا سرے سے یہ بیع ہی نہیں، بلکہ حوالہ ہے۔

دُوسرے موقف کے مطابق نوٹ سامان کے حکم میں ہے، اس لئے صَرف کی تعریف اس پر صادق نہیں آتی، چوتھے موقف کے مطابق نوٹ اگرچہ زَر ہے، لیکن چونکہ بیعِ صَرف کے لئے ثمن کا خلقی ہونا ضروری ہے، اور یہ ثمن خلقی نہیں، اس لئے ان کا تبادلہ بیعِ صَرف نہیں، تیسرے موقف کے مطابق چونکہ کرنسی نوٹ سونے یا چاندی کے قائم مقام ہے،

(۱) احکام الاوراق النقدية والتجارية للجعيد (ص ۲۱۴)۔

اور بدل کا حکم وہی ہوتا ہے، جو مبدل کا ہوتا ہے، اس لئے اس کا مبادلہ بیع صَر ف ہے۔

بہر حال چوتھے موقف کے مطابق بھی کرنسی نوٹوں کا تبادلہ صَرف نہیں۔ جسٹس مفتی محمد تقی عثمانی صاحب فرماتے ہیں:-

ثم ان هذه الاوراق النقدية وان كان لا يجوز فيها التفاضل، ولكن بيعها ليس بصرف، لان الاوراق النقدية ليست اثمانا خلقية وانما هي اثمان عرفية او اصطلاحية ولا يجري الصرف الا في الاثمان الخلقية من الذهب والفضة۔

"پھر یہ نوٹ اگرچہ ان میں تفاضل جائز نہیں، لیکن ان کی خرید و فروخت صَرف نہیں، کیونکہ نوٹ خلقی اثمان نہیں، بلکہ یہ تو عرفی یا اِصطلاحی اثمان ہیں، اور بیع صَر ف اثمان خلقیہ یعنی سونے چاندی میں جاری ہوتی ہے۔"(۱)

سید محمد باقر اپنی کتاب میں کرنسیوں کے تبادلے کے ذیل میں تحریر فرماتے ہیں:-

"وعمليات البيع والشراء هذه جائزة شرعا سواء كانت حاضرة او لاجل۔"

"اور ان کی خرید وفروخت کا عمل شرعاً جائز ہے، خواہ نقد ہو، یا اُدھار ہو۔"(۲)

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے کرنسی نوٹوں کی اُدھار بیع کو جائز قرار دِیا، لہٰذا یہ صَرف نہیں، جیسا کہ ظاہر ہے۔

---

(۱) احكام الاوراق النقدية للعثماني (ص۲۷)۔

(۲) البنك اللاربوي في الاسلام، السيد محمد باقر الصدر، بيروت، دار التعارف، طبع ششم ۱۴۰۰ھ (ص۱۳۸)

شیخ عبداللہ بن سلمان جو دارالافتاء ریاض کے رُکن ہیں، فرماتے ہیں:-

"هذه النظرية ترى ان الاوراق النقدية كالفلوس في طروالثمنية عليها فما ثبت للفلوس من احكام الربا والزكاة والسلم تثبت للاوراق النقدية مثلها وقد قال بهذه النظرية مجموعة كبيرة من افاضل العلماء و يعتبر القائل بها في الجملة وسطا بين القائلين بالنظرية السندية والقائلين بالنظرية العرضية، ولاشك انه اقرب الاقوال الى الاصابة في نظرنا (النقد الورقي ص۸۳)

''اس نظریے کا حاصل یہ ہے کہ نوٹ ثمن طاری ہونے میں فلوس کی طرح ہیں، سو رِبا، زکوٰۃ اور سلم کے جو اَحکام فلوس میں جاری ہوتے ہیں، وہ اَحکام نوٹوں میں بھی جاری ہوں گے، اس نظریے کا قائل فاضل علماء کی ایک بڑی جماعت ہے، اور اس نظریے کا قائل دو نظریوں یعنی یہ نظریہ کہ نوٹ سند ہے، اور یہ نظریہ کہ نوٹ عرض ہے، کے درمیان فیصل اور ثالث ہے، (یا اس نظریے کا قائل مذکورہ دو نظریوں کے قائلین کے درمیان میں ہے، یعنی یہ نظریہ اِعتدال پر مبنی ہے۔) اور بلاشبہ یہ نظریہ ہماری نظر میں حق اور دُرستگی کے زیادہ قریب ہے۔''(۱)

شیخ احمد خطیب اس سلسلے میں فرماتے ہیں:-

"فتبين بجميع ذلك ان النوت كالفلوس النحاسية في جميع احكامها ظاهراً وباطناً (اقناع النفوس بالحاق النوت بالفلوس ص۴۸)

(۱) بحواله جديد فقهي مباحث للقاسمي۔

''ان تمام (دلائل) سے یہ بات واضح ہوگئی کہ نوٹ ظاہراً و باطناً تمام اَحکام میں تانبے سے بنے ہوئے فلوس کی طرح ہے۔''(۱)

ترجیح

بابِ سوم میں ہم نے کرنسی نوٹوں کی شرعی حیثیت کے بارے میں چوتھے موقف کو ترجیح دی تھی، لہٰذا اسی بناء پر یہاں بھی راجح یہی ہے کہ کرنسی نوٹوں کا تبادلہ بیعِ صَرف نہیں۔

فلوس کے تبادلے کا تحقیقی جائزہ

فلوس کے تبادلے کا تحقیقی جائزہ اسی باب کے شروع میں ''بیعِ صَرف اور فلوس'' کے عنوان کے تحت بڑی تفصیل سے لیا گیا ہے، اس لئے یہاں دوبارہ ذِکر کرنے کی ضرورت نہیں۔

ایک ملک کی کرنسی نوٹوں کا تبادلہ بصورتِ بیع

جاننا چاہئے کہ ایک ملک کی کرنسی جنسِ واحد ہے، اور مختلف ممالک کی کرنسیاں اَجناسِ مختلفہ ہیں، اور کرنسی کے بارے میں راجح قول یہی ہے کہ فلوس کے حکم میں ہے، اور فلوس میں اختلاف مشہور ہے، جو تفصیل کے ساتھ گزشتہ صفحات میں گزر چکا، اِمام محمدؒ اور اِمام مالکؒ فلوس میں تفاضل کو حرام قرار دیتے ہیں، بلکہ غیر معین ہونے کی صورت میں حضرات شیخینؒ کا بھی یہی موقف ہے، لہٰذا کرنسی نوٹوں سے متعلق اس قول کے مطابق ملکی کرنسی کا تبادلہ کمی بیشی کے ساتھ جائز نہ ہوگا، اور تفاضل جائز نہ ہونے کی علت وہی ہے، جو ''فلوس'' میں گزر چکی، یعنی یہ کہ یہ امثال متساویہ ہیں، تو بیع کی صورت میں اگر ایک طرف زیادتی ہوگی، تو وہ زیادتی مشروط خالی عن العوض ہوگی، اور یہی رِبا ہے، جو حرام ہے، اس کی مفصل عربی عبارات گزشتہ صفحات میں ذکر ہو چکی ہیں۔

واضح رہے کہ جن حضرات کے نزدیک کرنسی نوٹ سندِ دَین ہے، ان کے نزدیک

---

(۱) حوالہ بالا۔

ملکی کرنسی کا تبادلہ بطورِ بیع دُرست نہیں، بلکہ بطور عقدِ حوالہ دُرست ہوگا، تفصیلات گزر چکی ہیں، اور جو حضرات کرنسی نوٹ کو سامان کا درجہ دیتے ہیں، ان کے نزدیک نہ صرف ملکی کرنسی کی بیع دُرست ہے، بلکہ تفاضل بھی جائز ہے، اور جن حضرات کے نزدیک کرنسی نوٹ سونے چاندی کا قائم مقام اور اس کا بدیل ہے، ان کے نزدیک ملکی کرنسی کی بیع بشرطِ تماثل جائز ہے، اور یہ بیعِ صَرف ہے۔

حاصل یہ کہ ملکی کرنسی کے تبادلے میں چار قول ہوگئے:-

۱-ملکی کرنسی کا تبادلہ بطورِ بیع دُرست نہیں، البتہ بطورِ حوالہ بشرطِ تماثل گنجائش ہے= علمائے ہند میں سے مولانا رشید احمد گنگوہی صاحبؒ، مولانا محمد اشرف علی تھانوی صاحبؒ، مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ، مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ وغیرہ اسی کے قائل ہیں۔

۲-ملکی کرنسی کا تبادلہ بطورِ بیع تفاضلاً بھی دُرست ہے= علمائے رامپور اور مولوی احمد رضا خان صاحب بریلوی اس کے قائل ہیں۔

۳-ملکی کرنسی کا تبادلہ بطورِ بیعِ صَرف بشرطِ تماثل دُرست ہے= علامہ عبدالحی لکھنوی صاحبؒ اور علامہ سعدی صاحبِ فتاویٰ سعدیہ اسی کی طرف مائل ہیں۔

۴-ملکی کرنسی کی بطورِ عام بیع بشرطِ تساوی بیع جائز ہے= بعد کے اکثر علمائے ہند اور علمائے عرب اسی کے قائل ہیں، اور زیادہ تر دارالافتاؤں میں اسی پر فتویٰ اور عمل جاری ہے۔

کرنسی نوٹ کے بارے میں ایک قول جدید

مفتی رشید احمد لدھیانوی صاحب مرحوم کی تحقیق کے مطابق ایک روپیہ کا نوٹ بحکمِ فلوس ہے، اور بڑے نوٹ ایک روپے کے نوٹوں اور دھاتی سکوں کی رسید ہے، اور اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ اسٹیٹ بنک آف پاکستان سے تحقیق پر معلوم ہوا کہ ملکی درآمد

برآمد کے حساب سے کل پیداوار کے برابر دھاتی سکے اور ایک روپے کے نوٹ جاری کئے جاتے ہیں، پھران دھاتی سکوں اور ایک روپے کے نوٹوں کے مجموعے کی تعداد کے مطابق بطورِ دستاویز بڑے نوٹ جاری کئے جاتے ہیں، لہٰذا اسٹیٹ بنک کے اس بیان کے مطابق

دھاتی سکے = فلوس

ایک روپے کا نوٹ = فلوس کے حکم میں ہے

بڑے نوٹ = فلوس کی دستاویز

اس لئے دس روپے کا نوٹ مثلاً ایک ایک روپے کے دس دس نوٹوں یا اس کے برابر دھاتی سکوں کی دستاویز ہے، خود زَر اور مال نہیں۔

اسی نظریے کی بناء پر مفتی صاحبؒ ملکی کرنسی کے تبادلے کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:-

''ایک روپے کے نوٹ بحکم فلوس ہیں، اس لئے ان کا باہم مبادلہ جائز ہے، البتہ تفاضل اور نسا حرام ہے، اگر کہیں نساء کی ضرورت پیش آئے، تو مبادلے کی بجائے اِستقراض کا معاملہ کیا جاسکتا ہے۔ بڑے نوٹوں کے عوض ایک روپے کے نوٹ لینا اِس معاملے کو اِستقراض میں داخل کیا جاسکتا ہے، بڑے نوٹوں کا باہم مبادلہ یہ درحقیقت مال کا مال کا مبادلہ نہیں، بلکہ رسید کا رسید سے ہے، اس لئے جائز ہے۔''[1]

اس میں ملکی کرنسی سے متعلق درج ذیل چار صورتیں آگئیں:-

۱-ایک روپے کے نوٹوں کے بطورِ بیع باہمی مبادلہ، یہ تماثل اور تقابض کے ساتھ جائز ہے۔

---

(۱) احسن الفتاویٰ، لدھیانوی(مفتی رشید احمد صاحب) کراچی، ایچ ایم سعید، پاکستان چوک، طبع اول ۱۴۱۵ھ (۷/۸۲،۹۲)۔

۲-ان کی بیع نساءً جائز نہیں، البتہ قرضاً دُرست ہے، جس کی صورت یہ ہوگی کہ زید عمرو کو آج ایک ایک روپے کے سو نوٹ بطورِ قرض دیدے، اور ماہ بعد عمرو پھر واپس کرے۔

۳-۱۰۰ کا نوٹ مثلاً ایک ایک روپے کے ۱۰۰ نوٹ، اس کی بیع دُرست نہیں، لہٰذا اس میں قرض کا حیلہ کیا جائے گا، جیسا کہ اُوپر ذکر ہوا۔

۴-۱۰۰ روپے کا نوٹ = ۱۰۰ روپے کے نوٹ کے ساتھ تبادلہ بطور بیع دُرست ہے۔

مناقشہ

حضرت مفتی صاحب مرحوم کا کرنسی نوٹوں سے متعلق مذکورہ موقف اس بات پر مبنی ہے کہ ملک میں ایک روپے کے جتنے نوٹ ہوتے ہیں اس کی بقدر بڑے نوٹ بطورِ دستاویز جاری ہوتے ہیں، حالانکہ یہ بالکل غلط ہے، کیونکہ تحقیق کرنے سے نیز مشاہدے سے یہ بات ثابت ہوگئی ہے کہ ملک میں بڑے نوٹ ایک روپے کے نوٹوں کے مقابلہ کئی گنا زیادہ گردش میں ہوتے ہیں، لہٰذا اس موقف کی اصل بنیاد ہی دُرست نہ رہی۔

نیز شروع بابِ سوم میں ہم نے چوتھے موقف کو راجح قرار دینے کے جو دلائل اور قرائن ذکر کئے ہیں، ان سے بھی اس موقف کا کمزور ہونا ثابت ہو رہا ہے، اور جب کرنسی نوٹ سے متعلق اصل نظریہ ہی باطل ہوگیا، تو اس پر جو تفریعات مبنی ہیں، وہ دُرست نہ ہوں گی۔

نیز بڑے نوٹ کو بڑے نوٹ کے بدلے میں فروخت کرنے جائز قرار دینا جیسا کہ اُوپر ذِکر کردہ چوتھی صورت میں ہے، یہ بالکل دُرست نہیں، کیونکہ یہ بیع الکالئی بالکالئی ہے، وجہ بالکل ظاہر ہے، اس لئے کہ بڑا نوٹ جب مال نہیں، بلکہ مال کی رسید ہے، اور رسید پر قبضہ مال پر قبضہ نہیں، تو یہاں اس معاملے میں ایک جانب سے بھی قبضہ نہیں پایا گیا،

تو اس صورت کو بیع کی بنیاد پر کس طرح جائز کہیں گے؟ حالانکہ علمائے ہند نے جب کرنسی نوٹوں کو سندِ دَین کہا، تو بیع کے طور پر ان کے مبادلے کو ناجائز کہا، البتہ حوالے کی تاویل کی، جیسا کہ اس کی تفصیل گزر چکی، اسی طرح یہاں بھی ہونا چاہئے تھا، بہر حال یہ موقف اور اس پر مبنی تفریعات قوی نہیں۔

ملکی کرنسی کے بطورِ بیع تبادلے میں ''تقابض'' کا مسئلہ

یہ مسئلہ نہایت اہم ہے، جو مفتی صاحب مرحومؒ نے بیان فرمایا ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ گزشتہ صفحات میں ہم نے بڑی وضاحت کے ساتھ یہ بات ذِکر کی ہے کہ فلوس یا کرنسی نوٹ کا تبادلہ بطورِ بیع، بیعِ صَرف نہیں، بیعِ صَرف نہ ہونے کا تقاضا یہ تھا کہ اس میں تقابض شرط نہ ہو، کیونکہ تقابض صَرف کی خصوصیات میں سے ہے، لیکن اس کے باوجود صحیح اور قوی کے مطابق اس میں تقابض شرط ہے، جسٹس مفتی محمد تقی عثمانی صاحب بھی ملکی کرنسیوں میں تبادلے میں پہلے تقابض کے عدمِ اِشتراط کے قائل تھے، کہ ایک جانب سے قبضہ کافی ہے، دونوں طرف سے تقابض ضروری نہیں، لیکن انہوں نے مفتی رشید احمد صاحب مرحوم کا مضمون پڑھ کر اپنے سابقہ موقف سے رُجوع فرمایا، اور صرف ملکی کرنسی کے تبادلے میں ان کے ہاں بھی تقابض ضروری ہے، چنانچہ دونوں حضرات کی عبارات ذیل میں ملاحظہ ہوں:-

مفتی رشید احمد صاحب تحریر فرماتے ہیں:-

> ''بیع الفلوس بالفلوس بالتساوی: اس میں بالاتفاق تقابض فی المجلس شرط ہے، مذہبِ شیخین رحمہما اللہ تعالیٰ میں ایک قول یہ بھی ہے کہ کہ صرف تعیین البدلین بلا تقابض بھی کافی ہے، یعنی تعیین وتقابض میں کسی کا وجود شرط ہے۔
>
> قال الامام الكاسانی رحمه الله تعالٰی: تبايعافلسا بعينه بفلس بعينه فالفلسان لايتعينا ن وان عينا الا ان القبض

في المجلس شرط حتى يبطل بترك التقابض في المجلس لكونه افتراقا عن دين بدين ولوقبض احد البدلين في المجلس فافترقا قبل قبض الاخر وذكر الكرخي انه لايبطل العقد لان اشتراط القبض من الجانبين من خصائص الصرف وهذا ليس بصرف فيكتفي في بالقبض من احد الجانبين لان به يخرج به عن كونه افتراقا عن دين بدين، وذكر في بعض شروح مختصر الطحاوي رحمه الله تعالى : انه يبطل لا لكونه صرف بل لتمكن ربا النساء في فيه لوجود احد وصفي علة ربا الفضل وهو الجنس وهو الصحيح (بدائع ص۲۳۷/۵)

وقال الاما م الطحاوي رحمه الله تعالىٰ: ولا بد من التعيين في بيع الفلوس بمثلها لا تحاد الجنس كما مر في بيع الفلس بالفلسين (حاشية الطحطاوي على الدر ۱۱۰/۳)

مذکورہ نصوص مذہب دیگر بے شمار تصریحاتِ ائمہ فقہ رحمہم اللہ تعالیٰ کے مطابق بیع بالجنس میں ایک جانب کا عدم تعیین ہی نساء ہے جو حرام ہے، حرمت تفاضل و جواز نساء کی کوئی نظیر نہیں ملتی، بلکہ یہ نصوصِ فقہ کے سراسر خلاف ہے۔''(۱)

جسٹس مفتی محمد تقی عثمانی صاحب فرماتے ہیں:۔

حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب مدظلہم نے ''احسن الفتاویٰ'' جلد:۷ ص:۸۷ پر اس مسئلے پر جو بحث فرمائی ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس صورت میں صحتِ عقد کے لئے احد البدلین پر قبضہ کافی

(۱) احسن الفتاوی (۸۷/۷)۔

نہیں، بلکہ جانبین سے تقابض ضروری ہے۔

حضرت مدظلہم کے دلائل پر غور کرنے کے بعد اب احقر بھی حضرت کی بات کو راجح سمجھتا ہے، واقعہ یہ ہے کہ ''بیع الفلوس بالفلوس التساوی'' کی صورت میں فقہائے حنفیہ کی تصریحات میں اختلاف ہے، میں پہلے جو حکم لکھا تھا، وہ تنویر الابصار، الدرالمختار اور علامہ شامی کی تحقیق کے مطابق لکھا تھا، اور حضرت مفتی صاحب مدظلہم کے اِرشاد کا مبنیٰ ''بدائع الصنائع'' میں علامہ کاسانیؒ کی عبارت ہے۔ (یہ عبارت اُوپر ذِکر ہوئی) اس عبارت کا حاصل یہ ہے کہ جانبین سے قبضہ ضروری ہونے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ یہ بیعِ صَرف ہے، بلکہ وجہ یہ ہے کہ جنس ایک ہونے کی بنا پر اس میں نسیئہ جائز نہیں، اگرچہ جن حضرات نے احد البدلین پر قبضے کو کافی سمجھا ہے، انہوں نے غالباً ''اجل'' کی تعین کے بغیر قبضے کے صرف مؤخر ہونے کو نسیئہ میں داخل نہیں کیا، علامہ ابنِ ہمام رحمۃ اللہ علیہ نے ''فتح القدیر'' ج:۵ ص:۲۸۸ میں اسی بناء پر اس کو نسیئہ ماننے سے انکار کیا ہے، اور چونکہ علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ مذہبُ اِمام محمد رحمۃ اللہ علیہ سے بھی نقل کیا ہے، اور اگر یہ نقل دُرست ہے، تو اس قول کو بھی باطل تو نہیں کہا جاسکتا، لیکن علامہ کاسانی رحمۃ اللہ علیہ کی دلیل بڑی وزنی ہے، اور وہ یہ کہ نسیئہ سے بچنے کے لئے دو ہی صورتیں ہیں یا تو عوضین پر مجلس ہی میں قبضہ ہوجائے، یا کم از کم عوض مؤخر کی تعیین کی جائے، چونکہ راجح قول کی بناء پر فلوس میں تعیین ممکن نہیں، اس لئے قبضہ ہی متعین ہے۔ یہ دلیل چونکہ نہایت قوی ہے، اس لئے احقر ''بیع الفلوس بالفلوس بالتساوی'' کے سلسلے میں اپنے سابقہ فتوے

سے رُجوع کرتا ہے۔ الخ،،[1]

واضح رہے کہ مفتی رشید احمد صاحب مرحوم اور جسٹس مفتی محمد تقی عثمانی صاحب کی ان عبارات کا تعلق فلوس میں تقابض سے ہے، لیکن چونکہ کرنسی نوٹ ان کے نزدیک فلوس ہی کے حکم میں ہے، اس لئے جو تفصیل فلوس میں ہوگی، وہی تفصیل کرنسی نوٹ کے تبادلے میں بھی ہوگی، لہٰذا ملکی کرنسی نوٹوں کا تبادلہ جب بطورِ بیع ہو، تو یہ اگرچہ بیع صَرف نہیں، لیکن جنس متحد ہونے کی وجہ اس میں تقابض شرط ہوگا۔

ایک ملک کے کرنسی نوٹوں کا تبادلہ بصورتِ قرض

پچھلی بحث مئیں یہ بات ذکر ہوئی کہ اگر ایک ملک کی کرنسی کا تبادلہ بطورِ بیع ہو، تو اس میں راجح قول کے مطابق نہ تفاضل جائز ہے، اور نہ نساء، لیکن کبھی کبھی نساء کی ضرورت پڑتی ہے، لہٰذا اس کے لئے اِستقراض کا طریقہ اختیار کیا گیا، اِستقراض کی صورت میں نساء حرام نہیں، کیونکہ اِستقراض بغیر نساء کے ممکن ہی نہیں، البتہ تفاضل یہاں بھی حرام ہوگا، کیونکہ تفاضل یہاں رِبا النسیئہ میں داخل ہے، جو حدیثِ مشہور "کل قرض جر منفعة فهو ربا" کی رُو سے ناجائز اور بالکل حرام ہے، اس حدیث کی تخریج اور تشریح بابِ دوم میں گزر چکی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جن حضرات کے نزدیک ملکی کرنسی نوٹوں کی بیع دُرست نہیں، ان کے نزدیک بھی ان نوٹوں میں اِستقراض کا طریقہ دُرست ہے، جیسا کہ گزر چکا۔

اور قرض یا اِستقراض کی شکل یہ ہوگی، کہ مثلاً زید کو آج اپنی کسی شخصی یا تجارتی ضرورت کے لئے ایک لاکھ روپے پاکستانی کی ضرورت ہے، تو وہ عمرو کے پاس جاتا ہے، اور اس سے بطورِ قرض یہ روپیہ حاصل کرتا ہے، اور ایک ماہ کی مدّت مقرّر ہوتی ہے، تو یہ معاملہ دُرست ہے، البتہ ایک ماہ بعد زید ایک لاکھ روپے ہی واپس کرے گا، اس میں ایک

---

(۱) البلاغ شمارہ جمادی الاولی ۱۴۲۲ھ دارالعلوم کراچی ۱۴۔

روپیہ کا اِضافہ بھی حرام ہے، اور سخت گناہ ہے، یہ تبادلہ ہے ایک لاکھ پاکستانی روپیہ کا ایک لاکھ پاکستانی روپیہ کے ساتھ جو نساء کے ساتھ ہے، اس میں نساء جائز ہے، کیونکہ یہ تبادلہ بطورِ بیع نہیں، بلکہ بطورِ قرض اور اِستقراض ہے۔

ایک ملک کی کرنسی میں ہنڈی کا حکم

اس تفصیل سے یہ مسئلہ معلوم ہوگیا کہ ایک ہی ملک کی کرنسی میں ہنڈی بطورِ بیع دُرست نہیں، کیونکہ بیع میں تقابض کا ہونا ضروری ہے، اور ہنڈی میں تقابض کا تصور نہیں، بلکہ اس میں ایک جانب سے قبضہ پایا جاتا ہے، البتہ بصورتِ قرض جائز ہے۔

مثلاً زید اور عمرو دونوں سعودی عرب میں ہیں، زید عمرو کو پانچ سو ریال دیتا ہے، اور اس سے کہتا ہے کہ یہ پانچ سو روپے میں آپ کو بطورِ قرض دیتا ہوں، لیکن اس کی ادائیگی پاکستان میں میرے والد صاحب کو کرنا، چنانچہ یہ پانچ سو ریال عمرو کے ذمہ زید کا قرضہ ہوگیا، اب عمرو ان کو اپنی ضرورت میں استعمال کرسکتا ہے، اور ان کی جگہ دُوسرے پانچ سو ریال پاکستان میں زید کے والد کو اَدا کرسکتا ہے، اور اگر عمرو کا اس پر کچھ خرچہ آتا ہے، تو معروف طریقے سے وہ زید سے لے سکتا ہے، یہ صورت جائز ہے، بشرطیکہ قانوناً اس کی ممانعت نہ ہو۔

منی آرڈر کا حکم

جب کوئی شخص دُوسری جگہ پیسہ بھیجتا ہے، تو ایک طریقہ یہ ہے کہ وہ ڈاک خانے جاتا ہے، ڈاک خانے سے ایک روپیہ میں منی آرڈر فارم حاصل کرتا ہے، اس کی خانہ پُری کرتا ہے، اور پھر مطلوبہ رقم کے ساتھ ڈاک خانے والوں کے حوالے کرتا ہے، ڈاک خانے والے یہ فارم اور رقم وصول کرکے مقدارِ رقم کے تناسب سے رقم بھیجنے والے سے کچھ فیس وصول کرتا ہے، اور اس کو توثیق کے لئے ایک رسید کاٹ کر دیتے ہیں، پھر ڈاک خانے والے اپنے مخصوص طریقے سے یہ رقم مطلوبہ شخص تک پہنچاتے ہیں، اور پہنچانے کے بعد اس

کا ایک چٹ مُرسل کے پاس آجاتا ہے، جو اس بات کی دلیل ہوتی ہے کہ رقم بخیریت منزل تک پہنچ گئی، اور اگر یہ رقم راستے میں تلف ہوگئی، تو اہلِ ڈاک خانہ اس کے ضامن ہوتے ہیں، جو رسید ڈاک خانے نے آپ کو رقم جمع کراتے وقت دی تھی، وہ رسید درحقیقت ضمانت نامہ ہے، یہ منی آرڈر کے طریقۂ کار کا خلاصہ ہے۔

اب فقہی لحاظ سے جو رقم آپ نے ڈاک خانے والے کے ہاتھ میں دی ہے یہ قرض ہے یا امانت ہے؟ قرض کی صورت میں بعینہٖ یہی رقم پہنچانا ضروری نہیں، بلکہ اس کے برابر دُوسری رقم پہنچانا بھی جائز ہے، اس صورت میں مرسل مقرض ہوگا، اور ڈاک خانہ مستقرض ہوگا، اور اگر یہ امانت ہے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ مرسل مستأجر ہے اور ڈاک خانہ اَجیر، اور اَجیر کے ہاتھ میں رقم بحکم امانت ہوتی ہے، اور امانات میں نقد متعین کرنے سے متعین ہوجاتی ہے، لہٰذا اس کا تقاضا یہ ہے کہ یہ رقم بعینہٖ مُرسَل الیہ تک پہنچ جائے، حالانکہ یہ بات معلوم ہے کہ یہ رقم بعینہٖ مرسل الیہ کو نہیں دی جاتی، اِجارہ کی صورت میں دُوسرا اِشکال یہ ہے کہ اَجیر امین ہوتا ہے، اور جو رقم اس کے ہاتھ میں ہوتی ہے وہ امانت ہے، لہٰذا اگر امین کی طرف سے کسی غفلت (Negligence) کے بغیر وہ رقم تلف ہوجائے یا ضائع ہوجائے، تو اِمام ابوحنیفہؒ کے ہاں اس کا ضمان اَجیر پر نہیں ہوگا، حالانکہ یہاں ڈاک خانہ ضامن ہے، ان وجوہات کی بناء پر منی آرڈر کے معاملے کو ''اِجارہ'' کہنا مشکل ہے، گو دُوسرا اِشکال زیادہ وزنی نہیں، کیونکہ حضرات صاحبینؒ کے نزدیک اَجیر ضامن ہوتا ہے، لیکن چونکہ پہلا اِشکال زیادہ قوی ہے، اس لئے اس معاملے کو اِجارہ نہیں کہا جائے گا، بلکہ یہ معاملہ قرض ہی ہے، لیکن قرض کی صورت میں بھی اس پر دو اِشکال وارِد ہوتے ہیں:

۱- ڈاک خانے والے جو فیس لیتے ہیں، وہ بھی بظاہر جزوِ قرض ہے، اور مرسل الیہ کو دیتے وقت اس فیس کے بغیر رقم دی جاتی ہے، تو گویا کہ قرض دیا زیادہ تھا، اور وصول کم ہوا، تو قرض میں کمی بیشی لازم آئی، جو ناجائز اور حرام ہے۔

۲- یہ معاملہ ''سُفتجہ'' میں داخل ہے، کیونکہ اس میں ''سقوطِ خطرِ طریق'' ہے،

اور سفتجہ "كل قرض جر منفعة فهو ربا" کے بموجب جائز نہیں۔

چنانچہ امداد الفتاویٰ میں اس اِشکال کو اس طرح بیان فرمایا ہے:-

الجواب:- قاعدہ کلیہ ہے الاقراض تقضى بامثالها، اور منصوص ہے کہ قرض میں کمی بیشی کی شرط رِبا ہے، اب سمجھنا چاہئے کہ منی آرڈر کا روپیہ جو ڈاک خانے میں جمع کیا جاتا ہے، آیا وہ امانت ہے، اور اہلِ ڈاک اَجیر، یا قرض ہے، اور اہلِ ڈاک مستقرض، سو چونکہ یقیناً معلوم ہے کہ وہ روپیہ بعینہٖ نہیں بھیجا جاتا، اور نیز قانون ہے کہ اگر ڈاک خانے سے وہ روپیہ اتفاقاً ضائع ہو جائے، تو اہلِ ڈاک اس کا ضمان دیتے ہیں، ان دونوں اَمر سے معلوم ہوا کہ وہ امانت نہیں، بلکہ قرض ہے، جو دُوسری جگہ ادا کیا جاتا ہے، پس فیس بھی جزوِ قرض ہوا، اور مقامِ وصول پر چونکہ بوضع فیس ادا کیا جاتا ہے، اس لئے قرض میں کمی بیشی لازم آئی، یہ وجہ اس کے ممنوع ہونے کی ہے، بلکہ اگر یہ فیس نہ بھی ہو، تب بھی حسبِ قاعدہ کلیہ كل قرض جر نفعا فهو ربا، بوجہ منفعت سقوطِ خطرِ طریق کے داخل سفتجہ ہو کر، مکروہ ہے الخ۔"[1]

ان اِشکالات کا حل یہ ہے کہ:-

۱- ڈاک خانے والے جو فیس لیتے ہیں، وہ جزوِ قرض نہیں، بلکہ حق الخدمت (Service Charges) کے طور پر ہے، یعنی رجسٹر میں لکھنے، رسید کاٹنے، اور فارم بھیجنے وغیرہ کی اُجرت ہے۔

۲- اس اِشکال کے دو جواب دیئے جاسکتے ہیں:-

الف:- یہ معاملہ سفتجہ نہیں، سفتجہ کی حقیقت "سقوطِ خطرِ طریق" ہے، جس کی

---

(۱) امداد الفتاوی (۳/۱۴۳)۔

تفصیل آگے آرہی ہے، اور منی آرڈر سے مقصود سقوط خطر طریق نہیں، بلکہ اصل مقصود پیسہ پہنچانا ہوتا ہے، جسے "ایصال" کہتے ہیں، اور ایصال پر رقم لینا جائز ہے۔

احسن الفتاویٰ میں اس کو اس طرح سمجھایا ہے:-

بندہ کے خیال میں جب قرض سے اسقاط خطر طریق مقصود نہ ہو، بلکہ صرف دُوسرے مقام تک ایصال مقصود ہو، تو یہ سفتجہ مکروہہ میں داخل نہیں، اگرچہ یہ سقوط خطر طریق کو مستلزم ہے، مگر مقصود اور لازم میں فرق ہے، چنانچہ مقامی قرض میں بھی حفظ مال کا نفع لازم ہے، مع ھذا اس کو "کل قرض جر نفعا فھو ربا" میں داخل کرکے حرام نہیں قرار دیا جاتا، (الیٰ قولہ) بندہ کے خیال مذکور کی تائید شرح وقایہ کے حاشیہ تکملۃ عمدۃ الرعایہ" کتاب الحوالہ میں مولانا فتح محمد صاحب تائب رحمہ اللہ تعالیٰ کی تحقیق سے بھی ہوتی ہے، محشی موصوف نے اس مقام پر منی آرڈر اور ہنڈی کی دیگر اَقسام کی تفصیل اور ان کے اَحکام بیان فرمائے ہیں، ونصہ:-

ویجب ان یعلم ان التی فی زماننا المسماۃ فی لساننا (بھنڈی منی آرڈر) لیس من ھذا ولا لہ حکم حکم السفاتج، لان السفاتج کانت لسقوط خطر الطریق وذا للوصول، فان قلت: علۃ الکراھۃ ھی النفع سواء کان لسقوط الخطر او للوصول، قلت: بلی ولکن الخطر مما لا یجوز الکفالۃ بہ ولا اجر علیہ، لانہ لیس فی وسع الانسان الا دفع اللصوص والحفظ انما بفضل اللہ تعالی واما الایصال تحل الاجرۃ علیہ ویمکن العھدۃ علیہ فلایلزم

من النهي عن نفع سقوط الخطر كراهة اجرة الايصال الخ۔[1]

اس عربی عبارت کا حاصل وہی ہے، جو مفتی صاحب مرحوم نے بیان فرمایا، البتہ اس میں ایک اِشکال کیا ہے، اور پھر اس کا جواب دیا ہے، اور اِشکال اور جواب کا حاصل یہ ہے کہ مقصود سقوط خطر طریق ہو، یا ایصال، دونوں صورتوں میں قرض دہندہ کو نفع حاصل ہو رہا ہے، جو مذکورہ حدیث کی بناء پر ممنوع ہے، اس کا جواب یہ دیا گیا کہ سقوط خطر طریق کفالت کے معنیٰ میں ہے، اور اس کی کفالت جائز نہیں، کیونکہ یہ اختیاری چیز نہیں ہے، اور نہ کفالت پر شرعاً اُجرت لینا جائز ہے، بخلاف ایصال کے کہ اس کی کفالت بھی دُرست ہے، کیونکہ یہ اختیاری چیز ہے، اور اس پر اُجرت بھی دُرست ہے، لہٰذا سقوط خطر طریق کی ممانعت سے ایصال کی ممانعت لازم نہیں آتی۔

ب:- اور اگر اس کو سفتجہ میں داخل بھی کیا جائے، تو عمومِ بلویٰ اور ضرورِ شدیدہ کی بناء پر یہاں بعض دُوسرے اقوال کے مطابق فتویٰ دیا جاسکتا ہے، کیونکہ بعض حضرات سفتجہ کے جواز کے قائل ہیں، جیسے کہ اگلی بحث سے اس کی پوری تفصیل معلوم ہو جائے گی۔

امداد الفتاویٰ میں ہے:-

حتیٰ کہ اگر یہ بھی نقل صحیح سے معلوم ہو جائے کہ سفتجہ کے جوُاز کی طرف ائمہ اَربعہؒ میں سے کوئی اِمام گئے ہیں، تب بھی بضرورت اس پر عمل کرنے کو جائز کہا جاوے گا الخ۔"[2]

اور احسن الفتاویٰ میں مذکور ہے:-

"بالفرض اس کا سفتجہ ہونا تسلیم بھی کر لیا جائے، تو اِمام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کے یہاں سفتجہ جائز ہے، ابتلاءِ عام وحوائجِ شدیدہ کے پیشِ نظر

(۱) احسن الفتاوی (۱۰۷/۷، ۱۰۸)

(۲) امداد الفتاوی (۱۴۵/۳)

عمل بمذہب غیر کی گنجائش ہے"۔[1]

خلاصہ یہ کہ منی آرڈر کا معاملہ جائز ہے، اور اس کے ذریعے پیسہ پہنچانا دُرست ہے، اور ڈاک خانے والوں کا اس پر فیس وصول کرنا صحیح ہے، اور یہی حکم بنک ڈرافٹ کا بھی ہے۔

سُفْتَجَه کی حقیقت

منی آرڈر کی بحث میں چونکہ سفتجہ کا ذِکر آیا، نیز آگے بھی کئی مباحث میں اس کا دخل ہے، اس لئے ضروری ہے کہ سفتجہ کی پوری حقیقت اور اس کے شرعی حکم کو ذرا تفصیل کے ساتھ بیان کیا جائے، لہٰذا ہم یہاں سفتجہ سے متعلق چار مباحث ذِکر کرتے ہیں:-

۱- سفتجہ کے لغوی معنی۔
۲- سفتجہ کے اِصطلاحی معنی۔
۳- سفتجہ کی فقہی حیثیت۔
۴- سفتجہ کا شرعی حکم اور اقوالِ فقہاء۔

سفتجه کے لغوی معنی

سُفْتَجه فارسی لفظ ہے، سین پر ضمہ ہے، اور فاء ساکن، یہ سُفْتہ سے عربی بنایا گیا ہے، نیز سین کے زَبر کے ساتھ پڑھنا بھی جائز ہے، یعنی سَفْتجہ، اس صورت میں یہ "سَفْتہ" سے ہوگا۔

سفتہ یا سفتجہ کے معنی "اِحکام" کے ہیں، یعنی مضبوط کرنا، لہٰذا سفتجہ کے لغوی معنی مضبوط کرنے ہوگئے۔[2]

---

(۱) احسن الفتاوی (۱۰۹/۷)

(۲) ردالمحتار (۱۸/۸ کتاب الحوالہ)

"واحدة السفاتج، فارسی معرب، اصله سفته وهو الشئی المحکم، سمی هذا القرض به لاحکام امره کما فی الفتح وغیره۔"

سفتجہ کے اِصطلاحی معنی

سفتجہ کے اِصطلاحی معنی کا حاصل ہے کہ یہ ایک مالی معاملہ ہے، جس میں مثلاً زید عمرو کو کسی شہر میں قرضہ دیتا ہے، اور یہ شرط لگائی جاتی ہے کہ عمرو یا اس کا نائب یہ قرضہ زید یا اس کے نائب کو فلاں شہر یا فلاں جگہ میں واپس کرے گا، اس کی جمع ''سفاتج'' ہے۔[1]

سفتجہ کی شرعی حیثیت اور فقہی تکییف

فقہائے کرام مسئلہ ''سفتجہ'' کو دو جگہ بیان فرماتے ہیں، بعض حضرات فقہائے کرام اس کو باب القرض میں ذکر کرتے ہیں، اور بعض حضرات نے باب الحوالہ میں اس کو ذِکر کیا ہے:

۱۔ جمہور علماء کے نزدیک یہ قرض کا معاملہ ہے۔

۲۔ بعض نے اس کو حوالہ قرار دِیا ہے۔

۳۔ بعض نے اس کو اِجارہ قرار دِیا ہے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ قرض ہی کا معاملہ ہے جیسا کہ ظاہر ہے، اور جمہور علماء نے اسی کو اِختیار کیا ہے۔

---

(۱) حوالہ سابقہ (۱۸/۸)

"وصورتها ان يدفع الى تاجر مالا قرضا ليدفعه الى صديقه وانما يدفعه قرضا لا امانة ليستفيد به سقوط خطر الطريق، وقيل : هى ان يقرض انسانا ليقضيه المستقرض فى بلد يريده المقرض، ليستفيد به سقوط خطر الطريق كفايه "

ـــــــــ تهذيب الاسماء واللغات، للنووى (امام ابو زكريا محى الدين بن شرف النووى المتوفى ٦٧٦هـ، دمشق، ادارة الطباعة المنيرية (۱۴۹/۲)

ـــــــــ تحرير التنبيه، النووى، بيروت، دارالقلم، طبع اول ۱۴۰۸هـ (ص۱۹۳)

"بفتح السين المهملة والتاء المثناة فوق بينهما فاء ساكنة والجيم، هى كتاب لصاحب المال الى وكيله فى بلد آخر ليدفع اليه بدله وفائدته السلامة من خطر الطريق ومئونة الحمل۔"

سفتجہ کا شرعی حکم

''سفتجہ'' کے شرعی حکم میں علمائے کرام اور فقہائے اُمت کا اختلاف ہے، ایک فریق اس کو مکروہ یا ناجائز کہتا ہے، اس فریق میں تابعین میں سے امام ابنِ سیرین، امام قتادہ، امام شعبی، امام ابراہیم نخعی، اور ائمہ اَربعہ میں سے حضرت امام ابوحنیفہ، حضرت امام شافعی اور بعض تفصیلات کے ساتھ حضرت امام مالک رحمہم اللہ تعالیٰ شامل ہیں۔[1]

دُوسرا فریق اس کو جائز کہتا ہے، اس فریق میں صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں سے ابنِ عباس، ابن الزبیر، حضرت علی، حضرت حسن بن علی، تابعین میں سے عبدالرحمٰن بن اسود، ایوب، امام ثوریؒ اور امام اسحاق اور ائمہ اَربعہ میں سے امام احمد بن حنبل، اسی طرح دیگر علماء میں سے علامہ ابنِ قدامہ، ابویعلی، امام ابنِ تیمیہ اور علامہ ابن القیم رحمہم اللہ تعالیٰ شامل ہیں۔

فریقِ اوّل کے دلائل کا خلاصہ

جو حضرات سفتجہ کو مکروہ یا ناجائز کہتے ہیں، ان کے دلائل کا خلاصہ درج ذیل ہے:-

---

(۱) مصنف عبد الرزاق، الصنعانی (حافظ ابوبکر عبدالرزاق بن ھمام الصنعانی المتوفی ۲۱۱ھ، جنوبی افریقه، المجلس العلمی، طبع اول ۱۳۹۲ھ (۱۴۰/۸)

ـــــ الفتاوی الھندیة (العالمگیریة) (۲۹۴/۳)

"وکرہ السفاتج وھو قرض استفاد به المقرض سقوط خطر الطریق وقد نھی رسول ﷺ عن قرض جر نفعا"

ـــــ الھدایة مع الفتح (۳۵۵/۶)

"ویکرہ السفاتج وھی قرض استفاد به المقرض سقوط خطر الطریق الخ"

ـــــ الخرشی (۲۳۱/۵)

ـــــ الشرح الصغیر للدردیر (۲۹۵/۳)

ـــــ المھذب، الشیرازی (امام ابو اسحاق شیرازی) مصر، (۳۰۴/۱)

ـــــ مغنی المحتاج، الخطیب، (شیخ محمد الشربینی الخطیب) بیروت، داراحیاء التراث العربی (۱۱۹/۲)

۱-سفتجہ سے مقصود سقوطِ خطرِ طریق ہوتا ہے، یہ ایک منفعت ہے، جو قرض دہندہ کو اپنے دیئے قرض کی وجہ سے حاصل ہوتی ہے، جس کی احادیثِ مبارکہ میں صریح ممانعت آئی ہے، مشہور حدیث ہے:-

"کل قرض جر منفعة فهو ربا"

یہ حدیث اس مقالے میں متعدّد مقامات پر گزری ہے، اور بابِ دوم میں اس کی مکمل تشریح اور تخریج ذکر چکی ہے۔

۲-صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہر ایسے قرض کو ناپسند کرتے تھے، جس کی وجہ سے کوئی منفعت حاصل ہو، چنانچہ مصنف ابنِ ابی شیبہ میں ہے:-

عن عطاء قال: كانوا يكرهون كل قرض جر منفعة۔

''حضرت عطاء فرماتے ہیں کہ صحابہ کرام ہر اس قرض کو مکروہ سمجھتے تھے، جو کوئی منفعت لے کر آئے۔''[1]

۳-عقدِ قرض اِحسان اور تبرّع پر مبنی ہوتا ہے، لہٰذا جب اس میں سفتجہ کی شرط لگائی جائے، تو عقدِ قرض اپنے اصل موضوع سے ہٹ جائے گا، جو دُرست نہیں۔

سفتجه کی ممانعت کی علت

اس سلسلے میں تین باتیں بیان کی جاتی ہیں:-

۱-جرِ منفعت، جو مشہور علت ہے۔

۲-کلفتِ (مشقت) قرض سے بچاؤ: بعض حضرات نے سفتجہ کی کراہت کا مدار اس بات پر رکھا ہے کہ قرض کے طور پر دینے والی چیز اگر کلفت والی ہو، اور اس کو ایک شہر سے دُوسرے شہر یا ایک جگہ سے دُوسری جگہ منتقل کرنے میں مشقت ہو، اور یہ چیز سفتجہ کی

(۱) مصنف ابن ابی شیبه، العبسی (حافظ ابوبکر عبداللہ بن محمد بن ابی شیبه المتوفی ۲۳۵ھ، کراچی، ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیۃ، طبع اول ۱۴۰۶ھ (۱۸۰/۶)

شرط کے ساتھ کسی کو قرض کے طور دی جائے، تو یہ نا جائز ہے، ورنہ جائز ہے۔[1]

۳-حضرت اِمام مالکؒ سے یہ بھی منقول ہے کہ اس کی علت "تغیرِ ثمن" ہے، یعنی عام طور جس شہر میں ادائیگی قرض کی شرط لگائی جاتی ہے، وہاں قیمت دُوسری ہوتی ہے، جس سے قرض میں کمی بیشی لازم آجائے گی، جو نا جائز ہے۔[2]

اِستثناءات (Exceptions)

جو حضرات سفاتج کو نا جائز یا مکروہ کہتے ہیں، ان کے ہاں اس حکم سے دو صورتیں مستثنیٰ ہیں:-

۱-قرض کا معاملہ پہلے ہو، اور سفتجہ بعد میں لکھا جائے، یہ جائز ہے، کیونکہ یہاں منفعت مشروط نہیں، بلکہ یہ محض احسان وتبرّع ہے، اور مذکورہ حدیث کی تشریح میں یہ بات گزر چکی ہے کہ یہاں منفعت سے وہ منفعت مراد ہے جو مشروط یا معروف ہو، مشروط یا معروف نہ ہونے کی صورت میں یہ محض تبرّع اور اِحسان سمجھا جائے گا، یہ حضرات ابنِ عباس اور ابن الزبیر رضی اللہ عنہما سے سفتجہ کا جو جواز منقول ہے، اس کی یہی تاویل کرتے ہیں۔[3]

---

(۱) الکافی، ابن قدامہ المقدسی، بیروت، المکتب الاسلامی، طبع سوم ۱۴۰۲ھ (۲/۱۲۵)
وان شرط ان یوفیہ فی بلد آخر ویکتب فیہ سفتجة الی بلد فی حملہ الیہ نفع لم یجز لذلك، فان لم یکن لحملہ مؤنة فعنہ الجواز۔

______ وقال ابن عبدالبر : ولا یجوز ان یقترض الرجل شیئا لہ حمل ومؤنة فی بلد علی ان یعطیہ ذلك فی بلد آخر فاما السفاتج بالدنانیر والدراھم فقد کرہ مالك العمل بھا ولم یحرمھا واجاز ذلك طائفة من اصحابہ الخ (احکام الاوراق النقدیة للجعید ص ۳۴۱ بحوالہ الکافی ۲/۷۲۸، ۷۲۹)

(۲) احکام الاوراق النقدیة والتجاریة للجعید (ص ۳۴۱)

(۳) الفتاوی العالمگیریہ (۳/۲۹۴)
فان لم تکن المنفعة مشروطة ولا کان فیہ عرف ظاھر فلا بأس بہ کذا فی الکافی، فی کتاب الحوالہ"

______ بدائع الصنائع (۷/۳۹۵)

______ الکافی لابن قدامہ (۲/۱۲۵)

۲- جہاں کہیں خوف عام ہو جائے، تو وہاں سفتجہ کی گنجائش ہے۔ [1]

آج کل ہمارے یہاں یہی صورتِ حال ہے، اس لئے ضرورت کے مقام پر مالکیہ اور حنابلہ مذہب کے مطابق عمل کی گنجائش ہے، جیسا کہ منی آرڈر کی بحث میں تفصیل گزر گئی۔

فریقِ دوم کے دلائل

۱- بعض صحابہ کرامؓ مثلاً حضرت ابنِ عباسؓ، حضرت ابنِ عمرؓ وغیرہ اس کو یا اس سے ملتی جلتی صورتوں کو جائز کہتے تھے۔ [2]

۲- بعض تابعین مثلاً: ابنِ سیرینؒ وغیرہ اس کے یا اس سے ملتی جلتی صورتوں کے جواز کے قائل تھے۔ [3]

۳- سفتجہ کے جائز ہونے کی سب سے اہم دلیل یہ بیان کی جاتی ہے کہ اس میں نفع جانبین سے ہے، یعنی صرف مقروض کے ساتھ نفع خاص نہیں، بلکہ جس طرح مقرض کو نفع حاصل ہوتا ہے، اسی طرح مستقرض کو بھی نفع حاصل ہوتا ہے، مثلاً مستقرض اپنے شہر میں جہاں اس کا مال رکھا ہوا ہے، ادائیگی کرتا ہے، تو اس کو بھی خطرِ طریق کے سقوط کا فائدہ حاصل ہوا، جب نفع جانبین سے ہے، تو اس کو شریعت منع نہیں کرے گی۔

چنانچہ علامہ ابنِ قدامہؒ فرماتے ہیں:-

"والصحیح جوازہ لانہ مصلحۃ لھمامن غیر ضرر بواحد منھما والشرع لایرد بتحریم المصالح التی لا مضرۃ فیھا

---

(۱) الخرشی للعلامۃ الخرشی المالکی، بیروت، دارصادر(۵/ ۲۳۱)

"الا ان یعم الخوف ای الا ان یغلب الخوف فی جمیع طرق المحل الذی یذھب الیہ المقرض الخ"

(۲) مصنف عبدالرزاق (۸/ ۱۴۰)

(۳) المغنی لابن قدامہ (بحوالہ احکام الاوراق النقدیۃ والتجاریۃ للجعید(ص ۳۴۳)

بل بمشروعیتها ولان هذا لیس بمنصوص علی تحریمه ولا فی معنی المنصوص فوجب ابقاء ه علی الا باحة۔"

''سفتجہ کا جواز ہی صحیح قول ہے، کیونکہ اس میں دونوں کی مصلحت ہے، اور کسی جانب بھی کوئی نقصان نہیں، اور شریعت ان مصالح کو حرام نہیں کرتی، جن میں کوئی نقصان نہ ہو، بلکہ ان کو مشروع قرار دیتی ہے، اور اس لئے بھی کہ اس کی حرمت نہ منصوص ہے، اور نہ منصوص کے معنی میں ہے، لہٰذا اس کو اباحت پر باقی رکھنا واجب ہے۔''(۱)

یہی بات علامہ ابنِ تیمیہؒ نے بھی کی ہے:-

"ولکن قدیکون فی القرض منفعة للمقرض کما فی مسئلة السفتجة ولهذا کرهها من کرهها، والصحیح انها لا تکره لان المقترض ینتفع بها ایضا ففیها منفعة لهما جمیعا۔"

''اور کبھی قرض میں مقرض کو منفعت حاصل ہوتی ہے، جیسا کہ سفتجہ ہے، اس وجہ مکروہ قرار دینے والوں نے اس کو مکروہ قرار دیا ہے، اور صحیح یہی ہے کہ یہ مکروہ نہیں، کیونکہ اس میں مستقرض کا بھی نفع ہے، اس میں منفعت دونوں کو حاصل ہے۔''(۲)

اور علامہ ابن القیمؒ فرماتے ہیں:-

"وروی عنه (احمد) الجواز، نقله ابن المنذر لانه مصلحة لهما فلم ینفرد المقرض۔۔۔والمنفعة التی تجر الی الربا فی القرض هی التی تخص المقرض کسکنی دارالمقترض ورکوب دوابه واستعماله وقبول هدیته فانه لا مصلحة له

---

(۱) المغنی لابن قدامه (بحواله احکام الاوراق النقدیة (۳۳۲)

(۲) مجموعة الفتاوی (۲۰/۵۱۵)

فی ذلك بخلاف هذه المسائل فان المنفعة مشتركة بينهما وهما متعاونان عليهما فهي من جنس التعاون والمشاركة"

''اور امام احمدؒ سے اس کا جواز منقول ہے، جس کو ابن المنذرؒ نے نقل کیا ہے، کیونکہ اس میں دونوں کی مصلحت ہے، صرف مقرض خاص نہیں، ......اور قرض میں جو منفعت ربا کا سبب بنتی ہے، وہ منفعت ہے، جو صرف مقرض کے ساتھ خاص ہو، مثلاً مستقرض کے گھر میں رہنا، اس کی سواری پر سوار ہونا، اس کو استعمال کرنا، اس کا ہدیہ قبول کرنا، ان چیزوں میں مستقرض کا کوئی فائدہ نہیں، بلکہ صرف مستقرض کو منفعت حاصل ہے، لیکن ان مسائل میں، تو ان میں تو منفعت مشترک ہے، لہٰذا یہ تعاون اور مشارکت کے قبیل میں سے ہے۔''(۱)

فقہائے کرام کی ان تمام نصوص کا مطلب یہ ہے کہ ان کے نزدیک "كل قرض جر منفعة فهو ربا" میں منفعت سے مراد وہ منفعت ہے، جو صرف مقرض کے ساتھ خاص ہو، لیکن اگر منفعت مشترک ہو، تو اس صورت میں وہ اس حدیث کے تحت داخل نہیں۔

مناقشہ

لیکن یہ بات اس حدیث کے ظاہر کے بالکل خلاف ہے، اور اگر اس مطلب کو صحیح قرار دیا جائے، تو اس کا تقاضا یہ ہے کہ اگر ایک تاجر کسی سے قرضہ لے اور اس پر کچھ اضافے کی شرط بھی ہو، تو یہ صورت جائز ہونی چاہیے، کیونکہ اس میں دونوں کی منفعت ہے، مال والے کا فائدہ یہ ہے کہ اس کو اپنے مال پر کچھ اضافہ مل جائے گا، اور تاجر کا فائدہ یہ ہے کہ وہ اس کو تجارت میں لگا کر اس سے نفع حاصل کرلے گا، اور یہ بہت ہی خطرناک بات

(۱) شرح الحافظ ابن القيم على سنن ابى داود مع عون المعبود، بيروت، دارالكتب العلمية۔

ہے، اس لئے کہ اس سے آج کل سارے پیداواری قرضوں پر سود لینا جائز ہو جائے گا، جیسا کہ بعض متجددین کا یہی خیال ہے، اس لئے یہ تشریح نہایت کمزور ہے، اور اس پر اعتماد نہیں کرنا چاہئے۔

نیز صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ سے اس سلسلے میں جو کچھ منقول ہے، اوّل تو یہ ضروری نہیں کہ اس سے مراد یہی سفتجہ ہو، اور اگر یہی سفتجہ بھی مراد ہو، تو ہوسکتا ہے کہ وہ غیر مشروط ہو، یا عمومِ خوف کی وجہ سے ہو، اس لئے اس سے مروّجہ سفتجہ کے جواز پر استدلال کرنا زیادہ قوی نہیں۔

خلاصہ یہ کہ اس سلسلے میں راجح یہی ہے کہ عام حالات میں سفتجہ مکروہ اور ناجائز ہے، البتہ اگر سفتجہ مشروط یا معروف نہ ہو، یا سخت ضرورت ہو، تو اس کی گنجائش ہوسکتی ہے۔

مختلف ممالک کے کرنسی نوٹوں کا تبادلہ بصورتِ بیع

جیسا کہ گزشتہ صفحات میں یہ بات ہم عرض کر چکے ہیں کہ ایک ملک کے مختلف سکے اور کرنسی نوٹ ایک ہی جنس ہیں، اور مختلف ممالک کی کرنسیاں مختلف اجناس ہیں، کیونکہ موجودہ دور میں کرنسی نوٹوں سے ان کی ذات اور مادّہ (Material) مقصود نہیں ہوتا، بلکہ کرنسی نوٹ آج کل قوّتِ خرید کے ایک مخصوص معیار (Standard) سے عبارت ہے، اور ہر ملک نے اس سلسلے میں الگ الگ معیار مقرر کئے ہیں، مثلاً پاکستان میں روپیہ، سعودی عرب میں ریال، امریکا میں ڈالر وغیرہ کا معیار الگ الگ ہے، جو ملکوں کے مختلف ہونے سے بدلتا رہتا ہے، ہر ملک کی کرنسی کی حیثیت کا تعین اس ملک کی قیمتوں کا اِشاریہ (Index) اور اس کی درآمدات و برآمدات وغیرہ پر ہوتا ہے، اور درمیان میں ایسی کوئی مادّی شئی موجود نہیں، جو ان معیارات کو جوڑ دے، اور ان میں کوئی پائیدار ''تناسب'' (Proportion) قائم رکھے، بلکہ ہر ملک کے اِقتصادی حالات کے تغیر سے اس ''تناسب'' میں ہر روز بلکہ ہر گھڑی تغیر واقع ہوتا رہتا ہے، کرنسیوں کے اس اختلاف کی وجہ سے ہم ان کو ایک جنس نہیں

کہہ سکتے، بلکہ مختلف ممالک کی کرنسیاں مختلف اجناس ہی ہیں، جہاں تک ایک ملک کی کرنسی کا تعلق ہے، تو اس میں یہ بات نہیں، ایک ملک کی کرنسیاں مقدار کے اعتبار سے اگرچہ مختلف ہوتی ہیں، مثلاً دس روپے کا نوٹ اور سو روپے کا نوٹ، سو روپے کا نوٹ اور پانچ سو روپے کا نوٹ، پانچ سو روپے کا نوٹ اور ایک ہزار روپے کا نوٹ، مقدار میں اور قیمت میں ایک دُوسرے سے مختلف ہیں، لیکن اس کے باوجود ان میں ایک ایسا پائیدار ''تناسب'' موجود ہے، جو کسی حال تبدیل نہیں ہوتا، حالات خواہ کچھ بھی ہوں، یہ تناسب برقرار رہتا ہے، مثلاً دس روپے پاکستانی سو روپے پاکستانی کا بہرحال دسواں ہے، (۱/۱۰) اور سو روپے پاکستانی پانچ سو روپے پاکستانی کا بہرحال پانچواں (۱/۵) ہے، اور پانچ سو روپے پاکستانی ایک ہزار روپے پاکستانی کا بہرحال آدھا (۱/۲) ہے، وغیرہ، اس لئے اس ''وحدتِ نسبت'' کی وجہ سے پاکستانی سکے اور کرنسی نوٹ جنسِ واحد ہیں، یہ ''وحدتِ نسبت'' پاکستانی روپے اور سعودی ریال یا سعودی ریال اور امریکی ڈالر میں نہیں پائی جاتی، یعنی یہ نہیں کہا جاسکتا کہ پاکستانی روپے اور سعودی ریال میں بہرحال یہ فلاں نسبت ہے، اس لئے یہ دونوں مختلف جنس ہوگئے۔

جب مختلف ممالک کی کرنسیاں مختلف اَجناس ہوگئیں، اور اَمثالِ متساویہ نہ رہیں، تو ان کی بیع بالاتفاق (ائمہ اَربعہؒ) تفاضل کے ساتھ دُرست ہوگی، اور جنس مختلف ہونے اور بیعِ صَرف نہ ہونے کی وجہ سے ان میں نساء بھی جائز ہوگا، اور اُدھار بیچنا بھی جائز ہوگا۔

حضراتِ حنفیہ

حنفیہ کے ہاں ایک فلس کا دو فلسوں کے ساتھ تبادلہ اس لئے ناجائز تھا کہ وہ اَمثالِ متساویہ تھے، جس کی وجہ سے تبادلے کے وقت ایک سکہ خالی عن العوض رہ جاتا، جو رِبا ہے، لیکن مختلف ممالک کی کرنسیاں مختلف الاجناس ہونے کی وجہ سے اَمثالِ متساویہ نہیں، اس لئے ان کے درمیان کمی بیشی کے ساتھ تبادلے کے وقت کرنسی کے کسی حصے کو خالی عن العوض نہیں کہا جاسکتا۔

حضراتِ مالکیہ

ان کے نزدیک کرنسی اگرچہ اموالِ رِبویہ میں سے ہے، لیکن جنس مختلف ہونے کی وجہ سے تفاضل جائز ہو جاتا ہے، جیسا کہ ظاہر ہے۔

حضراتِ شافعیہ اور حنابلہ

ان کے نزدیک ایک ملک کی کرنسیوں کا تبادلہ بھی تفاضل کے ساتھ جائز ہے، تو مختلف ممالک کی کرنسیوں کا تبادلہ تفاضل کے ساتھ ان کے نزدیک بطریقِ اَولیٰ صحیح ہوگا۔[1]

البتہ اس میں یہ ضروری ہے کہ:-

۱۔ مجلسِ عقد میں کم از کم ایک کرنسی پر قبضہ ہو جائے، تا کہ بیع الکالئی بالکالئی لازم نہ آئے، جو اَحادیثِ مبارکہ کی رُو سے ناجائز ہے۔

۲۔ نیز بوقتِ بیع فروخت کئے جانے والی کرنسی قبضے میں ہو، تا کہ بیع قبل القبض لازم نہ آئے، جو اَحادیثِ مبارکہ کی رُو سے ناجائز ہے۔ لہٰذا بعض کرنسی مارکیٹوں میں کرنسیوں کی جو محض رسید کی بنیاد پر بیع دَر بیع ہوتی ہے، اور فرق برابر کیا جاتا ہے، یہ معاملہ دُرست نہیں۔

مختلف ممالک کی کرنسیوں میں ہنڈی کا حکم

مختلف ممالک کی کرنسیاں جب مختلف الاجناس قرار پائیں، اور ان میں نساء اور

---

(۱) احکام الاوراق النقدیة للعثمانی (ص۲۲)

______ کاغذی نوٹ اور کرنسی کا حکم (ص۴۸)

______ احسن الفتاوی (فتوی بنوری ٹاؤن) (۹۸/۷)

______ البنك اللاربوی فی الاسلام (ص۱۳۸)

______ جدید فقهی مباحث جلد چهارم

اُدھار معاملہ کرنا دُرست ہوا، تو اَب ہنڈی کے فی نفسہٖ جواز میں کوئی شبہ نہیں رہا، مثلاً زید کو عمرو کو سعودی عرب میں ایک ہزار ریال بیچتا ہے، اور یہ کہتا ہے کہ تم اس کے بدلے میں مجھے یا میرے عزیز کو پاکستان میں سولہ ہزار روپے دے دینا، یہ معاملہ فی نفسہٖ جائز ہے، البتہ اس میں یہ ضروری ہے کہ ریال پر اسی مجلس میں قبضہ ہو جائے، لیکن اگر قانوناً اس کی اجازت نہ ہو، جیسا کہ ظاہر یہی ہے، تو اس صورت میں قانون کی خلاف ورزی کا گناہ ہوگا۔

چند شبہات اور ان کا اِزالہ

۱-بعض لوگوں نے دو کرنسیوں کے باہمی تفاضلاً اُدھار تبادلے کو سود کے زُمرے میں داخل کر کے ناجائز کہا ہے، جس کی صورت یہ ہوگی کہ مثلاً: آج ڈالر کا ریٹ ساٹھ روپے ہے، اور اس حساب سے زید نے عمرو کو پچاس ڈالر اُدھار بیچے، تو گویا کہ زید نے عمرو کو آج:-

۵۰×۶۰=۳۰۰۰ روپے پاکستانی

دیئے، اور عمرو ایک ماہ بعد ۶۲ روپے فی ڈالر کے حساب سے روپے ادا کر رہا ہے، تو عمرو زید کو ایک ماہ بعد گویا کہ:-

۵۰×۶۲=۳۱۰۰ روپے پاکستانی

دے رہا ہے، جس میں ایک سو روپے کا اِضافہ ہے، جو سود ہے، اور ناجائز ہے۔[1]

لیکن یہ اِشکال قوی نہیں ہے، کیونکہ یہ اِشکال اُدھار کے ساتھ خاص نہیں، بلکہ نقد کی صورت میں بھی ہو سکتا ہے، جیسا کہ ظاہر ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ روپے اور ڈالر جب مختلف الاجناس قرار پائیں، تو اَب اس میں تفاضل جائز ہے، خواہ نقد کی شکل میں ہو، یا اُدھار کی شکل میں ہو، اور اس کو سود نہیں کہا جائے گا۔

۲-بعض علماء نے دو مختلف کرنسیوں کے باہمی تبادلے کو بیعِ صَرف قرار دے کر

(۱) رسالہ بحث ونظر ص۱۱۵، شمارہ اپریل، مئی، جون، ۱۹۹۰ء، اشکال از ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی

ناجائز قرار دیا، اور کہا کہ یہ بیع صَرف ہے، لہٰذا اس میں تقابض ضروری ہوگا، اور اُدھار معاملہ ان کا دُرست نہ ہوگا، چنانچہ کتاب "المعایير الشرعية" میں مذکور ہے:-

"تجوز المتاجرة في العملات شريطة مراعاة الاحكام والضوابط الشرعية الآتية:

١-ان يتم التقابض قبل تفرق العاقدين سواء اكان القبض حقيقيا ام حكميا"

"کرنسیوں میں درج ذیل شرائط اور شرعی اُصول کو ملحوظ رکھتے ہوئے تجارت دُرست ہے:-

١-عاقدین کے جدا ہونے سے پہلے تقابض کا مکمل ہونا ضروری ہے، خواہ قبض حقیقی ہو، یا حکمی ہو۔"(١)

اور "تطور النقود" میں ہے:-

واذا اختلف الجنسان كان يبيع الذهب بالفضة او بالعملات الورقية المختلفة وجب الحلول والتقابض وجاز التفاضل"

"اور جب دونوں جنس مختلف ہوں، مثلاً سونے کی بیع چاندی کے ساتھ ہو، یا مختلف کاغذی کرنسیوں کا معاملہ ہو، تو اس میں حلول (نقد ہونا)، اور تقابض ضروری ہے، البتہ تفاضل جائز ہے۔"(٢)

اس کا جواب گزشتہ صفحات میں تفصیل کے ساتھ گزر چکا ہے کہ بیع صَرف کے لئے ضروری ہے کہ دونوں جانب ثمنِ خلقی ہو، اگر دونوں جانب ثمنِ عرفی ہو، یا ایک جانب خلقی ہو، اور ایک جانب عرفی ہو، تو اس کو بیعِ صَرف نہیں کہا جائے گا، اور اس میں تقابض

---

(١) المعايير الشرعية ص١٥، ١٤٢١هـ، هيئة المحاسبة والمراجعة، بحرين-

(٢) تطور النقود في ضوء الشريعة الاسلامية (ص١٤٥)-

ضروری نہ ہوگا، اور اس کا اُدھار معاملہ بھی دُرست ہوگا، اگر ایک طرف ثمنِ خلقی ہو، اور دُوسری طرف ثمنِ عرفی ہو، تو ایک جانب سے مجلسِ عقد میں قبضہ کافی ہے، تقابض ضروری نہیں، یہ بات کتبِ فقہ میں مصرّح ہے، چنانچہ فتح القدیر میں ہے:-

"وفی شرح الطحاوی : لواشتری مائة فلس بدرھم وقبض الفلوس او الدراھم ثم افترقا جاز البیع لانھما افترقا عن عین بدین۔"

''اورشرح طحاوی میں ہے کہ اگر کسی نے ایک دِرہم کے بدلے سو فلس خریدیں، اور فلوس یا دَراہم پر قبضہ کرلیا، اور پھر دونوں الگ الگ ہوگئے، تو یہ بیع جائز ہے، کیونکہ اس میں دَین کے بدلے میں عین کا سودا کرکے جدا ہوگئے۔''[1]

اس میں فلوس جو ثمنِ عرفی ہے، اور دِرہم جو ثمنِ خلقی ہے، دونوں کے تبادلے کا معاملہ ہے، اوراس میں ایک جانب سے قبضے کو کافی قرار دِیا گیا ہے۔

علامہ شامیؒ نے اس سلسلے میں تین روایتیں ذِکر کی ہیں، ان میں سے راجح اور صحیح قول یہی ہے کہ ایک اس صورت میں ایک طرف سے قبضہ کافی ہے، تقابض ضروری نہیں:

"فصار الحاصل ان ما فی الاصل یفید اشتراطه من احد الجانبین وما فی الجامع اشتراطه منھما۔"

''حاصل یہ ہوا کہ کتاب الاصل کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک جانب سے قبضہ کافی ہے، اور الجامع سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں جانبوں سے قبضہ ضروری ہے۔''[2]

اور بزازیہ سے نقل کرتے ہیں:-

---

(۱) فتح القدیر (۲۷۸/۶)۔

(۲) ردالمحتار (۳۱۳/۷)۔

"سئل الحانوتی عن بیع الذهب بالفلوس نسئیة فاجاب بانه یجوز اذا قبض احد البدلین لما فی البزازیة:

"علامہ حانوتیؒ سے فلوس کے بدلے سونے کو اُدھار فروخت کرنے کے بارے میں سوال کیا گیا، تو انہوں نے جواب دیا کہ یہ جائز ہے، بشرطیکہ ایک بدل پر قبضہ ہو، کیونکہ بزازیہ میں مذکور ہے کہ اگر کوئی شخص سو فلس ایک دِرہم کے بدلے خریدے، تو ایک جانب سے قبضہ کافی ہے، فرمایا، اسی طرح اگر فلوس کے بدلے چاندی یا سونے کو بیچا۔"

علامہ سرخسیؒ کا رُجحان بھی اسی طرف ہے، چنانچہ فرمایا:-

واذا اشتری الرجل فلوسا بدراهم ونقد الثمن ولم تكن الفلوس عند البائع فالبیع جائز، لان الفلوس الرائجة ثمن كالنقود، وقد بینا ان حكم العقد فی الثمن وجوبها ووجودها معا ولا یشترط قیامها فی ملك بائعها لصحة العقد كما لا یشترط ذلك فی الدراهم والدنانیر۔

"جب ایک آدمی دَراہم کے بدلے میں فلوس خریدے، اور ثمن (دَراہم ادا کئے) ادا کیا، اور فلوس بائع کے پاس نہیں تھے، تو یہ جائز ہے، کیونکہ فلوس رائجہ نقود کی طرح ثمن ہیں، اور ہم یہ بیان کر چکے ہیں کہ ثمن میں عقد کا حکم صرف اس کا وجوب اور وجود ہے، اور ثمن کا بوقت عقد بائع کی ملکیت میں ہونا صحتِ عقد کے لئے ضروری نہیں، جیسا کہ یہ دَراہم اور دَنانیر میں یہ شرط نہیں ہے۔"(۱)

(۱) المبسوط للسرخسی (شمس الدین السرخسی) بیروت، لبنان، دارالمعرفة، طبع ۱۴۱۴ھج (۲۴/۴)

اور جب ایک جانب میں ثمنِ خلقی ہونے کے باوجود تقابض شرط نہیں، تو اگر کسی جانب بھی ثمنِ خلقی نہ ہو، بلکہ دونوں طرف کرنسی ہو، مثلاً پاکستانی روپیہ اور ڈالر، تو یہاں بطریقہ تقابض شرط نہ ہوگا۔

کرنسی کو سرکاری ریٹ سے کمی بیشی کے ساتھ فروخت کرنا

آج کل روزانہ کرنسیوں کی قیمت مقرّر کی جاتی ہے، اور باقاعدہ پرائس لسٹ جاری ہوتی ہے، اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس صورت میں حکومت کی مقرّر کردہ قیمت کی مخالفت کرتے ہوئے کمی بیشی کے ساتھ کرنسیوں کا تبادلہ جائز ہے؟ مثلاً ڈالر کا سرکاری ریٹ ۶۰ روپے ہو، اور کوئی ڈالر ۵۸ یا ۶۲ میں فروخت کرے، تو یہ جائز ہے یا نہیں؟

اس بارے میں عرض یہ ہے کہ بذاتِ خود اس کی گنجائش ہے، کیونکہ مختلف ممالک کی کرنسیاں مختلف الاجناس قرار دے کر ان میں تفاضل جائز قرار دِیا گیا ہے، اور تفاضل کی کوئی حد شریعت میں مقرّر نہیں، اس لئے فی نفسہ اس معاملے کو جائز کہا جائے گا، اور یہ معاملہ سودی نہیں ہوگا، لیکن درج ذیل وجوہات کی بناء پر اس سے اِحتراز لازم ہے:-

۱- یہ طریقہ کہیں حیلۂ رِبا نہ بنایا جائے۔

۲- "تسعیر" (حکومت کا نرخ مقرّر کرنا) کی وجہ سے، جس طرح دیگر اشیاء میں بعض حالات میں تسعیر جائز ہے، اسی طرح کرنسی میں بھی تسعیر جائز ہوگی، اور تسعیر کے بعد لوگوں کے لئے اس کی مخالفت دُرست نہ ہوگی، اور اس کی دو وجوہات ہیں:-

الف:- مشہور قاعدہ ہے کہ جو کام معصیت اور گناہ نہ ہوں، ان میں حکومت کی اطاعت واجب ہے۔

ب:- جو شخص جس ملک میں رہ رہا ہے، وہ قولاً یا عملاً اس بات کا اِقرار کرتا ہے کہ جب تک اس ملک کے قوانین کسی گناہ کرنے پر مجبور نہیں کریں گے، وہ ان قوانین کی ضرور پابندی کرے گا۔[1]

(۱) کاغذی نوٹ اور کرنسی کا حکم (ص ۴۰)۔

مختلف ممالک کی کرنسی نوٹوں کا تبادلہ بصورتِ قرض

جب ایک ہی ملک کی کرنسیوں کا تبادلہ بصورتِ قرض جائز ہے، جس کی تفصیل پیچھے گزر گئی، تو مختلف ممالک کی کرنسیوں کا تبادلہ بصورتِ قرض بطریقِ اَولیٰ دُرست ہوگا، مثلاً اگر زید آج عمرو سے ایک ماہ کے لئے سو ڈالر قرض لیتا ہے، اور ایک ماہ کے بعد زید عمرو کو ڈالر کی بجائے پاکستانی روپیہ دیتا ہے، تو یہ جائز ہے، اب ایک ماہ کے بعد زید جو عمرو کو ڈالر کی بجائے پاکستانی روپیہ دیتا ہے، تو اس کی دو صورتیں ہیں:-

الف:- ایک صورت یہ ہے کہ شروع میں یہ معاہدہ ہو جاتا ہے کہ زید عمرو کو ایک ماہ بعد ڈالر کی بجائے پاکستانی روپیہ دے گا۔

ب:- دُوسری صورت یہ ہے کہ پہلے سے اس طرح کوئی معاہدہ نہیں، مقررہ تاریخ آنے پر دونوں کی باہمی رضامندی سے اس طرح کیا جاتا ہے۔

دُوسری صورت کے دُرست ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے، اور پہلی صورت بھی دُرست ہے، البتہ شرط فاسد ہوگی، کیونکہ قرض ان معاملات میں سے ہے، جو شرطِ فاسد کی وجہ سے فاسد نہیں ہوتے، بلکہ شرطِ فاسد خود بخود فاسد ہو جاتی ہے، پہلی صورت میں جب شرط فاسد ہوگئی اور کالعدم ہوگئی، تو زید مقررہ تاریخ پر عمرو کو ڈالر بھی دے سکتا ہے، اور عمرو زید کو مقررہ تاریخ پر اس بات پر مجبور نہیں کر سکتا کہ وہ حسبِ معاہدہ پاکستانی روپیہ ہی ادا کرے گا۔

قرض کے اس معاملے میں یوم الاداء کی قیمت کا اعتبار ہوگا، (یعنی جس دن زید عمرو کو سو ڈالر کے بدلے پاکستانی روپیہ ادا کرے گا، اس دن کے ریٹ کا اعتبار ہوگا)، اور زید کے لئے جائز نہ ہوگا، کہ وہ عمرو کو یوم الاداء کی قیمت سے کم یا زیادہ دے، مثلاً جس دن عمرو نے زید کو سو ڈالر دیئے اس دن ڈالر کی قیمت ۶۰ روپے ہے، لیکن جس دن زید قرض ادا کرتا ہے، اس دن ڈالر کی قیمت ۶۲ روپے ہے، تو زید عمرو کو ۶۲ کے حساب سے پاکستانی

روپے کی ادائیگی کرے گا، وجہ اس کی ہے کہ قروض کے بارے میں شرعی حکم یہ ہے کہ:-

القروض تقضی بامثالها

یعنی ''قرض کی مثل ادا کرنا ضروری ہے۔''

جسٹس مفتی محمد تقی عثمانی صاحب اِشاریہ (Indexation) کا مسئلہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

"لان القروض یجب فی الشریعة الاسلامیة ان تقضی بامثالها"

''شریعتِ اسلامیہ کی رُو سے ضروری ہے کہ قرض کی مثل ادا کی جائے۔''(۱)

اس اُصول کا تقاضا یہ ہے کہ ایک ماہ بعد عمرو کو ایک سو ڈالر دیدے، کیونکہ اصل مثل تو ڈالر ہی ہے، لیکن جب اس کو ڈالر نہیں دیتا، تو اس دن سو ڈالر کے برابر پاکستانی روپے واپس کرے، اگر ۶۰ روپے کے حساب سے زید ادائیگی کرتا ہے، تو اس نے سو ڈالر نہیں ادا کئے، بلکہ کم ادا کردئے، جو کہ جائز نہیں۔

البتہ ۶۲ روپے فی ڈالر سے زیادہ لینا دینا جائز نہیں، ورنہ قرضے پر اِضافہ ہوجائے گا، اور ''مثلیت'' باقی نہیں رہے گی۔

خلاصہ یہ کہ زید کے ذمہ ایک ماہ کے بعد سو ڈالر دینے ہیں، سو ڈالر سے کم یا زیادہ دینا جائز نہیں، ورنہ ''مثلیت'' باقی نہیں رہے گی، اگر ریٹ ۶۲ روپے ہے، اور زید ۶۰ کے حساب سے ادائیگی کرتا ہے، تو ۶۰ کے حساب سے جتنے پاکستانی روپے ہیں، ان میں سو ڈالر نہیں آسکتے، تو اس صورت میں کمی واقع ہوگئی، اور اگر ریٹ ۶۲ روپے ہے، اور زید ۶۴ کے حساب سے ادائیگی کرتا ہے، تو اس حساب سے سو ڈالر سے زیادہ آئیں گے، دونوں صورتوں

(۱) احکام الاوراق النقدیة(ص ۱۳)۔

میں ''مثلیت'' جو مطلوب ہے، باقی نہیں رہتی۔

اس سلسلے میں قرض اور بیع میں فرق ہے، بیع میں کمی بیشی فی نفسہ جائز ہے، وہ الگ بات ہے کہ دوسرے عوامل کی وجہ سے یہ بھی ناجائز ہے، لیکن اس کو بہرحال سودی معاملہ نہیں کہا جائے گا، لیکن قرض میں یہ صورت جائز نہیں کیونکہ قرض میں کمی بیشی ناجائز ہے۔

اس سے یہ مسئلہ بھی معلوم ہوگیا کہ اگر زید مثلاً عمرو کو سعودی عرب میں ایک ہزار ریال قرض دیدے، اور عمرو اس کے بدلے پاکستان میں ایک ہزار ریال کے برابر پاکستانی روپیہ زید یا اس کے کسی ایجنٹ یا کسی عزیز کو ادا کرے، تو فی نفسہ اس کی اجازت ہے، البتہ اگر قانون میں ممنوع ہو، تو قانون کی خلاف ورزی کا گناہ ہوگا۔

نیز اس پر سفتجہ والا اشکال ہوگا، اس کا جواب پیچھے گزر چکا ہے۔

فائدہ:- اُوپر جو تفصیل گزری کہ یوم الاداء کی قیمت کا اعتبار ہے، اس سے کمی بیشی ناجائز ہے، اس کمی بیشی سے مراد وہ کمی بیشی ہے جو قیمتِ مثل سے کے مقابلے میں ہو، اور قیمتِ مثل کی تین صورتیں ہیں:-

۱- بنک ریٹ کے مطابق۔

۲- اوپن مارکیٹ ریٹ کے مطابق۔

۳- ان دونوں کے درمیان والا ریٹ۔

مثلاً بنک ریٹ ۶۰ روپے ہے، مارکیٹ ریٹ ۶۲ روپے ہے، تو اس میں اختیار ہے کہ ۶۰ کے حساب سے ادا کریں، یا ۶۲ کے حساب سے ادا کریں، یا ۶۱ کے حساب سے ادا کریں، لیکن ۵۹ کے حساب سے یا ۶۳ کے حساب سے ادائیگی جائز نہیں۔

کرنسی نوٹوں کا تبادلہ بصورتِ معاہدہ/مواعدہ

جو مالیاتی ادارے اسلامی اور شرعی اُصولوں کے مطابق کاروبار کرتے ہیں، وہ یہ

طریقہ درآمدات اور برآمدات میں بطور ''اسلامی متبادل'' (Islamic Alternative) استعمال کرتے ہیں، تفصیل ذیل میں ملاحظہ ہو:-

درآمد/ برآمد کنندگان کے لئے ایل سی (LC) اور امپورٹ/ ایکسپورٹ کنٹریکٹ کے تحت فارن ایکسچینج کور کی سہولت فراہم کی جاتی ہے، یہ سہولت فراہم کرنے کی بہت اہمیت ہے، کیونکہ موجودہ دور میں کرنسیوں کی قیمتوں کے وقتاً فوقتاً اُتار چڑھاؤ کی وجہ سے درآمد کنندگان اور برآمد کنندگان کو نفع ونقصان کا تخمینہ لگانا اور اپنے آپ کو ممکنہ نقصان سے بچانا اور تجارت جاری رکھنا بہت مشکل ہو جاتا ہے، اس وجہ سے بنک فارن ایکسچینج کور کی سہولت فراہم کرتے ہیں، تاکہ مستقبل میں ڈالر خریدنے اور بیچنے میں نقصان نہ ہو، یہ بات واضح رہے کہ درآمد کنندگان کو درآمد کردہ اشیاء کی قیمت ڈالر یا زرِمبادلہ میں درآمد شدہ سامان کے کاغذات کے وصول ہونے کے بعد برآمد کنندہ کو کرنے ہوتے ہیں، جس کے لئے ڈالر یا زرِمبادلہ خریدنا ہوتا ہے، اس کے برخلاف برآمد کنندگان کو اپنے برآمد کردہ سامان کی قیمت وصول ہوتی ہے، جس کی فروخت کر کے وہ پاکستانی روپے حاصل کرتے ہیں۔

فارورڈ کور کنٹریکٹ

موجودہ سودی نظام میں درآمد/ برآمد کنندگان ایل سی (LC) کھولنے کے بعد غیر ملکی کرنسیوں کی خرید وفروخت کے لئے ''فارورڈ کور کنٹریکٹ'' کسی بنک کے ساتھ مندرجہ ذیل شرائط کے ساتھ کرسکتا ہے:-

۱-اس کنٹریکٹ کی مدّت کم ازکم ایک ماہ ہو۔

۲-اگر ایک ماہ سے پہلے ادائیگی کرنی ہو، تو جس دن ادائیگی کرنی ہو، اس دن کے اسپاٹ (Spot) یعنی نقد (انٹر بنک) ریٹ کے حساب سے ادائیگی کی جائے گی، فارورڈ کور کنٹریکٹ مقررّہ تاریخ پر مروّجہ طریقۂ کار کے مطابق ختم کی جائے گا۔

فارورڈ کور کنٹریکٹ کا مروّجہ طریقۂ کار درج ذیل ہے:-

۱- درآمد کنندہ (امپورٹر) کو ایک ملین ڈالر آج سے ۹۰ دن بعد برآمد کنندہ (ایکسپورٹر) کو اَدا کرنے ہیں، وہ چونکہ یہ نہیں جانتا کہ ۹۰ دن کے بعد ایک ڈالر کے کتنے روپے بنیں گے کہ جس کے حساب سے وہ اپنی بجٹ پلاننگ کرے، اس وجہ سے وہ کمرشل بنک سے فارورڈ کور کنٹریکٹ کرنے کے لئے رابطہ کرتا ہے، جس کا طریقۂ کار درج ذیل ہے:-

۲- فرض کریں کہ ڈالر کی اسپاٹ (Spot) یعنی نقد (انٹر بنک) قیمت ۶۰ روپے ہے۔

۳- کمرشل بنک مثلاً نیشنل بنک ایک ملین امریکی ڈالر آج ۶۰ روپے کے حساب سے مارکیٹ سے خرید لیتا ہے، موقع پر ہی ان کو حبیب بنک کو ۶۰ روپے کے حساب سے ہی فروخت کرتا ہے، اور ساتھ ایک معاہدہ ہوتا ہے کہ ایک ماہ بعد ڈالر کی قیمت کچھ بھی ہو، نیشنل بنک حبیب بنک سے ڈالر ۶۱ روپے کے حساب سے خریدے گا۔

۴- نیشنل بنک دس پیسے فی ڈالر اپنی فیس اس قیمت میں شامل کر کے درآمد کنندہ سے ۶۱ء۱۰ روپے فی ڈالر کے حساب سے آج سے ۹۰ دن کے بعد ایک ملین امریکی ڈالر فروخت کرنے کا معاہدہ کر لیتا ہے۔

۵- اب دو صورتیں پیش آسکتی ہیں:-

الف:- درآمد کنندہ نیشنل بنک کو ۶۱ء۱ ملین روپے ادا کرتا ہے، نیشنل بنک ۰ء۱ روپے اپنی فیس رکھتا ہے، اور ۶۱ ملین روپے حبیب بنک کو ادا کر کے ایک ملین ڈالر حاصل کرتا ہے، جس کے ذریعہ وہ (نیشنل بنک) درآمد کنندہ کو ادائیگی کرتا ہے، اس صورت میں یہ عقد سابقہ ذکر کردہ شرائط کے ساتھ مکمل ہو گیا۔

ب:- ۹۰ دن سے پہلے درآمد کنندہ نیشنل بنک کو مطلع کرتا ہے کہ کنٹریکٹ کے کینسل ہونے کی بناء پر وہ ڈالر نہیں خرید سکے گا، لہٰذا اب وہ اس عقد کو ختم کرنا چاہتا ہے،

(اگر وہ ڈالر رکھنا بھی چاہے، تو اسے سٹیٹ بنک کے قوانین کے مطابق کنٹریکٹ کے بغیر ڈالر وصول کرنے کی اجازت نہیں) اسٹیٹ بنک کے قوانین کی رُو سے درآمد کنندہ وہ ڈالر بکنگ ریٹ یعنی ۶۱ء۱ روپے فی ڈالر کے حساب سے خرید کر فوراً نیشنل بنک کو یہی ڈالر بازاری قیمت یا معاہدے کے دن کی بازاری قیمت میں سے جو بھی کم ہو، اس قیمت پر واپس نیشنل بنک کو فروخت کرنے کا پابند ہوگا، مثلاً:-

زیرِ بحث مثال میں معاہدے کے دن کی قیمت فی ڈالر ۶۰ روپے تھی، اب فرض کیجئے کہ ۳۰ دن بعد کنٹریکٹ کینسل ہو رہا ہے، اس دن اس کی قیمت ۶۱ تک بڑھ جاتی ہے، اس صورت میں نیشنل بنک امپورٹر سے ۶۰ روپے کے حساب سے ڈالر واپس خریدے گا، اس میں امپورٹر کو ایک ملین روپے گویا کہ جرمانے کے طور پر اَدا کیئے۔

یہ فارن ایکسچینج کور کا روایتی اور سودی طریقہ ہے، جو شرعاً جائز نہیں۔ اس کا شرعی متبادل طریقہ یہ تجویز کیا جاتا ہے کہ:-

امپورٹر کو ایک ملین امریکی ڈالر آج سے ۹۰ دن کے بعد اَدا کرنے ہیں، وہ اس کے لئے مثلاً میزان بنک سے فارورڈ کور کنٹریکٹ کرنے کے لئے رابطہ کرتا ہے۔

۱- فرض کریں کہ ڈالر کی اسپاٹ قیمت ۶۰ روپے ہے۔

۲- میزان بنک، حبیب بنک سے ایک معاہدہ کرتا/ دوطرفہ وعدہ ہے کہ تین ماہ بعد میزان بنک حبیب بنک سے ڈالر ۶۱ روپے کے حساب سے خریدے گا، (اس دوطرفہ وعدے کے تحت خرید و فروخت کا عقد تین ماہ مقررّہ مدّت پر ہی انجام پائے گا۔) معاہدے کے تحت میزان بنک تین ماہ کے بعد حبیب بنک سے خریدنے کا عقد کرے گا، اور ۶۱ ملین روپے کے عوض ایک ملین ڈالر لے گا، حبیب بنک ایک ملین ڈالر آج کی تاریخ میں بازار سے خرید کر اپنے پاس محفوظ کرلے گا، تاکہ وہ تین ماہ بعد میزان بنک کو فروخت کرسکے۔

۳- میزان بنک دس پیسے فی ڈالر اپنا نفع اس قیمت میں شامل کر کے درآمد کنندہ

سے ۶۱ روپے کے حساب سے آج سے ۹۰ دن کے بعد فروخت کرنے کا دوطرفہ وعدہ کرلیتا ہے۔ معاہدے کے تحت میزان بنک تین ماہ کے بعد امپورٹر سے فروخت کرنے کا عقد کرے گا، اور ۶۱ ملین روپے کے عوض ایک ملین ڈالر دیدے گا۔

اب یہاں پر وہی دوصورتیں پیش آسکتی ہیں جو طریقۂ اوّل میں ''الف'' اور ''ب'' کے عنوان سے گزر گئیں۔

''الف'' تو واضح ہے، اور ''ب'' کی صورت میں میزان بنک وہ معاہدہ جو امپورٹر کے ساتھ کیا گیا تھا، مندرجہ ذیل طریقے سے ختم کیا جائے گا:-

۱- میزان بنک، مسلم کمرشل بنک کے ساتھ فارورڈ کور کنٹریکٹ کرے گا کہ میزان بنک کو وہ ڈالر جو اسے حبیب بنک سے ۹۰ دن پر خریدنے ہیں، اور جن کی اب امپورٹر کو ضرورت نہیں رہی، وہ ڈالر مسلم کمرشل بنک کو فروخت کرے گا، فرض کریں یہ کنٹریکٹ ۵۹ روپے فی ڈالر پر طے ہوتا ہے۔

۲- معاہدے کی خلاف ورزی کی وجہ سے میزان بنک امپورٹر سے اپنا نقصان پورا کرنے کی حد تک وصول کرے گا، اس مثال میں میزان بنک درآمد کنندہ سے ۲ روپے فی ڈالر (۶۱-۵۹=۲) چارج کرے گا۔

۳- ۹۰ دن بعد میزان بنک حبیب بنک سے ڈالر ۶۱ روپے کے حساب سے حاصل کرے گا، اور ۵۹ روپے کے حساب سے مسلم کمرشل بنک کو فروخت کرے گا۔

پہلے طریقے میں جو مروّجہ ہے، اس میں مستقبل کی طرف بیع کی نسبت ہوتی ہے، جو شرعاً ناجائز ہے، نیز اس میں بیع عینہ کی خرابی بھی ہے، اس سے بچنے کے لئے دُوسرا طریقہ اختیار کیا گیا ہے، جس میں بیع عینہ کی خرابی بھی نہیں، اور مستقبل کی طرف بیع کی نسبت نہیں، بلکہ محض دوطرفہ وعدہ ہے۔

مستقبل کی بیع تو بالاتفاق ناجائز ہے، کیا مستقبل میں دوطرفہ وعدہ جائز ہے؟ اس میں بھی علماء کے درمیان اختلاف ہے:-

دوطرفہ وعدے کا ایفاء فریقین پر قضاءً لازم ہوتا ہے یا نہیں؟ اس بارے میں دو مختلف اقوال سامنے آئے ہیں، جو درج ذیل ہیں:-

قولِ اوّل:- دوطرفہ وعدہ قضاءً لازم نہیں ہوتا، مجمع الفقہ الاسلامی جدہ نے اپنے پانچویں اجلاس میں اسی کو اختیار کیا ہے، اس قول کی بنیاد امام مالکؒ کے ایک قول پر ہے جس میں امام مالکؒ نے ایسے عقود اور معاملات جن کو فی الحال سرانجام نہیں دیا جاسکتا، ان پر دوطرفہ وعدہ کرنے کو ناجائز قرار دیا ہے۔ مثلاً قبضے سے قبل کھانے کی بیع فی الحال سرانجام نہیں دی جاسکتی، لہٰذا اس عقد پر دوطرفہ وعدہ بھی نہیں کیا جاسکتا۔ البتہ امام مالکؒ سے منسوب اس سلسلے میں دوقول اور بھی ہیں، جن میں سے ایک قول کے مطابق یہ مواعدہ مکروہ اور دُوسرے قول کے مطابق یہ مواعدہ جائز ہے۔ چنانچہ ایضاح المسالک کی عبارت میں یہ بات مذکور ہے:-

"القاعدة الخامسة والستون :الاصل منع المواعدة بما لا يصح وقوعه في الحال حماية۔

ومن ثم منع مالك المواعدة في العدة وعلى بيع الطعام قبل قبضه ووقت نداء الجمعه وعلى ماليس عندك۔وفي الصرف مشهورها المنع،وثالثها الكراهة وشهرت ايضا لجوازه في الحال وشبهت بعقد فيه تأخير وفسرت به المدونة"(۱)

---

(۱) ایضاح المسالك، الونشريسي (ابو العباس احمد بن يحي)متحدہ عرب امارات، رباط، التراث الاسلامي، طبع اول ۱۹۸۰ء (ص۲۷۸)

وفی القوانین الفقهیه :

الفرع الخامس یکره الوعد فی الصرف علی المشهور وقیل یجوز وقیل یمنع۔[1]

مجمع الفقہ الاسلامی کی قرارداد کا متن بھی ذیل میں مذکور ہے:-

قرارات مجمع الفقه الاسلامی:

ثالثا :المواعدة وهی التی تصدر من الطرفین تجوز فی بیع المرابحة بشرط الخیار المتواعدین کلیهما او احدهمافاذا لم یکن هناك خیار فانها لا تجوز،لان المواعدة الملزمة فی بیع المرابحة تشبه البیع بنفسه،حیث یشترط عندئذ ان یکون البائع مالکا للمبیع حتی لا تکون هناك مخالفة نهی النبی ﷺ عن بیع الانسان ما لیس عنده۔[2]

هیئة المراجعة والمحاسبة للمؤسسات المالیة الاسلامیة بحرین کی مجلسِ شرعی نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے:-

لا یجوز ان تشتمل وثیقة الوعد او ما فی حکمها علی مواعدة ملزمة للطرفین (المؤسسة والعمیل)لانها تشبه حینئذ عقود البیع نفسه قبل التملك۔(۲/۳)یجوز اصدار المواعدة من المؤسسة والعمیل الآمر بالشراء اذا کانت بشرط الخیار للمتواعدین کلیهما او احدهما۔[3]

---

(۱) القوانین الفقهیة، الجزی (ابو القاسم محمد بن محمد احمد الجزی المالکی متوفی ۷۴۱ھ، بیروت، دارالقلم، طبع اول ۱۹۷۷ء(ص۱۶۶)

(۲) قرارات، قرار ۴/۴۱جده، السعودیه العربیه۔

(۳) المتطلبات الشرعیة لصیغة المرابحة للآمر بالشراء، بحرین (۱۶)

اور "المعايير الشرعية" میں ہے:-

تحرم المواعدة في المتاجرة في العملات اذا كانت ملزمة للطرفين ولو كان ذلك لمعالجة مخاطر هبوط العملة، اما الوعد من طرف واحد فيجوز ولو كان ملزما۔[1]

اور اسی میں ایک اور جگہ ہے:-

تحريم المواعدة الملزمة في مبادلة العملات هو ما عليه جمهور الفقهاء۔ لان المواعدة الملزمة من طرفي المبادلة تشبه العقد الخ[2]

مذکورہ عبارات خلاصہ

ان حضرات کی مذکورہ بالا عبارات کا حاصل یہی ہے کہ دوطرفہ وعدہ اس عقد کے مشابہ ہے جو فی الحال ناجائز ہوتا ہے، مثلاً دوطرفہ وعدہ بیع جس میں بیع مستقبل میں واقع پذیر ہوگی، اس لئے ناجائز ہے کہ یہ اس بیع کے مشابہ ہے جس میں مبیع ابھی بائع کی ملکیت میں نہ آئی ہو، جس کی وجہ سے بیع مستقبل کی طرف مضاف ہو، لہذا یہ بیع فی الحال ناجائز ہوگی، کیونکہ اس میں بيع ماليس عندك (یعنی ایسی چیز کی فروختگی جو بائع کی ملکیت میں نہ ہو) یا بيع قبل القبض لازم آتی ہے۔ جو ناجائز ہے۔ اور چونکہ مواعدہ بھی ایسے وقت میں کیا جارہا ہے جب بائع کے پاس مبیع موجود نہیں ہے لہذا یہ اس بیع کی مانند ہو گیا جو قبضے سے قبل کی جائے۔

دُوسرا قول

دُوسرا قول یہ ہے کہ دوطرفہ وعدے کو مواقعِ حاجت میں فریقین پر قضاءً لازم کیا

---

(۱) المعايير الشرعية، بحرين، (ص۱۸)

(۲) المعايير الشرعية (ص۲۵)

جاسکتا ہے یہ قول احناف، شافعیہ وغیرہ کا ہے، ان حضرات کی عبارات درج ذیل ہیں:-

فتاویٰ خانیه علی هامش الهندية :

وان ذكرا البيع من غير شرط ثم ذكرا الشرط على وجه المواعدة جاز البيع ويلزمه الوفاء بالوعد لان المواعدة قد تكون لازمةفتجعل لازمة لحاجة الناس۔[1]

وفي شرح المجلة للاتاسي:

وان ذكر البيع من غير شرط ثم الشرط على وجه المواعدة فالبيع جائز ويلزم الوفاء بالوعد لان المواعيد قد تكون لازمةفتجعل لازمة لحاجة الناس ....وقال بعد اسطر :وان ذكر البيع بلا شرط ثم ذكر الشرط على وجه المواعدة جاز البيع ولزم الوفاء وقد يلزم الوعد فيجعل هنا لازما لحاجة الناس اليه۔[2]

اور"تطور النقود" میں ہے:-

الصورة الخامسة : هي المواعدة على الصرف وذلك بأن يتفق العميل مع المصرف على ان يشترى منه بعد شهر مثلا نقدا بالآخر كالدولار بالاسترليني او بالريال، فاذا حل الاجل المضروب للصرف ابرما عقد الصرف بينهما وتقاضابالسعر الحاضر۔ ويلجأالتجار عادة الى هذه الصورة

(۱) الفتاوى الخانيه على هامش العالمگيريه (۱۶۵/۲)

(۲) شرح المجلة، الاتاسي (العلامه محمد خالد الاتاسي)پاكستان، كوئته، مكتبه اسلاميه (۴۱۵/۱)

لاستخدامها فی عملیات الاستیراد والتصدیر حتی یضمنوا تجهیز العملة الاجنبیة اللازمة للوفاء بالتزاماتهم المستقبلة۔ وحکم هذه الصورة : الصحة لوجود حقیقة الصرف وشرطه والمواعدة السابقة جائزة لا شئی فیها عند اکثر العلماء، وممن نص علی هذا الشافعی رحمه الله حیث قال: واذا تواعد الرجلان الصرف فلابأس ان یشتری الرجلان الفضة ثم یقرانها عند احدهما حتی یتبایعاها ویصنعا بها ماشاء ا، کما نص علی ذلك ابن حزم فقال: والتواعد فی بیع الذهب بالذهب او بالفضة وفی بیع الفضة بالفضة وفی سائر الاصناف الاربعة بعضها ببعض جائز تبایعا بعد ذلك اولم یتبعایعا لا نه لم یأت نهی عن شئی من ذلك .... ولا دلیل لبعض المالکیة علی کراهة هذه المواعدة اوفسادها۔[1]

مذکورہ عبارات کا خلاصہ

مذکورہ عبارات کا حاصل یہی نکلتا ہے کہ ''مواعدہ'' (جانبین سے وعدہ) بعض اوقات صحیح ہوجاتا ہے، اور قضاءً لازم بھی کیا جاتا ہے، اور اسی موقف کو ''صاحبِ عطر الہدایہ'' نے بھی اختیار کیا ہے۔[2]

یہی جسٹس مفتی محمد تقی عثمانی صاحب کا بھی ہے، چنانچہ وہ اپنے ایک مقالے میں

(۱) تطور النقود (ص ۱۴۸)

(۲) عطر الهدایة، لکهنوی (بحر العلوم مولانا فتح محمد صاحب لکهنوی) مکتبه نشر القرآن دیوبند، یوپی ہندوستان۔(ص ۲۴۳ تا ۲۴۵)

اس مسئلے پر بحث کے دوران فرماتے ہیں:-

وان عبارة قاضی خان رحمه الله بصفة خاصة صريحة في ان المواعدة يمكن ان تجعل لازمة عند الحنفية لحاجة الناس، والمواعدة انما تكون من الطرفين فتبين انه لا بأس بجعلها لازمة عند الحنفية لحاجة الناس، ولا شك ان الحاجة في الزام المواعدة ظاهرة الخ"

''اور قاضی خان کی عبارت ایک خاص صفت کے ساتھ اس سلسلے میں صریح ہے کہ مواعدہ کو لوگوں کی ضرورت کی وجہ سے حضرات حنفیہ کے نزدیک لازم قرار دیا جاسکتا ہے، اور مواعدہ طرفین سے ہوتا ہے، تو یہ بات ظاہر ہوگئی کہ حنفیہ کے نزدیک مواعدہ کو لوگوں کی ضرورت کی وجہ سے لازم قرار دے دیا جائے، اور اس میں شک نہیں کہ مواعدہ کو لازم قرار دینے میں ضرورت بالکل واضح ہے۔''(۱)

مناقشہ اور ترجیح

ان دونوں قولوں میں سے ہمارے نزدیک دُوسرا قول راجح ہے، کیونکہ مسئلہ منصوص تو ہے نہیں، بلکہ اجتہادی ہے، لہٰذا حالاتِ زمانہ کا تقاضا یہ ہے کہ مواعدہ کو قضاءً لازم قرار دے دیا جائے، لیکن اس میں یہ شرط ہے کہ یہ مواعدہ کا لزوم صرف مواقعِ ضرورت میں ہے، اور مواقعِ ضرورت سے مراد یہ ہے کہ وعدے کی خلاف ورزی کی صورت میں کسی ایک فریق کا نقصان ہو رہا ہے۔

جو قول اولوں نے جو دلیل پیش کی ہے کہ اس صورت میں دوطرفہ وعدہ عقدِ مستقبل کے مشابہ ہو جائے گا، اور ایک ایسی چیز کا مواعدہ لازم آجائے گا، جو بوقتِ وعدہ

---

(۱) عقود التوريد والمناقصة، مخطوطه، جامعه دارالعلوم کراچی (ص۴)

ہاتھ میں نہیں ہے، یہ دلیل کوئی وزنی دلیل نہیں ہے، کیونکہ وعدہ اور عقد میں اَحکام اور نتائج کے اعتبار سے فرق ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ دوطرفہ وعدہ حقیقت میں کوئی قطعی عقد نہیں ہوتا ہے، بلکہ وہ تو صرف ایک وقتِ مقرّرہ پر عقد منعقد کرنے کا وعدہ ہوتا ہے، لہٰذا دونوں وعدہ کرنے والوں کو مقرّرہ تاریخ آنے پر باقاعدہ ایجاب وقبول کرنا ہوگا، عقد کے فوری منعقد ہونے یا صرف وعدۂ عقد کرنے کے درمیان ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ جس شخص نے مثلاً خریداری کا عقد کیا، تو مبیع فوری طور پر خریدار کی طرف منتقل ہوجاتی ہے، اور اگر بیعِ سلم ہے، تو مبیع اس کے ذمہ دَین بن جاتی ہے، لہٰذا ذمہ داری کا منتقل ہوجانا ایجاب وقبول کے فوراً بعد ہوگا، لہٰذا ایک اگر ایک شخص نے ایک مکان خریدا اور اس نے ابھی نے اس کی قیمت بائع کو اَدا نہیں کی، تو یہ شخص فوراً بائع کا مدیون بن گیا، چنانچہ اب اس پر مدیون کے سارے اَحکام لاگو ہوں گے، لہٰذا اب اس پر دَین کی حد تک زکوٰۃ ساقط ہوجائے گی، اور مشتری مفلس ہوگیا، تو وہ بقیہ دُوسرے قرض خواہوں کے مساوی سمجھا جائے گا، اسی طرح اگر کسی نے بیع کے تحت کوئی گندم فروخت کی، تو وہ شخص خریدار کا اس مقدار کی حد تک گندم کا مدیون ہوگیا، لہٰذا اس پر بھی اس مقدار تک زکوٰۃ ساقط ہوجائے گی، وغیرہ۔

لیکن دوطرفہ وعدہ کسی پر بھی دَین نہیں بنتا، اور اس پر مذکورہ بالا نتائج مرتب نہیں ہوتے، جیسا کہ ظاہر ہے، بلکہ مذکورہ نتائج اس وقت مرتب ہوں گے، جب یہ دونوں وقتِ مقرّرہ پر باقاعدہ ایجاب وقبول کرکے بیع کو منعقد کریں گے، اس سے پہلے محض وعدے کی بنیاد پر کوئی حکم متوجہ نہیں ہوگا۔ (۱)

دوطرفہ وعدے کے قضاءً لزوم پر کیا اثر مرتب ہوگا؟

دوطرفہ وعدے کے قضاءً لازم ہونے کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ:-

۱- حاکم دونوں فریقین کو اس مقرّرہ تاریخ پر عقد کرنے اور نافذ کرنے پر مجبور کرے گا، اور کسی کو اِنکار جائز نہیں ہوگا۔

---

(۱) عقود التوريد والمناقصة (ص۵)۔

۲-اور اگر ان میں سے کسی ایک نے وعدہ پورا کرنے سے انکار کیا، جس کی وجہ سے دُوسرا فریق حقیقۃً کسی مالی نقصان میں مبتلا ہوگیا، تو اس صورت میں حاکم یا قاضی اسے اس حقیقی نقصان کی تلافی پر مجبور کرے گا، اور اس سلسلے میں درج ذیل حدیث سے اِستدلال کیا گیا ہے:-

"لا ضرر ولا ضرار في الاسلام"

''اسلام میں نہ ضرر ہے، اور نہ کسی کو ضرر پہنچانا ہے۔''[1]

لہٰذا ثابت ہوگیا کہ کرنسیوں کا تبادلہ بصورتِ معاہدہ/مواعدہ راجح قول کے مطابق دُرست ہے۔'

کرنسی کے کاروبار کی ایک نئی اور عالمگیر شکل

عالمی مارکیٹ میں کرنسی کا کاروبار کیا جاتا ہے، جس کی شکل یہ ہوتی ہے کہ امریکا سے پوری دُنیا میں مختلف ممالک کے کرنسی نوٹوں کی قیمتوں کا اجراء ہوتا ہے، ایک آدمی لاہور پاکستان میں بیٹھ کر سیٹلائٹ کے ذریعے کمپیوٹر سکرین پر وہ قیمتیں وصول کرتا ہے، قیمتیں ملکی حالات کی وجہ سے کم یا زیادہ ہوتی رہتی ہیں، یہ آدمی ان قیمتوں پر کرنسی کی خرید وفروخت کرتا ہے، لیکن یہ آدمی ضابطے کی رُو سے براہِ راست یہ کاروبار نہیں کرسکتا، بلکہ کسی کمپنی کے ذریعے یہ کاروبار کرتا ہے، کمپنی نے ایک اُصول وضع کیا ہوتا ہے، وہ یہ کہ دو لاکھ ڈالر کی ایک لاٹ ہوتی ہے، جو آدمی خرید کر پھر اس کو فروخت کرسکتا ہے، لیکن اس آدمی کو صرف اس کا ۵ فیصد کمپنی کو اپنے نام پر جمع کروانا ہوتا ہے، جو کہ صرف ۱۰۰۰ ڈالر بنتا ہے، ایک ہزار ڈالر سے اپنا اکاؤنٹ کھلوا کر اب یہ آدمی اس قابل ہوتا ہے کہ دُنیا کی مارکیٹ میں یہ آدمی ایک لاٹ خرید سکتا ہے، اس آدمی کی طرف سے بقیہ رقم بطورِ ضمانت کمپنی جمع کراتی ہے، تو اس طرح اس آدمی کا بظاہر ایک ہزار ڈالر کی سرمایہ کاری ہوئی، لیکن یہ آدمی کاروبار دو لاکھ ڈالر کا کر رہا ہوتا ہے، یعنی یہ آدمی دو لاکھ ڈالر کی کرنسی کی خرید وفروخت کرسکتا ہے۔

---

(۱) الدراية في تخريج احاديث الهداية (۲۸۲/۲)

اب اس آدمی کو نفع یا نقصان کس طرح ہوتا ہے؟ اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ یہ آدمی کمپیوٹر سکرین پر دُنیا کے مختلف بنکوں کی طرف سے دی گئی قیمتوں کا جائزہ لیتا ہے، اور کرنسی کے ماہرین اپنی رائے دیتے رہتے ہیں کہ آیا اس کرنسی کی قیمت آئندہ بڑھ جائے گی، یا کم ہوجائے گی، اس کے علاوہ اس آدمی کو کرنسی کے متعلق مختلف ملکوں کی خبریں بھی موصول ہوتی رہتی ہیں، اور پھر کمپیوٹر پر ہی مخالف گراف کے ذریعے اس کرنسی کی صورتِ حال کا جائزہ لیتا ہے، کہ آئندہ لمحات میں اس کرنسی کی کیا صورتِ حال ہوگی، تو ان تمام قرائن کے ذریعے یہ آدمی ایک رائے قائم کرکے اس کو خرید لیتا ہے، مثلاً سکرین پر اس کو پاؤنڈ سٹرلنگ کی قیمت ۱ء۶۷۰۰ نظر آرہی ہے، یہ آدمی کمپنی کے ذریعے بذریعہ ٹیلی فون اس بنک سے اس قیمت کی تصدیق کرواتا ہے کہ آیا آپ کی قیمت فروخت یہی ہے، وہ اس کی تصدیق کرلیتا ہے، تصدیق کے بعد یہ شخص پہلے ان سے زبانی معاہدہ کرتا ہے کہ ایک لاٹ میں نے خرید لی، اور یہ میری ہوگئی، اب اس کو ہر صورت اس کا نفع یا نقصان اُٹھانا ہوگا، اس خریداری پر حسی قبضہ (Physical Possion) کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، کیونکہ وہ کرنسی اس سے ہزاروں میل دُور ہے، لیکن حکمی قبضہ (Constructive Possion) ہوگیا، یعنی وہ کرنسی اس کے ضمان میں آگئی، اب جب اس کرنسی کی قیمت بڑھ گئی تو اس طریقے پر بذریعہ ٹیلی فون اس نے اس کو فروخت کردیا، مثلاً اگر ۱ء۶۷۰۰ پر خریدا اور ۱ء۶۷۱۰ پر اس کو فروخت کردیا، اور قیمتِ فروخت کا بھی تحریری معاہدہ ہوگیا، جو دس اعشاریہ اس کو نفع میں بچے، اس کی قیمت ۱۲۵ ڈالر ہوئی، وہ اس طرح کہ انہوں نے ایک پوائنٹ کی قیمت ۱۲ء۵۰ ڈالر طے کی ہوئی ہے، اس طرح:-

۱۰ پوائنٹ کی قیمت ۱۲ء۵۰×۱۰=۱۲۵

یہ اس شخص کا نفع ہے، اگر کرنسی کی قیمت کم ہوجائے، تو اسی شرح سے اس کو نقصان اُٹھانا پڑے گا۔

بیچ میں جو کمپنی ہے، وہ کاروبار کروانے کے لئے درج ذیل سہولتیں مہیا کرتی ہے:-

۱- ٹیلی فون کے ذریعے رابطہ۔

۲- مارکیٹ جہاں بیٹھ کر کاروبار کیا جاتا ہے۔

۳- انٹرنیٹ سسٹم۔

۴- دو لاکھ ڈالر کا زرِضمانت، وغیرہ۔

ان تمام سہولتوں کے ساتھ یہ شخص ایک ''ٹریڈ'' مکمل کر لیتا ہے، یعنی ایک دفعہ کرنسی خرید کر پھر فروخت کرنے کو ایک ٹریڈ کہتے ہیں۔

اس ایک ٹریڈ پر کمپنی ۶۰ ڈالر کمیشن وصول کرتی ہے، اس ٹریڈ میں نفع ہو یا نقصان، کمپنی کا ۶۰ ڈالر کمیشن طے ہے، یہ اس صورت میں ہے کہ اگر وہ ایک کرنسی کو اسی دن خرید کر فروخت کردے، اگر آج اس نے کرنسی خریدی ہے، اور اس کی قیمت مناسب نہیں مل رہی ہے، پھر اس کو ایک دن یا چند دن بعد فروخت کرنا چاہتا ہے، تو کمپنی اس سے ۶۰ ڈالر کے علاوہ ہر دِن کے حساب سے ۲۰ ڈالر مزید وصول کرے گی، اس لئے کہ کمپنی کا دو لاکھ ڈالر کاروبار میں بطور زَرِضمانت جمع ہو رہا ہے، اس پر کمپنی ۲۰ ڈالر یومیہ وصول کرتی ہے۔

اس وقت پوری دُنیا میں کھربوں ڈالر کا یہ کاروبار روزانہ ہوتا ہے، ایک اندازہ کے مطابق دُنیا میں سب سے بڑا کاروبار یہ ہو رہا ہے۔

اس شکل میں یہ کاروبار شرعی نقطۂ نظر سے جائز نہیں، جس کی وجوہات درج ذیل ہیں:-

۱- جہاں تک ہمیں معلوم ہے اس طرح کاروبار میں جب کوئی لاٹ خریدی جاتی ہے، تو وہ خریدار کو متعین اور الگ کر کے حوالے نہیں کی جاتی، بلکہ اس کے اکاونٹ میں تحریر کردی جاتی ہے، پھر جب وہ خریدار اسے آگے کسی شخص کو فروخت کرتا ہے، تو اس وقت اگر اسے نفع ہو، تو صرف نفع واپس کر دیا جاتا ہے، اور اگر نقصان ہو، تو اس سے وہ نقصان طلب کر لیا جاتا ہے، خلاصہ یہ کہ پوری خرید کردہ لاٹ تحویل میں نہیں دی جاتی، بلکہ کاغذی طور اس کے اکاونٹ میں منتقل کر دی جاتی ہے، اور آخر میں نفع اور نقصان کا فرق برابر کر لیا جاتا

ہے، جو سٹے کی ایک قسم ہے۔

۲- یہ واضح رہے کہ کرنسی کے حکمی قبضے کے لئے یہ کافی نہیں ہے کہ کرنسی کی قیمت بڑھنے یا گھٹنے کا نقصان متعلقہ شخص کے ذمے ہو جائے، بلکہ قبضے کے لئے یہ ضروری ہے کہ خریدی ہوئی کرنسی غیر خریدی شدہ کرنسی سے بالکل ممتاز کر کے کرلی جائے، اور خریدار یا تو خود قبضہ کرے، یا اس کا کوئی وکیل اس کی طرف اسے اپنی تحویل میں اس طرح لے لے کہ وہ متعینہ کرنسی جل جائے یا چوری ہو جائے، تو نقصان اس خریدار کے ذمہ سمجھا جائے، ظاہر ہے کہ یہ صورت مذکورہ کاروبار میں نہیں کہ کرنسی کو الگ کرلیا گیا ہو، اور خریدار یا اس کے کسی نمائندے کی تحویل میں دیا گیا ہو۔

واضح رہے کہ شرعی اعتبار سے کرنسی اور دُوسری اجناس کی تعیین میں یہ فرق ہے کہ دُوسری اجناس اِشارے یا علامتوں سے متعین ہوسکتی ہیں، لیکن کرنسی اس وقت تک متعین نہیں ہوتی، جب تک کہ اس پر کوئی کوئی شخص خود یا اپنے نمائندے کے ذریعے قبضہ نہ کرے۔

۳- اُوپر ذِکر کردہ طریقے میں خریدار صرف ایک ہزار ڈالر کی ادائیگی کرتا ہے، باقی کی ادائیگی نہیں کرتا، اگرچہ باقی رقم کمپنی بطورِ زَرِ ضمانت جمع کراتی ہے، مگر یہ رقم درحقیقت خریدار کے ذمہ دَین ہوتی ہے، دُوسری طرف کرنسی بیچنے والا خریدار کو اس شرعی طریقے پر قبضہ نہیں دیتا جس کا ذِکر اُوپر ۲ میں کیا گیا، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ رقم دونوں طرف دَین ہوتی ہے، لہٰذا ''بیع الکالئ بالکالئ'' میں داخل ہونے کی وجہ سے جائز نہیں۔

۴- درمیانی کمپنی جو کمیشن وصول کرتی ہے، وہ یا تو ضمانت کی فیس ہے، یا تو اس رقم کا معاوضہ ہے جو وہ خریدار کی طرف سے فروخت کرنے والے کو اَدا کرتی ہے، پہلی صورت میں یہ ''اُجرت علی الکفالہ'' ہے، اور دُوسری صورت میں یہ قرض پر سود ہے، اور دونوں طریقے ناجائز ہیں۔



بابِ ششم

قدرِ زَر (Value)

قدرِ زَر

پُرانے زمانے میں کرنسی یا زَر کا تعلق سونے چاندی کے ایک مخصوص معیار کے ساتھ ہوتا تھا، جب سونے چاندی کا یہ معیار بڑھتا، تو کرنسی یا زَر کی قیمت بھی بڑھتی، اور جب سونے چاندی کا یہ معیار گھٹتا، تو کرنسی یا زَر کی قیمت بھی گھٹتی، لیکن اب جبکہ کرنسی یا زَر سونے چاندی سے بالکل لاتعلق ہو گیا، اور سونے چاندی کے ساتھ زَر کا کوئی تعلق نہیں رہا، تو اَب کرنسی یا زَر کی قیمت (قدر) کے بڑھنے اور گھٹنے کا تعلق سونے چاندی کے ساتھ نہیں رہا، بلکہ اس کا معیار دُوسرا مقرر ہوا، یعنی ''اشیاء'' (Goods Commodities) کی قیمتیں، لہٰذا اب قدرِ زَر ''قوّتِ خرید'' (Purchasing Power) سے عبارت ہے، یعنی وہ قوّت جس کی بدولت زَر اپنے عوض دُوسری اشیاء و خدمات (Services) حاصل کر سکتا ہے۔

زَر بذاتِ خود زیادہ اہمیت کا مالک نہیں ہوتا، اس کی طلب محض اس لئے کی جاتی ہے کہ اس کی مدد سے دُوسری اشیاء اور خدمات حاصل کرنے میں مدد ملتی ہے، اگر زَر ایک مخصوص مقدار کے عوض زیادہ اشیاء اور خدمات حاصل کرے، تو زَر کی قدر زیادہ ہوگی، اور اگر اسی مخصوص مقدار کے عوض کم اشیاء اور خدمات حاصل کرے، تو زَر کی قدر کم ہوگی۔ مثلاً اگر:۔

۳۰ روپے = تین کلو آٹا (۲۰۰۱ء)

۳۰روپے=دوکلوآٹا(۲۰۰۲ء)

پہلی مثال میں زَر کی قدر دُوسری مثال کے مقابل زیادہ ہے، اور دُوسری مثال میں زَر کی قدر پہلی کے مقابلے میں کم ہوگئی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ زَر کی قدر اور اشیاء وخدمات کی قیمتوں میں متضاد رشتے ہیں، جب قیمتوں میں اِضافہ ہوتا ہے، تو زَر کی قدر گھٹ جاتی ہے، اور جب قیمتوں میں کمی ہوتی ہے، تو زَر کی قدر میں اِضافہ ہوتا جاتا ہے۔

قیمتِ شیٔ↑ قدرِ زَر↓ ←→ قیمتِ شیٔ↓ قدرِ زَر↑

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ جب سے زَر سونے اور چاندی کے دائرے سے آزاد ہوگیا ہے، تو اس کی قدر اشیاء اور خدمات سے وابستہ ہوگئی ہے، اس لئے ہم خلاصۃً کہہ سکتے ہیں کہ زَر کی قدر زَر کی قوتِ خرید سے عبارت ہے، جسے عربی میں "القوة الشرائية" اور انگریزی میں "Purchasing Power" کہا جاتا ہے۔[1]

قدرِ زَر کے تغیرات

قدرِ زَر میں مختلف قسم کے تغیرات واقع ہوتے رہتے ہیں، اور اس میں یہ تغیرات واقع ہونا کوئی نئی بات نہیں، اور نہ یہ اس زمانے کے خاص ہیں، بلکہ گزشتہ زمانوں میں بھی یہ

---

(۱) تعارفِ زَر و بنکاری (ص ۴۷)

ـــــــ کتاب معاشیات (۲/ ۴۷)

ـــــــ احکام الاوراق النقدية (ص۲۷)

ـــــــ کاغذی نوٹ اور کرنسی کا حکم (ص ۴۵)

ـــــــ مقدمة في النقود والبنوك :

"قيمة النقود بانها عبارة عن سلطان النقود في المبادلة بسائر السلع والخدمات۔ای القوة الشرائية للنقود" (ص٦٧)

Introduction to Economic Principles.P:332

The Theory of Money and Credit.P:117

تغیرات وقوع پذیر ہوئے ہیں، یہی وجہ ہے کہ آثار اور کلامِ فقہائے کرام میں اس پر مفصل مباحث کتبِ فقہ میں موجود ہیں۔

ہم اپنے اس مقالے میں ان تغیرات کا قدرِ تفصیل کے ساتھ جائزہ لے رہے ہیں، کیونکہ بہت سارے اَحکام کا ان مباحث سے تعلق ہے، اوراس زمانے میں قدرِ زَر کے تغیرات کو خاص طور پر اہمیت دی جارہی ہے۔

زَر کو چار قسم کے تغیرات لاحق ہوتے ہیں، جو درج ذیل ہیں:-

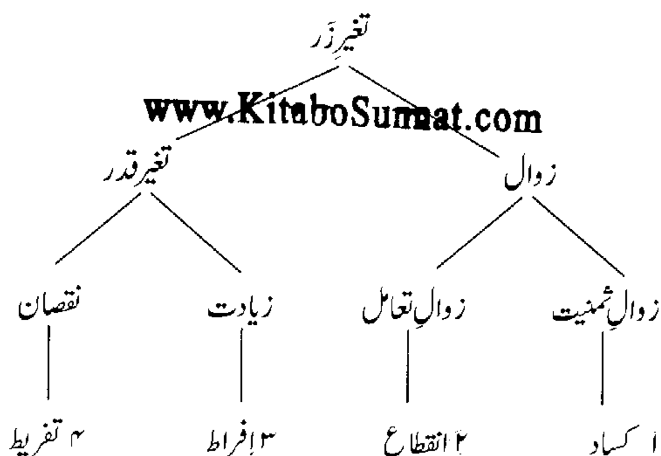
۱-انقطاعِ زَر

۲-کسادِ زَر

۳-اِفراطِ زَر

۴-تفریطِ زَر

ذیل میں نقشہ ملاحظہ ہو:-



اس کا مطلب یہ ہے کہ زَر کو بعض اوقات ایسا تغیر لاحق ہو جاتا ہے کہ اگر وہ ثمنِ اِصطلاحی ہو، تو اس کی ثمنیت بالکل ختم ہو جاتی ہے، اور اگر وہ ثمنِ خلقی ہو، تو اس کی ثمنیت تو

ختم نہیں ہوتی، البتہ اس کا تعامل ختم ہوجاتا ہے، یہ تغیر "انقطاع" اور "کساد" سے واقع ہوتا ہے، اور بعض اوقات زر کو ایسا تغیر لاحق ہوجاتا ہے کہ اس کی وجہ سے یا تو زر کی قدر میں اضافہ ہوجاتا ہے، یا زر کی قدر میں کمی ہوجاتی ہے، یہ تغیر "اِفراط" اور "تفریط" سے واقع ہوتا ہے۔

اِنقطاع (Forfeture)

اِنقطاع "قطع" سے ماخوذ ہے، جس کے معنی ختم ہونے کے ہیں، اور اِصطلاحِ فقہ میں اِنقطاع کا مطلب یہ ہے کہ عام شہر میں کوئی زر دستیاب نہ ہو، اگرچہ صرافوں (Money Changers) اور گھروں میں موجود ہو۔

چنانچہ علامہ شامیؒ اِنقطاع کے معنی بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:-

ان لا یوجد النقد فی السوق وان وجد فی ید الصیارفة والبیوت الخ

"زر بازار میں نہ ملے، اگرچہ صرافوں کے ہاں اور گھروں میں موجود ہو۔"(۱)

اور علامہ زرقانی اور بنانی اِنقطاع کے معنی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"انہ الانعدام جملة فی بلد تعامل المتعاقدین وان وجدت الفلوس حین القبض فی غیرھا۔"

"اِنقطاع یہ ہے کہ ایک ساتھ زر عاقدین کے شہر سے غائب ہوجائے، اگرچہ فلوس قبضے کے وقت دُوسرے کسی شہر میں موجود ہوں۔"(۲)

یاد رکھنا چاہئے کہ فقہائے کرام اس مفہوم کے لئے اِنقطاع کے علاوہ اور بھی

(۱) ردالمحتار (۷/۴۱)

(۲) شرح الزرقانی علی خلیل بحاشیة البنانی (۵/۶۰)

مختلف الفاظ استعمال کرتے ہیں، صرف اِنقطاع کے لفظ پر اِکتفاء نہیں کرتے، جیسا کہ عباراتِ فقہاء سے واضح ہوجائے گا۔

مذاہبِ فقہاء

اِنقطاع کے بارے میں حضرت اِمام اعظمؒ کا ایک قول یہ ہے کہ اس صورت میں بیع فاسد ہوجائے گی، لیکن دُوسرا قول جو مفتیٰ بہ ہے، اور وہ صاحبینؒ، اور ائمہ ثلاثہؒ کا بھی مذہب ہے کہ اِنقطاع سے بیع فاسد نہیں ہوتی۔ چنانچہ علامہ شامیؒ فرماتے ہیں:-

ان انقطعت بان لا توجد في السوق ولووجدت في يد الصيارفة أو في البيوت، فقيل : يفسد البيع، وقيل : تجب في آخر يوم الانقطاع وهو المختار۔

''اگر زَر منقطع ہوا، کہ بازار میں دستیاب نہ ہو، گو صرافوں کے ہاں یا گھروں میں موجود ہو، تو کہا گیا ہے کہ بیع فاسد ہوجائے گی، اور کہا گیا ہے کہ جس دن اِنقطاع ہو رہا تھا، اس آخری دن میں اس کی جو قیمت تھی، وہ قیمت واجب ہوگی، اور یہی قول مختار ہے۔''[1]

علامہ شامیؒ مزید فرماتے ہیں:-

"فان انقطع ذلك فعليه من الذهب والفضة قيمته في آخر يوم انقطع وهو المختار۔"

اگر زَر منقطع ہوگیا، تو اس کے ذمہ سونے یا چاندی کی قیمت واجب ہے، جس میں یوم الانقطاع کا اعتبار ہوگا، اور یہی راجح ہے۔''[2]

اور علامہ شامیؒ اپنے ایک رسالے میں فرماتے ہیں:-

---

(۱) العقود الدرية في تنقيح الفتاوى الحامدية، شامي (علامه محمد امين المعروف بابن عابدينؒ) بيروت، دارالمعرفة، طبع دوم (۱/ ۲۸۰)۔

(۲) رد المحتار (۷/ ۴۱)۔

"وان انقطع بحيث لا يقدر عليها فعليه قيمتها في آخر يوم انقطع من الذهب والفضة هو المختار۔"

''اگر زَر منقطع ہوگیا، یہاں تک کہ وہ عاجز ہوگیا، تو اس پر اس کی قیمت سونے چاندی میں سے واجب ہے، جس میں یوم الانقطاع کا اعتبار ہے، اور یہی راجح ہے۔''(۱)

اسی رسالے میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں:-

"وان انقطعت تلك الدراهم اليوم كان عليه قيمة الدراهم قبل الانقطاع عند محمد وعليه الفتوى۔"

''اور اگر وہ دَراہم آج منقطع ہوگئے، تو اس کے ذمہ اِنقطاع سے قبل دَراہم کی جو قیمت تھی وہ واجب ہے، یہ اِمام محمدؒ کا موقف ہے، اور اسی پر فتویٰ ہے۔''(۲)

اِمام ابویوسفؒ، اِمام محمدؒ اور اَئمہ ثلاثہؒ کے نزدیک اِنقطاع کے وقت قیمت واجب ہوتی ہے، اور عقدِ فاسد برقرار رہتا ہے، اتنی بات پر ان سب کا اتفاق ہے، البتہ اختلاف اس میں ہے کہ اس سلسلے میں کس وقت کی قیمت کا اعتبار ہوگا؟

مالکیہ کے نزدیک صحیح قول کے مطابق فیصلے کے وقت جو زَر منقطع کی جو قیمت ہوگی، وہ واجب ہوگی۔

شافعیہ کے نزدیک جس وقت بائع مشتری سے ثمن کا مطالبہ کرے گا، اس وقت زَرِ منقطع کی جو قیمت ہوگی، اس کا اعتبار ہوگا، اور اگر بیع مؤجل ہے، تو جب ادائیگی کی مقررہ تاریخ پہنچ جائے، تو اس وقت زَر کی جو قیمت ہوگی، اس کا اعتبار ہوگا۔

---

(۱) تنبيه الرقود على مسائل النقود، ضمن رسائل ابن عابدين، لاهور، پاکستان، سهيل اكيذمى ١٩٧٦ء (٥٨/٢)

(٢) تنبيه الرقود على مسائل النقود (٥٧/٢، ٦٠)

حنابلہ اور اِمام محمدؒ کے نزدیک یوم الانقطاع کی قیمت کا اعتبار ہوگا، یعنی جس دن زَر منقطع ہورہا ہے، اس سے ایک دن پہلے زَر کی جو قیمت تھی، اس کا اعتبار ہوگا، البتہ حنابلہ کے ہاں اگر وہ مثلی ہے، اور مثل دستیاب ہے، تو مثل واجب ہوگی۔

اِمام ابو یوسفؒ کے نزدیک یوم المعاملہ کی قیمت کا اعتبار ہوگا، یعنی جس دن عقد ہوا تھا، اس دن اس زَر کی جو قیمت تھی، اس کا اعتبار ہوگا۔

خلاصہ درج ذیل ہے:-

اِمام ابوحنیفہؒ	=	بیع فسخ / فاسد
مالکیہ	=	وقتِ فیصلہ کی قیمت
شافعیہ	=	وقتِ مطالبہ کی قیمت
حنابلہ+ اِمام محمدؒ	=	وقتِ انقطاع
اِمام ابو یوسفؒ	=	وقتِ معاملہ/عقد

علامہ شامیؒ فرماتے ہیں:-

"واما الكساد والانقطاع فالذي يظهر ان البيع لا يفسد اجماعا اذا سميا نوعامنه وذلك لانهم ذكروافي الدراهم التي غلب غشها ثلثة اقوال: الاول: قول ابي حنيفة بالبطلان والثاني : قول الصاحبين بعدمه وهو قول الشافعي واحمد، لكن قال ابويوسف عليه قيمتها وقت البيع وقال محمد : يوم الانقطاع، وفي الذخيرة: الفتوى على قول ابي يوسف وفي التتمة والمحتار والحقائق بقول محمد يفتي رفقابالناس۔"

"کساد اور اِنقطاع میں بظاہر بالاتفاق بیع فاسد نہیں ہوتی، جبکہ عاقدین زَر کی ایک خاص قسم ذکر کریں، اور یہ اس وجہ سے کہ

فقہائے کرام نے ان دراہم کے بارے میں جن میں کھوٹ غالب ہوجائے، تین قول ذکر کئے ہیں، ایک قول باطل ہونے کا ہے، جو امام اعظمؒ کا ہے، دُوسرا قول صاحبینؒ کا ہے، اور وہ یہ کہ عقد باطل نہیں ہے، اور یہی قول امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کا بھی ہے، لیکن امام ابویوسفؒ فرماتے ہیں کہ اس پر یوم العقد کی قیمت واجب ہے، اور امام محمدؒ فرماتے ہیں، کہ اس پر یوم الانقطاع کی قیمت واجب ہے، ذخیرہ میں ہے کہ فتویٰ امام ابویوسفؒ کے قول پر ہے، اور تتمہ، مختار اور حقائق میں ہے کہ فتویٰ امام محمدؒ کے قول پر ہے، لوگوں کی آسانی کے لئے۔"(۱)

امام صاحبؒ کے قول کی وجہ

امام صاحبؒ کے قول کی وجہ یہ ہے کہ جب زر ختم ہوگیا، تو ثمن ختم ہوگیا، اور بیع ثمن کے بغیر نہیں ہوتی، اس لئے بیع فسخ ہوجائے گی۔

صاحبینؒ کے قول کی وجہ

امام ابویوسفؒ وقتِ تعامل اور وقتِ عقد کی قیمت کا اعتبار اس لئے کرتے ہیں کہ مشتری کے ذمہ جو ثمن واجب ہوا ہے، وہ عقد کی وجہ سے ہے، لہٰذا قیمت میں بھی اسی وقت کا اعتبار ہوگا۔

اور امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ یوم الانقطاع کی قیمت کا اعتبار ہوگا، کیونکہ انقطاع سے پہلے مشتری ثمن کی ادائیگی پر قادر تھا، ثمن کی ادائیگی سے عجز انقطاع سے آگیا، لہٰذا قیمت میں وقتِ عجز کا اعتبار ہوگا۔(۲)

---

(۱) تنبیه الرقود علی مسائل النقود (۶۲/۲)

(۲) مجلة مجمع الفقه الاسلامي، جده، الدورة الخامسة، العدد الخامس، الجزء الثالث ۱۴۰۹هج، (ص ۱۶۵۴)

مذہبِ مالکیہ

مالکیہؒ کے ہاں معتمد اور صحیح قول کے مطابق اس صورت میں وقتِ فیصلہ کی قیمت کا اعتبار ہوگا، اور دُوسرا قول مالکیہ کا یہ ہے کہ جس دن مقررّہ تاریخ ادائیگی ہو، اور جس دن زَر منقطع ہوجائے، ان دونوں میں سے جو بعد میں ہو، اس کی قیمت کا اعتبار ہوگا، مثلاً: اگر یوم ادائیگی بیس دن بعد ہو، اور اِنقطاع اٹھارہ دن بعد ہوا، تو یوم ادائیگی کی قیمت کا اعتبار ہوگا۔

مالکیہ کی عبارات ملاحظہ ہوں:-

فی الشرح الکبیر وحاشیة الدسوقی: ان عدمت الفلوس بالکلیة فی بلد المتعاقدین وان وجدت فی غیرها، فالقیمة واجبة علی من ترتبت علیه مما تجددای یدفعها مماتجددوظهر من المعاملة، فیقال: ماقیمة العشرة من الدراهم التی عدمت بهذه الدراهم التی تجددت فیقال: ثمانیة دراهم، مثلافیدفع المدین ثمانیة من تلك الدراهم التی تجددت واذا قیل : قیمتها : اثنا عشر، دفع اثنی عشر منها وهکذا۔

وقال خلیل: تعتبر القیمة وقت اجتماع الا ستحقاق ای الحلول ویوم العدم، فالعبرة عنده بالمتاخر منهما، فان کان العدم والا ستحقاق حصلافی وقت واحد، فالا مر ظاهر، وان تقدم احدهما علی الآخر فالعبرة بالمتاخرمنهما اذلا یجتمعان الافی وقت المتاخر منهما، فان استحقت ثم عدمت اعتبرت القیمة یوم العدم، وان عدمت ثم استحقت اعتبرت القیمة یوم الا ستحقاق، ولم یذکر الخلیل القول المعتمد۔

وقال الدردير: المعتمد ان القيمة تعتبر يوم الحكم۔۔۔وقال الخرشي: ان عدمت فالواجب على من ترتبت عليه قيمتها مما تجدد وظهر، وتعتبر قيمتها وقت ابعد الاجلين عند تخالف الوقتين من العدم والاستحقاق ۔۔۔وفي شرح الزرقاني: وهذا كله على مختار المصنف خليل هنا تبعالابن الحاجب تبعا للخمي وابن محرر، والذي اختاره ابن يونس وابو حفص، ان القيمة تعتبر يوم الحكم، قال ابو الحسن الشاذلي: وهو الصواب وقال البرزلي: وهو ظاهر المدونة"[1]

اس پوری عبارت کا خلاصہ یہی نکلتا ہے کہ مالکیہ کے ہاں اِنقطاع کی صورت میں دوقول ہیں، ایک یہ ہے کہ یوم الاستحقاق اور یوم العدم میں جو دُور ہوگا، اس دن کی قیمت کا اعتبار ہوگا، یوم الاستحقاق سے مراد یہ ہے کہ جس دن ادائیگی ضروری ہے، اور یوم العدم کا مطلب یہ ہے کہ جس دن وہ زَر منقطع ہوگیا، اور دوسرا قول یہ ہے کہ یوم الحکم کا اعتبار کی قیمت کا اعتبار ہے، اور یہی قول ان کے نزدیک راجح اور دُرست ہے، جیسا کہ شرح زرقانی کی مذکورہ عبارت سے واضح ہے۔

شافعیہ

ان کے ہاں اِنقطاع کی صورت میں یوم العقد یا یوم المعاملہ کی قیمت واجب ہوتی ہے، لیکن یہ اس صورت میں ہے کہ زَر مثلی نہ ہو، ورنہ مثلی ہونے کی صورت میں مثل واجب ہے۔

علامہ رملیؒ فرماتے ہیں:-

---

(۱) حاشية الدسوقي (۴۶،۴۵/۳)، الخرشي على الخليل (۵۵/۵)، شرح الزرقاني على مختصر خليل (۶۰/۵)

"فان فقد وله مثل وجب والا قيمته وقت المطالبة "

"اگر زَر مفقود ہو گیا، اور اس کی مثل ہو، تو مثل واجب ہے، ورنہ زَر کی مطالبے کے وقت جو قیمت بنتی ہے، وہ واجب ہے۔"(۱)

اور علامہ ابنِ حجر الھیتمیؒ فرماتے ہیں:-

"ويرد وجوبا حيث الاستبدال المثل في المثلي ولو نقدا ابطله السلطان لانه اقرب الى حقه "

"مثلی میں لازمی طور پر مثل واپس کرے گا، اگرچہ سلطان نے زَر کو باطل کر دیا، کیونکہ یہ حقدار کے حق کے زیادہ قریب ہے۔"(۲)

اور علامہ سیوطیؒ فرماتے ہیں:-

ان عدمت الفلوس العتق فلم توجد اصلارجع الى قدر قيمتها من الذهب والفضة، ويعتبر ذلك يوم المطالبة الخ"

"اگر پُرانے فلوس معدوم ہو گئے، اور بالکل دستیاب نہ ہوں، تو اس صورت میں سونے چاندی میں اس کی قیمت واجب ہوگی، اور قیمت میں یوم المطالبہ کا اعتبار ہوگا۔"(۳)

حنابلہ

ان کا موقف وہی ہے جو اِمام محمدؒ کا ہے، یعنی یوم الانقطاع کی قیمت کا اعتبار ہے،

---

(۱) نهاية المحتاج الى شرح المنهاج، الرملي (شمس الدين محمد بن ابى العباس الرملي المتوفى ۱۰۰۴ هج)بيروت، احياء التراث العربي (۳/۳۹۹)

(۲) تحفة المحتاج مع حاشية الشرواني، الهيتمي (علامه احمد بن حجر الهيتمي الشافعي)(۵/۴۴)

(۳) الحاوى للفتاوى، السيوطى (علامه جلال الدين عبد الرحمن بن ابى بكر السيوطي المتوفى ۹۱۱ هج) بيروت، المكتبة العصرية، طبع اول ۱۴۱۱هج

چنانچہ علامہ بہوتیؒ فرماتے ہیں:-

"فان اعوز المثل قال فی الحاشية: عوز الشئی عوزا من تعب عز فلم يوجد، واعوزنی المطلوب مثل اعجزنی لفظا ومعنی، لزم المقترض قيمته، ای المثل يوم اعوازه، لانها حينئذ ثبتت فی الذمة، ويجب علی المقترض رد قيمة ماسوی ذلك ای المكيل والموزون لانه لامثل له فضمن بقيمته كالغصب۔"

''اگر مثل سے عاجز آ گیا......تو مقروض پر مثل کی قیمت واجب ہوگی، اوراس میں یوم العجز کی قیمت کا اعتبار ہوگا، کیونکہ یہی ذمہ میں واجب ہوگئی ہے، اور جو مثلی نہ ہو، مثلاً مکیلی اور موزونات میں سے نہ ہو، وہاں قیمت واجب ہے، اور یہ مسئلہ غصب کی طرح ہے۔''(۱)

ان میں عبارات میں آپ نے دیکھا کہ اِنقطاع کے لئے اِنقطاع کے علاوہ لفظ ''عدم'' اور لفظ ''اعواز'' بھی استعمال ہوا۔

کساد (Depression)

''کساد'' کے لئے بھی فقہائے کرامؒ نے مختلف الفاظ استعمال فرمائے ہیں، مثلاً: ''ابطال''، ''قطع التعامل''، ''ترک التعامل''۔

کساد کے معنی کھوٹے ہونے کے ہیں، اور اِصطلاح میں کساد کی تعریف علامہ ابنِ عابدینؒ کی زبانی سنئے:-

"والكساد : ان تترك المعاملة بها فی جميع البلاد "(۲)

(۱) كشف القناع عن متن الاقناع، البهوتی(منصور بن يونس البهوتی المتوفی ۱۰۴۶ھ، مكة المكرمة، مكتبة الحكومة ۱۳۹۴ھ (۳/۳۰۲)

(۲) ردالمحتار (۷/۴۱)

''اور کساد یہ ہے کہ زَر کے ساتھ تمام شہروں میں معاملہ ترک کیا جائے۔''

اِنقطاع اور کساد میں معنی یہ فرق ہوا کہ اِنقطاع میں زَر غائب اور معدوم ہوجاتا ہے، اور کساد میں زَر رہتا ہے، لیکن لوگ اس کے ساتھ تعامل ختم کر لیتے ہیں، چنانچہ کساد کی وجہ سے زَر اِصطلاحی کی ثمینت بالکل ختم ہوجاتی ہے، اور وہ سامان کے حکم میں ہوجاتا ہے۔

حضراتِ حنفیہؒ کے ہاں اِنقطاع اور کساد میں حکماً کوئی فرق نہیں، چنانچہ:-

۱- اِمام ابوحنیفہؒ کا مسلک یہ ہے کہ اگر تمام شہروں میں تعامل ترک ہوجائے، تو معاملہ فسخ / فاسد ہوجائے گا، البتہ اگر بعض شہروں میں تعامل باقی ہو، تو اس صورت میں بعض عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ معاملہ فسخ سمجھا جائے گا، اور بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ اس صورت میں معاملہ فاسد نہیں ہوگا۔

بیع فاسد ہونے کی صورت میں اگر مبیع موجود ہو، تو مشتری بائع کو مبیع واپس کرے گا، اور مبیع موجود نہ ہو، تو اگر مثلی ہے، یعنی مبیع مکیلات یا موزونات کے قبیل میں سے ہے، تو اس کی مثل واپس کرے گا، اور اگر مثلی نہیں ہو، تو اس کی قیمت واپس کرے گا۔

البتہ اگر معاملہ قرض کا ہو، یا بیوی کے مہر کا ہو، تو وہی زر واپس کرنا ہوگا، اگر چہ کھوٹا ہو۔

۲- حضراتِ صاحبینؒ کے نزدیک اس صورت میں بیع فسخ نہیں ہوگی، البتہ بائع کو فسخِ بیع کا اِختیار رہے گا، اور بیع فسخ نہ ہونے کی صورت میں مشتری کے ذمہ اس کی قیمت واجب ہوگی، اب قیمت کی تعیین میں دونوں حضرات میں اختلاف ہوگیا:-

الف:- اِمام ابو یوسفؒ کے نزدیک وقتِ عقد کی قیمت کا اِعتبار ہوگا۔

ب:- اِمام محمدؒ کے نزدیک یوم الکساد کی قیمت کا اعتبار ہوگا۔ یہاں بھی صحیح اور راجح قول اِمام محمدؒ ہی کا ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ حنفیہؒ کے ہاں حکم کے اعتبار سے اِنقطاع اور کساد میں

کوئی فرق نہیں۔

چنانچہ اس سلسلے میں علامہ شامی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:-

"والانقطاع عن ایدی الناس کالکساد"

اسی صفحہ پر آگے فرماتے ہیں:-

"والانقطاع کالکساد"

دونوں عبارتوں کا مطلب یہ ہوا کہ انقطاع کساد کی طرح ہے۔[1]

مسئلہ کساد کے سلسلے میں ہم یہاں علامہ کاسانیؒ کی عبارت بمع ترجمہ نقل کرتے ہیں، جو نہایت ہی جامع ہے:-

"ولو اشتری بفلوس نافقة ثم کسدت قبل القبض انفسخ عند ابی حنیفة رحمه الله،وعلی المشتری رد المبیع ان کان قائما وقیمته او مثله ان هالکا، وعند ابی یوسف ومحمد رحمهما الله : لا یبطل البیع، والبائع بالخیار ان شاء فسخ البیع وان شاء اخذ قیمة الفلوس۔

وحجة ابی حنیفة: ان الفلوس بالکساد خرجت عن کونها ثمنا لان ثمنیتها ثبتت باصطلاح الناس، فاذا ترک الناس التعامل بها عددا فقد زال عنها صفة الثمنیة، ولا بیع بلاثمن، فینفسخ ضرورة۔

وحجة ابی یوسف ومحمد : اولا : ان الفلوس فی الذمة ومافی الذمة لا یحتمل الهلاك، فلایکون الکساد هلاکا بل یکون عیبافیمایوجب الخیار، ان شاء فسخ البیع، وان شاء اخذقیمة الفلوس۔۔۔

(۱) ردالمحتار (۳۱/۷)

وثانیا: ان الواجب بقبض القرض ردمثل المقبوض وبالکساد عجز عن رد المثل لخروجها عن ردالثمنية وصير ورتهاسلعة، فيجب عليه قيمتها کمالواستقرض شئيا من ذوات الامثال وقبضه ثم انقطع عن ايدی الناس۔

ثم اختلف ابويوسف محمد فيمابينهما فی وقت اعتبار القيمة، فاعتبر ابويوسف وقت العقد لانه وقت وجوب الثمن، واعتبر محمد وقت الکساد وهوآخر يوم ترك الناس التعامل بها، لانه وقت العجز عن التسليم، ولواستقرض فلوسانافقةوقبضها فکسدت، فعليه ردمثل ماقبض من الفلوس عددا فی قول ابی حنيفة وابی يوسف، وفی قول محمد عليه قيمتها۔"

''اور اگر کسی نے کوئی چیز ایسے فلوس سے خریدی، جو رائج تھے، پھر وہ قبضے سے قبل کاسد ہو گئے، تو اِمام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک بیع فسخ ہوگئی، اور مشتری پر مبیع واپس کرنا ضروری ہے، اگر مبیع موجود ہو، یا اس کی مثل واجب ہوگی، اگر مبیع ہلاک ہوگئی ہو، اور صاحبینؒ کے نزدیک بیع باطل نہیں ہوتی، اور بائع کو اِختیار ہے، اگر چاہے تو بیع کو فسخ کرے، اور اگر چاہے تو فلوس کی قیمت وصول کرے۔

اِمام ابوحنیفہؒ کی دلیل یہ ہے کہ فلوس کساد کی وجہ سے ثمن ہونے سے نکل گئے، کیونکہ ان کی ثمنیت لوگوں کی اِصطلاح کی وجہ سے تھی، سو جب لوگوں نے فلوس کے ساتھ تعامل کو چھوڑ دیا، تو فلوس سے ثمنیت کی صفت زائل ہوگئی، اور بیع بغیر ثمن کے نہیں ہوتی، اس لئے بیع باطل ہو جائے گی۔

اور حضراتِ صاحبینؒ کی پہلی دلیل یہ ہے کہ فلوس واجب فی الذمہ ہیں، اور جو چیز واجب فی الذمہ ہو، وہ ہلاک نہیں ہوتی، لہٰذا کساد ہلاک نہیں ہوگا، البتہ کساد عیب ہوگا، جس کی وجہ سے بائع کو خیار رہے گا، چاہے تو بیع کو فسخ کرلے اور چاہے تو فلوس کی قیمت وصول کرے، اور دُوسری دلیل یہ ہے کہ قرض کے قبضے سے قرضِ مقبوض کی مثل واجب ہوتی ہے، اور کساد کی وجہ سے وہ مثل کی واپسی سے عاجز آگیا، کیونکہ وہ فلوس اب ثمن نہیں رہیں، اور سامان کے حکم میں آگئے، لہٰذا اس پر ان کی قیمت واجب ہوگی، جیسا کہ کسی نے کوئی مثلی چیز قرض لی اور اس پر قبضہ کیا، اور اس کے بعد وہ مثلی چیز لوگوں کے ہاتھوں سے منقطع ہوگئی۔

پھر صاحبینؒ کا آپس میں اعتبارِ قیمت کے وقت کے بارے میں اختلاف ہوگیا، اِمام ابو یوسفؒ نے وقتِ عقد کا اعتبار کیا، کیونکہ یہی وجوبِ ثمن کا وقت ہے، اور اِمام محمدؒ نے وقتِ کساد کی قیمت کا اعتبار کیا، کیونکہ تسلیم کرنے سے عاجز ہونے کا یہی وقت ہے، اور اگر رائج فلوس کو کسی نے قرض کے طور پر لیا، اور بعد میں وہ کاسد ہوگئے، تو اِمام ابوحنیفہؒ اور اِمام ابو یوسفؒ کے نزدیک اس پر مقبوضہ فلوس کی مثل واپس کرنا ضروری ہے، اور اِمام محمدؒ کے نزدیک اس پر ان فلوس کی قیمت واپس کرنا ضروری ہے۔"[1]

حاشیہ ابنِ عابدین اور فتاویٰ عالمگیریہ میں کسادِ فلوس کے بارے میں جو تفصیل تحریر ہے، اس کا خلاصہ درج ذیل ہے:-

"اگر کسی نے ان دَراہم سے سودا کیا، جن میں کھوٹ غالب ہو، یا

(۱) بدائع الصنائع (۲۴۵/۷)؟

فلوس سے سودا کیا، اور ابھی ثمن بائع کو نہیں دیا تھا کہ کساد واقع ہوا، تو بیع باطل ہوگئی، اور انقطاع بھی حکم میں کساد کی طرح ہے، مشتری پر اس صورت میں واجب ہے کہ اگر مبیع موجود ہو، تو مبیع واپس کرے، اور اگر مبیع موجود نہیں، تو اس کی مثل یا قیمت واپس کرے، اور مبیع مشتری کے قبضے میں نہ ہو، تو اس صورت میں کچھ بھی واجب نہیں، یہ امام ابوحنیفہؒ کا موقف ہے، حضراتِ صاحبینؒ کے نزدیک بیع اس صورت میں باطل نہیں ہوتی، کیونکہ یہاں زیادہ سے زیادہ یہ ہوا کہ کساد کی وجہ سے ثمن تسلیم کرنا مشکل ہوگیا، لیکن دوبارہ رواج پائے جانے کے احتمال کی وجہ سے یہ قدرت حاصل ہوسکتی ہے، لہٰذا بیع باطل نہیں ہوگی، البتہ امام ابویوسفؒ کے نزدیک یوم البیع کی قیمت واجب ہوگی، اور امام محمدؒ کے نزدیک یوم الکساد کی قیمت واجب ہوگی، ذخیرہ میں ہے کہ فتویٰ امام ابویوسفؒ کے قول پر ہے، محیط، تتمہ اور حقائق میں ہے کہ لوگوں کی سہولت کی خاطر فتویٰ امام محمدؒ کے قول پر دیا جاتا ہے۔"[1]

یہ حکم بیع کا ہے، اور اگر قرض کا معاملہ ہوا، اور پھر زر میں کساد واقع ہوا، تو اس میں امام صاحب کے نزدیک مثل واجب ہوگی، اور صاحبینؒ کے نزدیک قیمت واپس کرنا ضروری ہے، اور قیمت کی تعیین کے وقت میں وہی اختلاف ہے، جو بیع میں گزر چکا۔[2] ایک قول میں امام محمدؒ قرض کے مسئلے میں امام صاحبؒ کے ساتھ ہیں، جیسا کہ بدائع کی عبارت کے آخر میں ہے۔

خلاصہ یہ ہوا کہ انقطاع ہو، یا کساد، امام صاحبؒ کے نزدیک بیع کا معاملہ اس کی

(۱) ردالمحتار (۷/۴۱) والفتاوی الهندیه ۳/۲۲۵)

(۲) تنبیه الرقود (۲/۵۷)

وجہ سے باطل اور خود بخود فسخ ہو جاتا ہے، اور اس صورت میں مشتری کے ذمہ مبیع کو واپس کرنا ضروری ہوتا ہے، اور اگر مبیع موجود نہ ہو، تو مثل اور اگر مثل بھی نہ ہو، تو اس کی قیمت واپس کرنا ضروری ہوتا ہے، جبکہ صاحبینؒ کے نزدیک ان حالتوں میں بیع فاسد یا باطل نہیں ہوتی، البتہ یہ ایک عیب ہے، اس عیب کی وجہ سے بائع کو فسخ کا اِختیار حاصل ہے، اگر وہ بیع کو فسخ کرتا ہے، تو مبیع کی واپسی میں وہی تفصیل ہوگی، جو اِمام صاحبؒ کے مذہب میں ہے، اور اگر بیع کو فسخ نہیں کرتا، بلکہ نافذ کرتا ہے، تو بیع نافذ ہو جائے گی، اور مشتری کے ذمہ اس ثمن کی قیمت واجب ہوگی، یہ قیمت اِمام ابو یوسفؒ کے نزدیک یوم العقد کے حساب سے ہوگی، اور اِمام محمدؒ کے نزدیک یوم الانقطاع یا یوم الکساد کے حساب سے ہوگا، اور دونوں صورتوں میں فتویٰ حنفیہ کے ہاں اِمام محمدؒ کے قول پر دیا جاتا ہے۔

مالکیہ وشافعیہ

مالکیہ اور شافعیہ کا موقف اس سلسلے میں یہ ہے کہ جب زر پر کساد واقع ہو جائے، تو بیع باطل نہیں ہوگی، بلکہ مدیون/مشتری وہی سکہ واپس کرے گا، جو سکہ بوقتِ عقد رائج تھا، البتہ شافعیہ کا ایک قول یہ بھی ہے کہ اس صورت میں بائع کو اِختیار ہوگا کہ یا تو قدیم سکہ قبول کر کے بیع کو نافذ کرے، اور یا اس بیع کو فسخ کرے۔

چنانچہ شرح زرقانی میں ہے:-

"وان بطلت فلوس ترتبت لشخص علی آخر ای قطع التعامل بها بالکلية، فالمثل علی من ترتبت فی ذمته قبل قطع التعامل بها۔"

''اور اگر وہ فلوس جو کسی کے کسی کے ذمہ واجب تھے، وہ کاسد ہو گئے، یعنی ان کے ساتھ تعامل بالکلیہ ختم ہو گیا، تو جس کے ذمہ یہ فلوس واجب الاداء ہیں، وہ ان فلوس کی مثل ادا کرے گا، جو قطع تعامل سے

پہلے رائج تھے۔"(۱)

حاشیہ دسوقی میں ہے:-

ان بطلت فلوس او دنانیر او دراهم ترتبت لشخص علی غیره فقطع التعامل بها، ومن باب اولی اذا تغیرت بزیادة او نقص، فیجب قضاء المثل علی من ترتبت فی ذمته قبل قطع التعامل بها او تغیرها۔"

"اگر فلوس یا دنانیر یا دراہم باطل ہوگئے، جو کسی شخص کے دوسرے کے ذمہ واجب تھے، پس ان کا تعامل ختم ہوگیا، تو جس کے ذمہ یہ زر واجب تھا، تغیر یا قطع تعامل سے قبل جو زر رائج تھا، اس کی مثل اس پر واجب ہے۔"(۲)

منح الجلیل میں ہے:-

"ومن ابتاع بنقد او اقترضه ثم بطل التعامل به لم یکن علیه غیره۔"

اور المعیار میں ہے:-

"وافتی ابو الولید الباجی انه لا یلزمه الا السکة الجاریة حین العقد"

"ابو الولید باجیؒ نے فتویٰ دیا ہے کہ مدیون پر وہی سکہ ادا کرنا واجب ہے، جو عقد کے وقت جاری تھا۔"(۳)

---

(۱) شرح الزرقانی علی خلیل (۶۰/۵) کذا فی الخرشی علی خلیل (۵۵/۵)

(۲) حاشیة الدسوقی (۵۴/۱)

(۳) المعیار المعرب، الونشریسی (احمد بن یحی المتوفی ۹۱۴ھ) بیروت، دارالغرب الاسلامی ۱۴۰۱ھ (۱۶۴/۶)

فقہِ شافعی کی مشہور کتاب المجموع میں ہے:-

"ولو باع بنقد معين او مطلق وحملناه على نقد البلد فابطل السلطان المعاملة بذلك النقد لم يكن للبائع الا ذلك النقد هذا هوا لمذهب۔"

''اور اگر کسی معین زَر یا مطلق زَر سے سودا کیا، اور اس کو ہم نے نقد البلد پر محمول کیا، پھر سلطان اس زَر کے ساتھ معاملہ کو باطل کر دیا، تو بائع کو وہی سکہ یا زَر ملے گا، جو بوقتِ عقد جاری تھا، اور یہی مذہب ہے۔''[1]

روضۃ الطالبین میں ہے:-

ولو اقرضه نقدا فابطل السلطان المعاملة به، فليس له الا لنقد الذى اقرضه نص عليه الشافعى رضى الله عنه۔"

''اور اگر اس کو زَر قرض دِیا، اور پھر سلطان نے اس زَر کے ساتھ معاملے کو باطل کر دیا، تو مقرض کو وہی سکہ یا زَر ملے گا، جو اس نے قرض دیا، اسی کی تصریح اِمام شافعی رضی اللہ عنہ نے فرمائی ہے۔''[2]

اور المجموع میں ہے:-

"وحكى البغوى والرافعى وجها ان البائع مخير ان شاء اجاز البيع بذلك النقد وان شاء فسخه۔"

''اور بغوی اور رافعیؒ نے ایک اور طریقہ بھی بیان کیا ہے، اور یہ کہ اس صورت میں بائع کو اِختیار ہے، چاہے تو بیع اسی زَر کے ساتھ نافذ کرے، اور اگر چاہے، تو بیع کو فسخ کرے۔''[3]

---

(۱) المجموع شرح المهذب، النووى (ابوزكريا محى الدين بن شرف النووى المتوفى ۶۷۶ هج، بيروت، دارالفكر (۹/ ۳۳۱)

(۲) روضة الطالبين للنوویؒ (۴/ ۳۷)

(۳) المجموع شرح المهذب للنووى (۹/ ۲۸۲)

ان تمام عبارات کا حاصل یہ نکلا کہ ان حضرات (مالکیہ اور شافعیہ) کے نزدیک راجح اور مفتیٰ بہ قول یہی ہے کہ کساد کی صورت میں حق دار وہی سکہ یا زَر وصول کرے گا، جو بوقتِ عقد رائج تھا، اگر چہ وہ اس پر کساد طاری ہو گیا، خواہ معاملہ بیع کا ہو، یا قرض کا ہو۔

اس سے یہ بھی پتہ چلا کہ مالکیہ اور شافعیہ کے نزدیک اِنقطاع اور کساد میں حکم کے اعتبار سے فرق ہے، جس کی تفصیل گزر چکی۔

حنابلہ

کساد کی صورت میں حنابلہ کے نزدیک بھی قیمت واپس کرنا ضروری ہے، اور قیمت کی تعیین میں ان کے نزدیک تین اقوال ہیں:-

الف:- وقت الکساد کی قیمت کا اِعتبار ہے، جیسا کہ حنفیہ میں سے اِمام محمدؒ کا موقف ہے، اور یہی قول ان کے ہاں راجح ہے۔

ب:- وقتِ معاملہ کی قیمت کا اعتبار ہے، جیسا کہ اِمام ابو یوسفؒ کا موقف ہے۔

ج:- وقتِ خصومت کا اعتبار ہے۔

علامہ ابنِ قدامہ فرماتے ہیں:-

"ان كان القرض فلوسا او مكسرة فحرمها السلطان وتركت المعاملة بها لانه كالعيب فلايلزمه قبولها، ويكون له قيمتها وقت القرض سواء كانت باقية او استهلكها نص عليه احمد في الدراهم المكسرة، فقال: يقومها كم تساوى يوم اخذها ثم يعطيه، وسواء نقصت قيمتها قليلا او كثيرا، وذكر ابوبكر في التنبيه: انه يكون له قيمتها وقت فسدت وتركت المعاملة بها، لانه كان يلزمه مثلها مادامت نافقة، فاذا فسدت انتقل الى قيمتها حينئذ كم لوعدم

المثل الخ"

"اگر قرض فلوس ہوں، یا ٹوٹے ہوئے دَراہم تھے، پھر سلطان نے ان کو حرام قرار دیا، اور تعامل متروک ہوگیا، تو یہ عیب کی طرح ہے، لہٰذا صاحبِ حق کے لئے ضروری نہیں کہ وہ ان کاسد زَر کو قبول کرے، اور مقروض پر اس زَر کی قیمت واجب ہوگی، جس میں وقت قرض کا اعتبار ہوگا، خواہ وہ زَر اس کے پاس ابھی رکھا ہوا ہو، یا اس نے خرچ کیا ہو، امام احمدؒ نے دَراہم مکسرہ میں اس کی تصریح کی ہے، اور فرمایا کہ یہ قیمت لگائی جائے گی کہ یوم الاخذ میں اس کی قیمت تھی، چنانچہ وہ قیمت ادا کرے گا، خواہ اس کی قیمت زیادہ کم ہوئی ہو، یا معمولی کم ہوئی ہو، اور ابوبکر نے تنبیہ میں ذکر فرمایا ہے کہ یوم الکساد کی قیمت کا اِعتبار ہوگا، کیونکہ اس کے ذمہ اس کی مثل واجب تھی رائج ہونے کی صورت میں، پس جب یہ زَر کاسد ہوگیا، تو اَب بات قیمت تک پہنچی، جیسا کہ اگر مثل معدوم ہو جائے۔"(۱)

کشاف القناع میں ہے:-

"ان کان القرض فلوسا اودراھم مکسورة فیحرمھا ای یمنع الناس من المعاملة بھا السلطان او نائبه سواء اتفق الناس علی ترك المعاملة بھا او لا، لانه کالعیب، فلایلزمه قبولھا، فللمقترض القیمة عن الفلوس والمکسرة فی ھذه الحال وقت القرض الخ"(۲)

---

(۱) المغنی معه الشرح الکبیر، المقدسی (موفق الدین ابن قدامه وشمس الدین بن قدامه المقدسی، بیروت، دارالکتاب العربی ۱۳۹۲ھج (۳۶۵/۴)

(۲) کشاف القناع للبھوتی (۳۰۱/۳)

علامہ مرداویؒ فرماتے ہیں:۔

ان کان فلوسا اومکسرة فیحرمها السلطان (الصحیح من المذهب ان له القیمة سواء اتفق الناس علی ترکها او لاوعلیه اکثر الاصحاب، وجزم به کثیر منهم،۔۔۔۔ وقال فی المستوعب : وهو الصحیح عندی۔۔۔وقیل : له القیمة وقت الخصومة "(۱)

ان عبارات کا بھی وہی مطلب ہے جو علامہ ابنِ قدامہؒ کے حوالے سے گزر گیا، البتہ اس میں وقتِ خصومت کی تصریح ہے۔

خلاصۂ بحث

اس تمام بحث کا حاصل یہ ہوا کہ کساد ہو یا اِنقطاع اِمام صاحبؒ کے نزدیک اس سے خود بخود بیع فسخ ہوجاتی ہے، اور مشتری کے ذمہ مبیع یا مثل یا اس کی قیمت واپس کرنا ضروری ہوتا ہے، جبکہ صاحبینؒ سمیت جمہور مشائخ اور علماء کے نزدیک دونوں حالتوں میں بیع خود بخود فسخ نہیں ہوتی، پھر اِمام ابو یوسفؒ کے نزدیک دونوں حالتوں میں یوم العقد کی قیمت کا اِعتبار ہوگا، اور اِمام محمدؒ کے نزدیک یوم الانقطاع یا یوم الکساد کی قیمت کا اِعتبار ہوگا، اور اسی پر فتویٰ ہے، لہٰذا حنفیہؒ کے نزدیک حکم کے اعتبار سے اِنقطاع اور کساد میں کوئی فرق نہیں، جبکہ اَئمہ ثلاثہؒ کے نزدیک دونوں حالتوں میں فرق ہے، چنانچہ حضرات مالکیہؒ کے نزدیک اِنقطاع میں : وقتِ فیصلہ کی قیمت کا اِعتبار ہوگا، جبکہ کساد میں وہی سکہ واپس کرنا ہوگا، جو بوقتِ عقد جاری تھا، شافعیہ کے ہاں اِنقطاع میں وقتِ مطالبہ کی قیمت کا اِعتبار ہے، جبکہ کساد میں ان کے ہاں وہی سکہ واپس کرنا ہوگا، جو عقد کے وقت جاری اور رائج تھا، حنابلہؒ کے ہاں اِنقطاع میں یوم الانقطاع کی قیمت معتبر ہوتی ہے، جبکہ ان کے ہاں کساد میں

(۱) الانصاف، المرداوی (علاء الدین ابی الحسن علی بن سلیمان طبع اول ۱۳۷۶ھ ج(۱۲۷/۵)

تین مختلف اقوال ہیں، راجح قول کے مطابق یوم الکساد کی قیمت کا اِعتبار ہوگا۔

اور یہی تفصیل قرض میں بھی ہے، البتہ اِمام صاحبؒ کے نزدیک قرض میں مثل واجب ہوگی، خواہ اِنقطاع کی حالت ہو، یا کساد کی۔

نقشہ مذاہب

حالت	اِمام	قول
انقطاع	اِمام ابوحنیفہؒ	بیع فسخ /قرض میں مثل واجب
	مالکیہؒ	وقتِ فیصلہ کی قیمت، بیع ہو یا قرض
	شافعیہؒ	وقتِ مطالبہ کی قیمت
	حنابلہ+ اِمام محمدؒ	یوم الانقطاع ،عندالامام محمد بائع کو خیار حاصل ہوگا
	اِمام ابویوسفؒ	یوم العقد، بائع کو فسخ کا خیار حاصل ہوگا
کساد	اِمام ابوحنیفہؒ	بیع فسخ ،قرض میں مثل واجب
	مالکیہ وشافعیہ	وہی سکہ جو بوقتِ عقد جاری تھا واجب ہوگا
	اِمام ابویوسفؒ	وقتِ عقد کی قیمت/ خیارِ فسخ بھی
	حنابلہ+ اِمام محمدؒ	یوم الکساد کی قیمت/عند محمد خیار فسخ بھی

جاننا چاہیئے کہ اگر کسی ملک میں کرنسی اس قدر گر گئی کہ اس کو کساد کہا جا سکتا ہو، تو

وہاں قروض اور دیون میں اِمام محمدؒ یا اِمام ابو یوسفؒ کے قول پر عمل کرنے کی گنجائش ہوگی، اس سلسلے میں اِمام ابو یوسفؒ کے قول پر عمل کرنا زیادہ آسان ہے، کہ جس وقت معاملہ ہو رہا تھا، اس وقت کرنسی کی حقیقی قیمت کیا تھی، اس کے حساب سے حق دار کو حق ملے گا۔

اِفراطِ زَر (Inflation)

اس میں ہم سب سے پہلے معاشی نقطۂ نظر سے اِفراطِ زَر اور تفریطِ زَر کے معنی، اَقسام، وجوہات اور اَثرات کا خلاصہ بیان کریں گے، اس کے بعد شرعی نقطۂ نظر سے اس پر کلام کریں گے۔

اِفراطِ زَر کے معنی

اِفراطِ زَر کے کسی قطعی اور صحیح مفہوم کے بارے میں شروع سے ہی معیشت دانوں میں شدید اختلافِ رائے پایا جاتا ہے، اسے نیوکلاسیکل معیشت دانوں نے پہلی بار متعارف کرایا، ان کے خیال میں اِفراطِ زَر سے مراد ایسی صورتِ حال ہے کہ جس میں:-

"زَر کی مقدار میں حد سے زیادہ اِضافہ ہونے کے نتیجے میں اشیاء میں تیزی سے اِضافہ ہونے لگتا ہے۔"

دورِ حاضر کے معیشت دان اِفراطِ زَر کو محض زَر کی رسد میں اِضافے کا سبب قرار نہیں دیتے، بلکہ اسے متعدد وجوہات میں سے ایک اہم ترین وجہ تصوّر کرتے ہیں، بعض حضرات اِفراطِ زَر کی تعریف یوں کرتے ہیں:-

"قیمتوں کی سطح میں مستقل اور مسلسل اِضافے کا نام اِفراطِ زَر ہے"(۱)

---

(۱) تعارف زَر و بنکاری ص: ۸۳

The Thoery of Money and Credit:
"An increase in the quantity of money that is not offset by a corresponding increase in the need for money , so that a fall in the objective excange value of money must occur."P: 272

اس تعریف میں ''زر کی قدر میں اضافہ'' کی قید نہیں۔

اِفراطِ زر کی خصوصیات (Chracteristics)

اِفراطِ زر کی تین خصوصیات ہیں، جن پر سارے معیشت دان متفق ہیں:-

۱- قیمتوں میں اضافہ: اِفراطِ زر کے نتیجے میں قیمتوں میں لازماً اضافہ ہوتا ہے۔

۲- زر کی رسد میں اضافہ: جب قومی وسائل حکومت کی مالیاتی ضروریات پوری کرنے سے قاصر رہتے ہیں، تو وہ بنکوں یا دوسرے مالیاتی اِداروں اور عوام سے سرکاری کفالتوں یا بانڈز کی ضمانت پر قرضے حاصل کر کے اپنا کام چلاتی ہے، حکومت کے اس اِقدام سے زرِ اعتباری (Credit Money) میں اِضافہ ہو جاتا ہے۔

۳- اپنی تقویت کا خود باعث بننا: اِفراطِ زر کا چکر جب ایک دفعہ شروع ہو جاتا ہے، تو پھر یہ خود بخود مضبوط سے مضبوط تر اور شدید سے شدید تر ہوتا چلا جاتا ہے۔

اِفراطِ زر کی چند مشہور قسمیں

اپنی شدت اور کمی کے لحاظ سے اِفراطِ زر کی متعدد قسمیں ہیں، جن میں بعض مشہور قسمیں درج ذیل ہیں:-

۱- رینگتا ہوا اِفراطِ زر (Creaping Inf): یہ اپنے اثرات کے لحاظ سے اِفراطِ زر کی سب سے سست رفتار قسم ہے، اس لئے معیشت کے لئے زیادہ خطرناک تصور نہیں کیا جاتا، عموماً ۳٪ سالانہ کے حساب سے قیمتوں میں مسلسل اضافے کو رینگتے ہوئے اِفراطِ زر سے موسوم کیا جاتا ہے۔

۲- اُچھلتا ہوا اِفراطِ زر (Troting Inf) : یہ اِفراطِ زر پہلی قسم کی نسبت سے زیادہ تیز رفتار ہوتا ہے، عموماً ٪۳ سے ٪۶ سالانہ اضافے کو اُچھلتا ہوا اِفراطِ زر کہتے ہیں۔

۳- تیز رفتار اِفراطِ زر (Running Inf): قیمتوں میں ٪۱۰ سالانہ اضافے کو کہتے ہیں۔

۴- شدید اِفراطِ زَر (Hyper Inf): اس میں ہر ماہ قیمتوں میں ۲۰٪ تا ۳۰٪ کے حساب سے اِضافہ ہوتا ہے۔

۵- رکودی اِفراطِ زَر (Stagflation): جب معیشت گرم بازاری کے بعد مراجعت (Recession) اور اِفراطِ زَر کے اثرات سے بیک وقت دوچار ہوتی ہے، تو یہ حالت رکودی اِفراطِ زَر کی ہوتی ہے، اس میں ایک طرف پیداوار میں جمود کی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے، اور دُوسری طرف قیمتوں میں اِضافہ شروع ہوجاتا ہے، اپنے اثرات کے لحاظ سے یہ سب سے خطرناک قسم ہے۔

قدرِ زَر میں تغیرات پیدا کرنے والے عوامل

عام طور پر یہ تصور کیا جاتا ہے کہ زَر کی قدر میں تبدیلی زَر کی پیداوار میں اِضافے یا کمی کی وجہ سے ہوتی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ زَر کی قدر میں تبدیلی کئی اسباب کی بناء پر ہوتی ہے، جنہیں ہم یہاں اِختصار کے ساتھ بیان کرتے ہیں:-

۱- زَر کی مقدار: اگر زَر کی مقدار بڑھ جائے، تو اَشیاء کی قیمتوں میں اِضافہ ہوجاتا ہے، اور کرنسی کی قیمت گھٹ جاتی ہے۔

۲- پیداوار کی مقدار: اگر ملک میں زرعی اور صنعتی اشیاء کی مقدار بڑھ جائے، تو قیمتیں گر جاتی ہیں، اور زَر کی قدر بڑھ جاتی ہے، اس کے برعکس اگر اشیاء کی مقدار کم ہوجائے، تو اَشیاء کی قیمتیں چڑھ جاتی ہیں، اور زَر کی قیمت گھٹ جاتی ہے۔

۳- زَر کی گردش کی رفتار: اگر زَر کی گردش کی رفتار تیز ہوجائے، تو زَر کی اکائی پہلے سے زیادہ مرتبہ اشیاء خریدنے کے لئے استعمال ہو، تو قیمتیں چڑھ جاتی ہیں، اور زَر کی قدر کم ہوجاتی ہے، اس کے برعکس جب سرد بازاری کے دوران زَر کی گردش کی رفتار سست پڑ جاتی ہے، تو قیمتیں گر جاتی ہیں، اور زَر کی قدر گھٹ جاتی ہے، کیونکہ لوگ روپیہ خرچ کرنے

کی بجائے اپنے پاس رکھنا پسند کرتے ہیں۔

۴-آبادی کی تعداد: اگر آبادی بڑھ جاتی ہے، لیکن اشیاء کی پیداوار جوں کی توں رہے، تو طلب بڑھ جاتی ہے، اور اس کے نتیجے میں قیمتیں بڑھ جاتی ہیں، اور زر کی قدر کم ہو جاتی ہے۔

۵-طلب میں کمی بیشی: بعض اوقات غیر متوقع ناگہاں مثلاً جنگ کے باعث اشیاء کی مانگ بڑھ جاتی ہے، اور قیمتوں کی سطح بلند ہو جاتی ہے، اور زر کی قیمت گھٹ جاتی ہے۔

۶-سرکاری بجٹ: اگر کسی سال حکومت کی متوقع آمدنی اس کے اِخراجات سے کم ہو، تو مرکزی بنک سے قرض لے کر اس کمی کو پورا کرتی ہے، جس کے باعث اِفراطِ زر رُونما ہو جاتا ہے، اور اشیاء کی قیمتیں بڑھ جاتی ہیں۔

۷-بیرونی تجارت: اگر کسی ملک کی بیرونی ادائیگیوں کا توازن خراب ہو جائے، یعنی اس نے اشیاء برآمد کم کی ہوں، اور درآمد زیادہ کی ہوں، تو اس کی کرنسی کی بیرونی قدر کم ہو جاتی ہے، باہر سے آنے والی اشیاء کی قیمت بڑھ جاتی ہے، اور یوں ملک کے اندر بھی زر کی قیمت گھٹ جاتی ہے۔

۸-محصولات: اگر حکومت درآمد ہونے والی اشیاء پر بھاری محصول لگائے، تو ان اشیاء کی قیمت بڑھ جاتی ہے، اور زر کی قدر گھٹ جاتی ہے۔[1]

تفریطِ زر (Deflantion)

تفریطِ زر، اِفراطِ زر کے برعکس صورت کا نام ہے، اس میں قیمتیں گر رہی ہوتی ہیں، اور زر کی قدر بڑھ رہی ہوتی ہے۔

تفریطِ زر کا رُجحان اس وقت پیدا ہوتا ہے، جب زر کی رسد میں کمی کی وجہ سے

(۱) کتاب معاشیات حصہ دوم (ص ۱۵۸)

اشیاء وخدمات کی پیداوار کے مقابلے میں قیمتوں میں زیادہ کمی ہورہی ہوتی ہے۔ [1]

قدرِ زر کے تغیرات کے اثرات اور نتائج

زَر کی قدر کم یا زیادہ ہونے سے تمام طبقہ ہائے زندگی متاثر ہوتے ہیں، لیکن سب پر ایک جیسا اثر مرتب نہیں ہوتا، بلکہ کسی طبقے پر اچھا اثر مرتب ہوتا ہے، اور کسی طبقے پر بُرا اثر مرتب ہوتا ہے، ذیل میں اس مسئلے کا خلاصہ بیان کیا جاتا ہے:-

مختلف قرضوں پر اس کا اثر: اِفراطِ زَر سے متاثر ہونے طبقہ قرضہ دھندگان (Creditors) ہیں، یعنی وہ لوگ ہیں، جو قرضہ دیتے ہیں، چنانچہ جب اِفراطِ زَر ہوتا ہے، یعنی قیمتیں چڑھ جاتی ہیں، تو ان لوگوں کو نقصان ہوتا ہے، جنہوں نے قرض دے رکھا ہو، کیونکہ انہیں اپنا قرض واپس ملتا ہے، تو اس کی قدر پہلے سے گر چکی ہوتی ہے، مثلاً اگر زید نے عمرو کو ۸۸ء میں ایک لاکھ روپے بطور قرض دیئے ہوں، اور ۲۰۰۲ء میں واپس کر رہا ہے، تو ۸۸ء میں ایک لاکھ روپے کی قوتِ خرید ۲۰۰۲ء کی قوتِ خرید سے یقیناً زیادہ ہوگی، جتنا سامان ایک لاکھ روپے میں ۸۸ء میں آسکتا تھا، وہ ۲۰۰۲ء میں نہیں آسکتا، اس کا مطلب یہ ہوا کہ زَر (Creditor) خسارے میں مبتلا ہوگیا۔

اور اس کے برعکس تفریطِ زَر کی حالت میں زید کا فائدہ ہوگا، کیونکہ ایک لاکھ روپے کی قیمتِ خرید میں اِضافہ ہوا ہوگا۔

مزدوروں کی اُجرتوں پر اس کا اثر: اِفراطِ زَر سے متاثر ہونے دُوسرا طبقہ مختلف فیکٹریوں کے مزدور لوگ ہیں، اِفراطِ زَر کے نتیجے میں جب قیمتیں بڑھ جاتی ہیں، اور ان کو اُجرت وہی ملتی ہو، جو پہلے سے چلی آرہی ہے، تو اس سے ان لوگوں کو یقیناً نقصان ہوگا۔

ان مسئلوں کا تعلق حقوق وواجبات سے ہے، اس لئے کہ قرض/ دَین (Debt)

---

(۱) تعارف زر وبنکاری، اور Ludwing Von Mises کہتے ہیں:

"Deflation signifies a diminustion of the quantity of money which is not offset by a corresponding diminustion of the demand for money , so that an increase in the objective exeange value of money must occur".P:272

صاحبِ قرض کا حق ہے، جسے مقروض پر واپس کرنا واجب ہے، اسی طرح اُجرت مزدور اور ملازم کا حق ہے، جسے ادا کرنا آجر پر واجب ہے، اس وجہ سے ان دو مسئلوں کو ذِکر کرنے میں مقدم کیا، اور ان کو نمایاں کیا، نیز آگے جو ہم "اِشاریہ" یا "Index" نمبر بیان کریں گے، اس کا تعلق ان مسئلوں یعنی قرض اور اُجرت سے ہے۔

اس کے علاوہ قدرِ زَر میں تغیرات کے اور بھی اثرات ہیں، مثلاً کسان طبقے پر اس کا اثر اور تاجر وصنعت کار پر اس کا اثر، اشیاء کی پیداوار پر اس کا اثر، تقسیمِ دولت پر اس کے اثرات اور سرمایہ کاری اور روزگار پر اس کے اثرات۔

کسان اور تاجر پر اِفراطِ زَر کے اچھے اثرات مرتب ہوتے ہیں، کیونکہ ان کی پیداوار کی قیمت بڑھ جاتی ہے، اور ان کی آمدنی میں اِضافہ ہو جاتا ہے، اسی طرح اِفراطِ زَر کے نتیجے میں زرعی و صنعتی اشیاء کی پیداوار بڑھ جاتی ہے، اور نئی سے نئی اشیاء مارکیٹ میں دستیاب ہو جاتی ہیں، اس کا مطلب یہ ہوا کہ اِفراطِ زَر کا کسان، تاجر اور صنعت کار اور اَشیاء پیداوار پر خوشگوار اثرات مرتب ہوتے ہیں، اسی طرح سرمایہ کاری اور روزگار پر بھی اِفراطِ زَر کے اچھے اثرات مرتب ہوتے ہیں، کیونکہ جب اشیاء کی قیمتیں بڑھیں گی، تو نئے کارخانے کھلیں گے، لوگ کاروبار اور تجارت میں دِلچسپی لیں گے، اور اس طرح سرمایہ کاری میں اِضافہ ہوگا، اور بے روزگاری میں کمی آئے گی، جبکہ تقسیمِ دولت پر اِفراطِ زَر کے منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں، اور تقسیمِ دولت میں اِفراطِ زر سے بے اِعتدالی پیدا ہو جاتی ہے۔

خلاصہ یہ کہ اِفراطِ زَر سے قرض خواہ، مزدور اور تقسیمِ دولت پر بُرے اثرات مرتب ہوتے ہیں، جبکہ کسان، تاجر، صنعت کار، اشیاء کی پیداوار، سرمایہ کاری اور روزگار پر اچھے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

اِفراط اور تفریطِ زَر سے متعلق شرعی نقطۂ نظر

عربی میں اِفراطِ زر کو "رخص" یا "تضخم" کہتے ہیں، اور تفریطِ زر کو "غلاء" یا

"انکماش" کہتے ہیں، رخص اور غلاء قدیم الفاظ ہیں، جو کتبِ فقہ میں مذکور ہیں، اور تضخم وانکماش جدید الفاظ ہیں، جو کتبِ جدیدہ میں مذکور ہیں۔

"رخص" کے معنی سستا ہونے کے ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ زَر سستا ہو گیا، یعنی قدر گھٹ گئی، اور یہی اِفراط ہے، اور "غلاء" کے معنی مہنگا ہونے ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ زَر مہنگا ہو گیا، یعنی قدر بڑھ گئی، اور یہی تفریط ہے۔

"تضخم" کے معنی بڑھنے کے ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ زَر کی مقدار بڑھ گئی، اور یہی اِفراط ہے، اور "انکماش" کے معنی سکڑنے کے ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ زَر کی مقدار سکڑ گئی، اور یہی تفریط ہے، زَر کے مہنگے اور سستے ہونے کے بارے میں فقہائے اُمت کے دو قول مشہور ہیں، ایک قول جمہور علماء کا ہے، اور دُوسرا قول اِمام ابو یوسفؒ کا ہے۔

قولِ جمہور

مالکیہ، شافعیہ، حنابلہ اور اِمام ابو حنیفہؒ کا مذہب اس سلسلے میں یہ ہے کہ زَر مہنگا ہو یا سستا ہو، دَین دار کے ذمہ وہی نقد واجب ہوگا، جو بوقتِ معاملہ اس کے ذمہ واجب ہو چکا تھا، اس کی قیمت کا اعتبار نہیں ہوگا، اس کا حاصل یہ ہے کہ جمہور فقہاء کے نزدیک "رخص وغلاء" کا شریعت میں کوئی اعتبار نہیں، اور اس سے قرض یا دَین یا اُجرت میں کوئی فرق نہیں پڑے گا، اگر عقد کے وقت فلوس کی قیمت ایک ہزار دِرہم تھے، اور بعد میں ان کی قیمت سو رہ گئی، یا بوقتِ عقد فلوس کی قیمت ایک سو دِرہم تھی، اور بعد میں ان کی قیمت ایک ہزار ہو گئی، دونوں صورتوں میں وہی فلوس ادا کرنے ہوں گے، جو دَین دار کے ذمہ واجب تھے، سو ہونے یا ایک ہزار ہونے کا کوئی اعتبار نہیں۔

شرح الزرقانی میں ہے:-

"وان بطلت فلوس ترتبت لشخص علی آخر ای قطع التعامل بها بالکلیة واولی تغیرها بزیادة او نقص مع بقاء

عینها، فالمثل علی من ترتبت فی ذمته قبل قطع التعامل بها او التغیر، ولو کانت حین العقد مائة درهم، ثم صارت الفابه کما فی المدونة ای او عکسه لانها من المثلیات"

"اور اگر وہ فلوس جو کسی کے کسی کے ذمہ واجب تھے، متروک التعامل ہوگئے، اور اس حکم میں فلوس کا زیادت یا نقصان کے ساتھ متغیر ہونا بطریقِ اَولیٰ شامل ہے، تو اس صورت میں دَین دار پر مثل واجب ہے، اگر چہ عقد کے وقت فلوس سو دِرہم کے برابر تھے، اور پھر ایک ہزار ہوگئے، یا اس کا برعکس، کیونکہ فلوس مثلیات میں سے ہیں۔"[1]

حاشیہ دسوقی میں ہے:-

"اذا بطلت فلوس ترتبت لشخص علی غیره بقرض او بیع او نکاح او کانت عنده ودیعة وتصرف فیها، وکذا لو دفعها لمن یعمل بها قراضا، فالواجب المثل علی من ترتبت فی ذمته، ولو کانت الفلوس حین العقد مائة بدرهم ثم صارت الفابه۔"

"جب وہ فلوس باطل ہوجائیں، جو کسی شخص کے دُوسرے کے ذمہ واجب تھے، خواہ قرض کے طریقے سے یا بیع یا نکاح کے طریقے سے، یا اس کے پاس ودیعت کے طور پر رکھے ہوئے تھے، اور اس نے ان میں تصرف کیا، اسی طرح اگر اس کو مضاربت کے طور پر دیئے تھے، تو ان تمام صورتوں میں دَین دار کے ذمہ مثل واپس کرنا ضروری ہے، اگر چہ فلوس عقد کے وقت ایک دِرہم کے بدلے سو تھے، اور بعد میں ایک ہزار ہوگئے۔"[2]

(۱) شرح الزرقانی (۶۰/۵)

(۲) حاشیة الدسوقی (۴۵/۳ بتصرف یسیر)

منح الجلیل میں ہے:-

"ان اقرضته دراهم فلوسا، وهو يومئذ مائة فلس بدرهم ثم صارت مائتی فلس بدرهم فانما يردعليك مثل ما اخذ لا غير ذلك۔"

"اگر آپ نے اس کو دَراہم فلوس کی شکل میں قرض دیئے، اور اس دن صورتِ حال یہ ہو کہ ایک دِرہم کے سوفلوس بنتے تھے، پھر صورتِ حال بدل گئی، اور اب ایک دِرہم کے بدلے میں دوسو فلس آتے ہیں، تو وہ آپ کو وہی فلوس دے گا، جو اس نے لئے تھے، ان کے علاوہ کچھ واجب نہیں۔"(۱)

المعیار میں ہے:-

"سئل سعيد بن لب عن رجل باع سلعة بالناقص المتقدم بالحلول فتاخر الثمن الى ان تحول الصرف وكان ذلك على جهة فبايهما يقضى له ؟ وعن رجل آخر باع بالدراهم المفلسة فتاخر الثمن الى ان تبدل فبايهما يقضى له؟ فاجاب : لايجب قبل المشترى الاماانعقد البيع فى وقته لئلا يظلم المشترى بالزامه مالم يدخل عليه فى عقده۔"(۲)

اس عبارت کا حاصل بھی وہی ہے، جو دُوسری عبارات میں ذِکر ہوا، اور وہ یہ کہ تغیرِ زَر کی صورت میں وہی زَر واجب ہوگا، اس کی قیمت واجب نہیں ہوگی۔

علامہ سیوطیؒ فرماتے ہیں:-

(۱) منح الجليل (۲/۵۳۵)

(۲) المعيار المعرب (۶/۴۶۲)

ان باع برطل فلوسا فهذا ليس له الا رطل زاد سعره ام نقص۔۔۔فان باع بالف فلوسا اوفضة او ذهبا ثم يتغير السعر فظاهر عبارة الروضة المذكورة ان ليس له الا مايسمى الفا عند البيع ولا عبرة بماطرأ۔

"ایک رطل کے عوض میں فلوس بیچے، تو اس کو ایک ہی رطل ملے گا، اس کی قیمت زیادہ ہو جائے، یا کم ہو جائے.......لہٰذا ایک ہزار کے بدلے میں اگر کسی نے فلوس یا سونا یا چاندی بیچی، اور پھر قیمت بدل گئی، تو اس صورت میں "الروضہ" کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو وہی ملے گا، جس کو بیع کے وقت "ہزار" کہا جاتا تھا، اور جو تغیر پیش آیا ہے، اس کا کوئی اعتبار نہیں۔"(۱)

علامہ ابنِ حجرؒ فرماتے ہیں:-

"ويرد وجوبا حيث لا استبدال المثل في المثلي لانه اقرب الى حقه"

"مثلی میں مثل ہی واپس کرنا ضروری ہے، کیونکہ مثلی میں مثل کو قیمت کے ساتھ تبدیل کرنا جائز نہیں، اور یہ حق دار کے حق کے زیادہ قریب ہے۔"(۲)

علامہ قدامہؒ فرماتے ہیں:-

"واما رخص السعر فلايمنع سواء كان قليلا او كثيرا لانه لم يحدث فيها شئى انما تغير السعر، فاشبه الحنطة اذا رخصت او غلت"

---

(۱) الحاوی للفتاوی (۱/۹۷)

(۲) تحفة المحتاج (۵/۴۴)

"جہاں تک قیمت کا گھٹنا ہے، تو یہ مانع نہیں، خواہ یہ کمی زیادہ ہو، یا کم ہو، کیونکہ اس میں کوئی نئی بات پیدا نہیں ہوئی، صرف ریٹ بدل گیا، تو یہ ایسا ہوا جیسا کہ گندم کی قیمت گھٹ جائے، یا بڑھ جائے۔"(۱)

شرح المجلہ میں ہے:-

"استقرض من الفلوس الرائجة والعدالي اي الدرهم الغالب غشها فكسدت فعليه مثلها كاسدة ولا يغرم قيمتها، وكذا كل ما يكال ويوزن لما مر انه مضمون بمثله فلاعبرة بكساد وغلاء ه ورخصه، وهذا عند ابي حنيفة رحمه الله تعالى"

"کسی نے فلوس رائجہ یا عدالی میں سے قرض لیا، پھر کساد واقع ہوا، تو مستقرض کے ذمہ مثل ہی واپس کرنا ضروری ہے، اگرچہ وہ مثل کاسد ہی کیوں نہ ہو، اور وہ قیمت کا ذمہ دار نہیں، اور یہی حکم ہر اس چیز کا ہے، جس کو ناپا جاتا ہو، یا وزن کیا جاتا ہو، کیونکہ یہ بات پہلے گزر چکی ہے کہ اس کا ضمان مثل کے ساتھ واجب ہے، لہٰذا کساد یا ریٹ بڑھنے یا گھٹنے کا کوئی اعتبار نہیں، اور یہ امام ابوحنیفہؒ کا مذہب ہے۔"(۲)

اِمام ابو یوسفؒ کا مذہب

اِمام ابو یوسفؒ کا مذہب اس سلسلے میں یہ ہے کہ زَر کے مہنگا ہونے یا سستا ہونے کی صورت میں قیمت ادا کرنا واجب ہے، حضرات حنفیہؒ کے ہاں فتویٰ اور عمل اسی قول پر

---

(۱) المغني لابن قدامه (۴۴۲/۶)

(۲) شرح المجلة للاتاسيؒ (۴۳۸/۲)

ہے، اگر قرض ہو، تو قرض میں یوم القبض کی قیمت کا اعتبار ہے، اور اگر بیع ہو، تو بیع میں یوم العقد کی قیمت کا اعتبار ہوگا۔

چنانچہ علامہ شامیؒ فرماتے ہیں:-

"اذا غلت الفلوس قبل القبض او رخصت، قال ابویوسف: قولی وقول ابی حنیفة فی ذلك سواء، ولیس له غیرها ثم رجع ابویوسف وقال: علیه قیمتها من الدراهم یوم وقع البیع ای فی صورة البیع ویوم وقع القرض ای فی صورة القرض، وبه علم ان فی الرخص والغلاء قولان، الاول: لیس له غیرها، والثانی: قیمتها یوم البیع وعلیه الفتوی"

"قبضے سے پہلے فلوس مہنگے ہوگئے، یا سستے ہوگئے، تو امام ابو یوسفؒ نے فرمایا کہ اس میں میرا اور امام ابوحنیفہؒ کا قول ایک ہے، اور یہ کہ اس کو یہی فلوس ملیں گے، لیکن بعد میں امام ابو یوسفؒ نے رُجوع فرمایا، اور فرمایا کہ اس پر دَراہم کی شکل میں ان کی قیمت واجب ہوگی، اور اس قیمت میں یوم البیع کا اِعتبار ہوگا، اگر بیع ہو، اور یوم القبض کی قیمت کا اعتبار ہوگا، اگر معاملہ قرض کا ہو، اس سے معلوم ہوا کہ رخص اور غلاء میں دو قول ہیں، پہلا قول یہ کہ مثل واجب ہے، اور دُوسرا قول یہ ہے کہ یوم البیع کی قیمت واجب ہے، اور اسی پر فتویٰ ہے۔"(۱)

اور علامہ ابنِ عابدینؒ فرماتے ہیں:-

"اذا غلت قیمة الفلوس او انتقصت، فالبیع علی حاله ولا یتخیر المشتری، ویطالب بالنقد بذلك العیار الذی

(۱) تنبیہ الرقود (۵۸/۲)

کان وقت البیع، کذا فی فتح القدیر، وفی البزازیۃ عن الملتقی: غلت الفلوس اورخصت فعندالامام الاول والثانی اولا : لیس علیہ غیرھا، وقال الثانی ثانیا: علیہ قیمتھا من الدراھم یوم البیع والقبض وعلیہ الفتوی، وھکذا فی الذخیرۃ والخلاصۃ بالعزو الی الی المنتقی، وقد نقلہ شیخنا فی بحرہ وقرہ فحیث صرح بان الفتوی علیہ فی کثیر من المعتبرات فیجب ان یعول علیہ افتاء وقضاء الخ"

''جب فلوس کی قیمت بڑھ جائے، یا گھٹ جائے، تو بیع اپنے حال پر برقرار رہے گی، اور مشتری کو فسخ کا اختیار بھی نہیں رہے گا، اور مشتری سے اس زر کا مطالبہ کیا جائے گا، جو بیع کے وقت تھا، اسی طرح فتح القدیر میں بھی مذکور ہے، اور بزازیہ میں المنتقی کے حوالے سے لکھا ہے کہ فلوس کی قیمت بڑھ گئی، یا گھٹ گئی، تو اِمامِ اوّل اور اِمامِ ثانی کے نزدیک پہلے یہ مسئلہ تھا کہ مشتری کے ذمہ ان متغیرہ فلوس کے علاوہ مزید کچھ واجب نہیں، اور اِمامِ ثانی (اِمام ابو یوسفؒ) نے بعد میں کہا کہ اس پر دَراہم کی شکل میں ان فلوس کی قیمت واجب ہوگی، اور اسی پر فتویٰ ہے، اسی طرح ذخیرہ اور خلاصہ میں منتقی کے حوالے سے ہے، اور اس کو ہمارے شیخ نے اپنے بحر میں نقل کیا ہے، اور یہ تصریح فرمائی ہے کہ بہت ساری مستند کتابوں میں اسی پر فتویٰ نقل کیا گیا ہے، لہٰذا اسی پر فتویٰ میں بھی اور قضاء میں بھی اِعتماد کرنا چاہئے۔''(۱)

(۱) تنبیہ الرقود (۲/۲۰)۔

العقود الدریہ میں ہے کہ:-

"وان رخصت او غلت فقیل : لیس للبائع غیرھا، ای یجب علی المشتری رد المثل، وقیل : تجب قیمتھا یوم البیع او یوم القبض فی صورۃ القرض، وعلیه الفتوی"

"اور اگر فلوس سستے ہوگئے یا مہنگے ہوگئے، تو ایک قول یہ ہے کہ بائع کو یہی فلوس ملیں گے، یعنی مشتری مثل واپس کرنا واجب ہے، اور ایک قول یہ ہے کہ بیع میں یوم البیع اور قرض میں یوم القبض کی قیمت ادا کرنا واجب ہے، اور اسی پر فتویٰ ہے"(۱)

علامہ ابنِ عابدینؒ نے اس بات پر علامہ غزیؒ کا جزم ذِکر فرمایا ہے کہ اس سلسلے میں فتویٰ اِمام ابو یوسفؒ کے قول پر ہے، چنانچہ وہ فرماتے ہیں:-

"وقد تتبعت کثیرا من المعتبرات من کتب مشائخنا المعتمدۃ فلم ار من جعل الفتوی علی قول ابی حنیفۃ رضی اللہ عنه، بل قالوا: به کان یفتی القاضی الامام، واما قول ابی یوسف فقد جعلوا الفتوی علیه فی کثیر من المعتبرات فلیکن المعول علیه"

"میں نے (علامہ غزی نے) اپنے مشائخؒ کی بہت ساری معتمد کتابوں کا مطالعہ کیا، تو میں کسی کو نہیں دیکھا جس نے اِمام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کے قول پر فتویٰ دیا ہو، البتہ ان کے قول کے مطابق قاضی اِمامؒ فتویٰ دیا کرتے تھے، جہاں تک اِمام ابو یوسفؒ کے قول کا تعلق ہے، تو اس کے مطابق بہت ساری معتبر کتابوں میں فتویٰ دیا گیا ہے، لہٰذا اسی پر اِعتماد کرنا چاہئے۔"(۲)

(۱) العقود الدریۃ (ص ۲۸۰)۔

(۲) تنبیه الرقود (۶۵/۲)۔

فائدہ

یاد رکھنا چاہئے کہ کساد، غلاء اور رخص کے ان اَحکام اور تفصیلات کا تعلق ثمنِ خلقی سے نہیں، بلکہ صرف ثمنِ عرفی سے ہے، کیونکہ ثمنِ خلقی مثلاً سونا یا چاندی کی ثمنیت کبھی بھی باطل نہیں ہوتی، تو اس میں کساد کا تصور نہیں، اسی طرح غلاء یا رخص سے اس میں زیادہ تغیر واقع نہیں ہوتا، جس سے عاقدین کو نقصان یا ضرر پہنچ جائے، تو یہاں اس قسم کی تفصیل کی ضرورت نہیں، اور سونے چاندی میں مثل ہی واپس کرنا ضروری ہے، اور کسی کے نزدیک بھی قیمت کا اِعتبار نہیں، بخلاف ثمنِ اِصطلاحی اور عرفی کے، کہ اس میں کساد بھی مؤثر ہوتا ہے، جس کی وجہ بالکل واضح ہے، اسی طرح غلاء اور رخص سے اس میں کافی تغیر واقع ہوسکتا ہے، جس سے عاقدین کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ رہتا ہے، اس لئے عاقدین کو نقصان سے بچانے کے لئے اِمام ابو یوسفؒ نے مذکورہ قول اِختیار کیا، اور حنفیہ نے اسی کے مطابق فتویٰ دیا، کیونکہ یہ قول مزاجِ شریعت کے زیادہ قریب ہے، اور وہ یہ کہ حق دار کا حق محفوظ رہے، اور اس کو ضرر لاحق نہ ہو۔

حضرت اِمام ابو یوسفؒ کے قول کا صحیح محمل

یہاں یہ بات سمجھنی نہایت ضروری ہے کہ غلاء اور رخص کے سلسلے میں حنفیہ کے ہاں مفتیٰ بہ قول اِمام ابو یوسفؒ کا ہے، کہ فلوس سستے ہونے یا مہنگے ہونے کی صورت میں ان کے نزدیک مثل واپس کرنا ضروری نہیں، بلکہ قیمت واپس کرنا ضروری ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے فلوس میں غلاء اور رخص کا اِعتبار کیا، تو کیا غلاء اور رخص کا اِعتبار موجودہ کرنسی نوٹوں میں بھی ہوگا، اور کرنسی نوٹوں میں بھی اِمام ابو یوسفؒ کے قول کے مطابق اِفراط اور تفریطِ زَر کی صورت میں قیمت کا اِعتبار ہوگا؟ اگر جواب ''ہاں'' میں ہے، تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اگر کسی شخص نے دُوسرے کو قرض دیا تھا، یا اس کے ذمہ اس کا دَین تھا، اور بعد میں اِفراطِ زَر کے نتیجے میں کرنسی نوٹ کی قدر گرگئی، جیسا کہ اکثر ہوتا رہتا ہے، تو اب حق دار کو کچھ

مزید دیدے، تاکہ اِفراطِ زَر کے نتیجے میں جو کمی واقع ہوئی ہے، وہ پوری ہو جائے، جیسا کہ رِبا جائز سمجھنے والے کہتے ہیں، اور یہ ان کی مستقل ایک دلیل ہے، اس طرح رِبا کا دروازہ کھل جائے گا، اور اگر جواب ''نہیں'' میں ہے، تو پھر فلوس اور کرنسی نوٹوں میں فرق بیان کرنا ضروری ہوگا۔

اس کا جواب ''نہیں'' میں ہے، اور اُس زمانے کے فلوس اور موجودہ کرنسی نوٹوں میں فرق ہے، کرنسی نوٹ فلوس کی طرح نہیں ہیں، لہٰذا فلوس میں اِمام ابو یوسفؒ کے قول کو اِختیار کرنے سے اور اس پر فتویٰ دینے دے لازم نہیں آتا کہ یہی معاملہ موجودہ کرنسی نوٹوں کے ساتھ بھی ہو، وجہ اس کی یہ ہے کہ اُس زمانے میں فلوس سونے اور چاندی کے ساتھ مربوط تھے، اور سونے چاندی کی بنیاد پر ہی ان کی قیمت مقرر ہوتی تھی، اور فلوس سونے چاندی کے لئے بطور ریزگاری استعمال ہوتے تھے، مثلاً:-

۱۰ فلس = دِرہم

یعنی ایک فلس دِرہم کا دسواں حصہ (۱۰/۱) ہوگیا، لیکن ایک فلس کی یہ قیمت اس کی ذاتی قیمت کی بنیاد پر مقرر نہیں ہوتی تھی، بلکہ یہ ایک ایسی علامتی قیمت ہوتی تھی، جس کو لوگوں نے اِصطلاح بنایا تھا، اس لئے یہ ممکن تھا کہ لوگ اس اِصطلاح کو تبدیل کردیں کہ اب:-

۲۰ فلس = دِرہم

یعنی ایک فلس دِرہم کا بیسواں حصہ (۲۰/۱) ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ فلوس سستے ہوگئے اور فلوس کی قیمت وقدر کم ہوگئی، اور یہ بھی ممکن تھا کہ لوگ یہ اِصطلاح مقرر کردیں کہ اب:-

۵ فلس = دِرہم

ہوگیا، یعنی ایک فلس دِرہم کا پانچواں حصہ (۵/۱) ہوگیا، اس کا مطلب یہ ہوا کہ فلوس کی قدر بڑھ گئی۔

مندرجہ بالا اُصول کے مطابق اگر فلوس کی قیمت میں اُتار چڑھاؤ آجائے، تو کیا مقروض یا مدیون پر وہی پُرانے سکے واپس کرنا واجب ہوں گے، یا اب ان کی قیمت کا اِعتبار

ہوگا، اس میں ذِکر کردہ اختلاف ہوگیا، اور حنفیہ نے اِمام ابو یوسفؒ کے قول پر فتویٰ دے دیا، لہٰذا ان کے قول کے مطابق اگر کسی شخص نے ایک سو فلوس قرض لئے تھے، اور پھر ایک فلس دِرہم کا بیسواں حصہ ہوگیا، تو اب وہ دو سو فلس واپس کرے گا، اس لئے کہ اس نے حقیقت میں دس دِرہم کی ریزگاری قرض لی تھی، اور اَب ادائیگی کے روز دس دِرہم کی ریزگاری دو سو فلوس ہوگئی، اس لئے قرض دار پر دو سو فلوس ادا کرنا واجب ہوگئے۔

لیکن جہاں تک موجودہ کرنسی نوٹوں کا تعلق ہے، ان کا کسی دُوسرے ثمن کے ساتھ کوئی ربط اور تعلق نہیں ہے، اور نہ ہی یہ نوٹ کسی اور ثمن کے لئے بطور ریزگاری اور اَجزاء کے استعمال ہوتے ہیں، بلکہ وہ خود مستقل ثمن ہیں، لہٰذا کرنسی نوٹوں کو فلوس پر قیاس کرنا دُرست نہیں، اس کے علاوہ فلوس کی صحیح قیمت معلوم کرنا ممکن تھا، کیونکہ وہ سونے یا چاندی کے ایک خاص معیار کے ساتھ مربوط تھے، بخلاف کرنسی نوٹوں کے کہ ان کا کوئی حقیقی معیار نہیں، بلکہ اس میں اشیاء کی قیمتوں کو دیکھ کر اَندازہ اور تخمین سے کام لیا جاتا ہے، جس کا شریعت میں کوئی اِعتبار نہیں۔

خلاصہ یہ کہ اِمام ابو یوسفؒ کے قول کا تعلق گزشتہ زمانے کے فلوس سے ہے، اور ان فلوس اور کرنسی نوٹوں میں فرق ہے، اس لئے اس حکم میں کرنسی نوٹ فلوس کی طرح نہیں ہوں گے، اور کرنسی نوٹ میں "قیمت" کا اِعتبار نہیں ہوگا، بلکہ "مثل" کا اِعتبار ہوگا، جیسا کہ جمہور فقہائے کرام کا موقف ہے، لہٰذا اِمام ابو یوسفؒ کے قول کو بنیاد بنا کر کرنسی نوٹوں میں اِفراطِ زَر کی بنیاد پر اِضافے کو جائز قرار دینا دُرست نہیں۔ [1]

قیمتوں کا اِشاریہ (Price Index)

اس کو انڈیکس نمبرز (Index Numbers) بھی کہتے ہیں۔

عام اشیاء کی قدر زَر کی مدد سے ماپی جاتی ہے، مثلاً: ہم کہتے ہیں کہ کرنسی کی قیمت

---

(۱) احکام الاوراق النقدیة للعثمانی (ص ۴۲)

—— کاغذی نوٹ اور کرنسی کا حکم

دوسو روپے ہے، اور مکان پانچ لاکھ روپے کا ہے، لیکن خود زَر کی قیمت وقدر اشیاء کی قیمتوں کے معیار سے پرکھی جاتی ہے، مثلاً: ہم کہتے ہیں کہ دس سال قبل سو روپے کی قدر ایک من گندم کے برابر تھی، لیکن آج صرف دس کلو کے برابر ہے، لہٰذا زَر کی قدر اس وقت زیادہ تھی، جب بھی تو اس کے بدلے زیادہ چیزیں آئیں، اور اب کم ہوگئی، کیونکہ چیزیں کم ہوگئیں۔

اب زَر کی پیمائش کس طرح ہوگی؟ اس کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا جاتا ہے کہ چند ایسی اشیاء جو کثیر الاستعمال ہوں، منتخب کی جاتی ہیں، اور ان کی (مختلف تاریخوں کے حساب سے) قیمتوں کا موازنہ (Comparison) کیا جاتا ہے، اس کو اِشاریہ (Index) کہتے ہیں۔

''اِشاریہ'' کا طریقہ اور اس کے مختلف مراحل

زیرِ بحث مسئلے کا شرعی حکم جاننے کے لئے قیمتوں کا اِشاریہ وضع کرنے کا طریقہ اور کرنسی کی قیمت کی تعیین میں اس کے استعمال کو جاننا ضروری ہے، لہٰذا قرضوں کا قیمتوں کے اِشاریہ کے ساتھ تعلق کے سلسلے میں معاشیین جو طریقہ اِختیار کرتے ہیں، ذیل میں اس کا خلاصہ بیان کیا جاتا ہے۔

جاننا چاہئے کہ کرنسی خواہ دھات کی ہو، یا کاغذ کی ہو، وہ بذاتِ خود مقصود نہیں، بلکہ اس کرنسی کے ذریعے انسان اپنی ضروریاتِ زندگی کی اشیاء وخدمات (Goods & Services) خریدتا ہے، اس لحاظ سے دیکھا جائے، تو ہر کرنسی کی دو قیمتیں ہوتی ہیں، ایک اس کی ظاہری قیمت (Face Value) اور دُوسری اس کی حقیقی قیمت (Real Value)، ظاہری قیمت کرنسی کی وہ قیمت کہلاتی ہے، جو اس کے اُوپر لکھی ہوئی ہوتی ہے، اور حقیقی قیمت اشیاء وخدمات کا وہ مجموعہ ہے، جو ایک انسان کے لئے اس کرنسی کے ذریعے خریدنا ممکن ہو،

آج کل معیشت دان اشیاء وخدمات کے اس مجموعے کو" اشیاء کی ٹوکری" (Basket of Goods) کہتے ہیں۔

مثلاً اگر زید کی ماہانہ تنخواہ دس ہزار روپے ہے، تو دس ہزار روپے اس کی ماہانہ آمدنی کی ظاہری قیمت ہے، پھر وہ یہ دس ہزار روپے مندرجہ ذیل اشیاء وخدمات میں صَرف کرتا ہے:-

گندم = ۴۰ کلو	اشیاء وخدمات کی ٹوکری (Basket of Goods & Services)
کپڑا = ۲۰ میٹر	
گوشت = ۲۰ کلو	
دال = ۵ کلو	
مکان کا کرایہ	
دو بیٹوں کے تعلیمی اخراجات	
طبّی معائنے کی فیس	

یہ اشیاء وخدمات کی ٹوکری ہے، اور یہ ٹوکری دس ہزار روپے کی حقیقی قیمت ہے۔

پھر اشیاء کی ٹوکری میں درج شدہ اشیاء سب ایک طرح اہمیت نہیں رکھتیں، بلکہ بعض چیزیں دُوسرے کے مقابلے میں زیادہ اہمیت کی حامل ہیں، مثلاً گندم کپڑے کے مقابلے میں زیادہ اہم ہے، اور کپڑا چائے کے مقابلے میں زیادہ اہم ہے، اور اس میں شک نہیں کہ ہر اِنسان کی زندگی پر اہم اشیاء میں تبدیلی زیادہ اثر انداز ہوتی ہے، بہ نسبت ان کی اشیاء کی قیمتوں میں تبدیلی کے جو کم اہمیت رکھتی ہوں، لہٰذا اگر چائے کی قیمت زیادہ ہو جائے، تو اتنی مشکلات پیدا نہ ہوں گی جتنی گندم کی قیمت زیادہ ہونے سے پیدا ہوں گی،

لہٰذا کرنسی کی حقیقی قیمت میں تبدیلی کو اشیاء کی قیمتوں میں اُوسط تبدیلی کے ذریعے معلوم کرنے کے لئے ماہرینِ معاشیات ہر چیز کی ایک خاص اہمیت فرض کرتے ہیں، پھر فرض کی ہوئی اہمیت کی بنیاد پر تمام اشیاء کے لئے علیحدہ علیحدہ نمبر مقرّر کرتے ہیں، اس نمبر کو معیشت دان ''چیز کا وزن'' (Weight of Commodity) کہتے ہیں، اور اس طرح اِشاریہ کو ''وزن دار اِشاریہ'' (Weighted Index Number) کہتے ہیں۔

اور اگر اِشاریہ میں تمام اشیاء کے ساتھ ایک جیسا معاملہ کیا جائے، اور ہر چیز کو ایک ہی وزن دیا جائے، تو اس اِشاریہ کو ''سادہ اِشاریہ'' (Simple Index Number) کہتے ہیں۔

اِشاریہ بنانے میں مختلف مراحل ہوتے ہیں:-

۱- اہم اشیاء کا انتخاب کیا جاتا ہے۔

۲- ہر شئی کو اس کی اہمیت کے پیشِ نظر ایک خاص وزن دیا جاتا ہے۔

۳- بنیادی سال کا انتخاب کیا جاتا ہے، یہ سال ایسا ہونا ضروری ہے جس میں معاشی اِعتبار سے کوئی غیر معمولی واقعہ رُونما نہ ہوا ہو، جس میں عام اشیاء کی قیمتیں نہ بہت کم ہوں، اور نہ بہت زیادہ ہوں، نہ یہ قحط کا سال ہو، نہ بہتات کا، نہ جنگ کا زمانہ ہو، نہ طویل امن کا، گویا کہ یہ سال نارمل ہو۔

۴- بنیادی سال کے مقابلے میں اس سال کا انتخاب کیا جاتا ہے، جس کی قیمتوں کے ساتھ بنیادی سال کی قیمتوں کا تقابل کیا جاتا ہے۔

۵- دونوں سالوں کے درمیان قیمت کی تبدیلی کا اُوسط نکالا جاتا ہے۔

۶- اُوسط تبدیلی کو اَشیاء کے وزن سے ضرب دی جاتی ہے۔

۷- حاصلِ ضرب کو جمع کیا جاتا ہے، حاصلِ جمع دونوں سالوں کی قیمتوں کا فرق ہوتا ہے۔

درج ذیل نقشہ ملاحظہ ہو!

١ اشیاء	٢ وزن	٣ ١٩٨٠ء	٤ ١٩٩٧ء	٥ تبدیلی اوسط	٦ نتیجہ ضرب
کھانا	٥٠٪	٣٠ کلو=٥٠ روپے	٣٠ کلو=١٠٠ روپے	٥٠/١٠٠=٢	١
کپڑا	٢٠٪	١٠ روپے میٹر	٣٠ روپے میٹر	١٠/٣٠=٣	ء٦
مکان	٣٠٪	٥٠٠ ماہانہ کرایہ	١٥٠٠ روپے	٥٠٠/١٥٠٠=٣	ء٩
مجموعہ:	،				٢ء٥

وضاحت

کالم ١:- انسان کی ضروریات میں سب سے اہم اشیاء کھانا، کپڑا اور مکان ہیں، اس لئے، ان تینوں کا انتخاب کیا گیا۔

کالم ٢:- اس کا مطلب یہ ہے کہ زید مثلاً اپنی تنخواہ کا پچاس فیصد کھانے میں، بیس فیصد کپڑے میں اور تیس فیصد رہائش میں صَرف کرتا ہے۔

کالم ٣، ٤:- میں دو سال کی قیمتوں کا تقابل کیا گیا کہ مثلاً ٨٠ء میں تیس کلو گندم کی قیمت پچاس روپے تھی، اور ٩٧ء میں یہ قیمت بڑھ کر سو روپے ہوگئی۔

کالم ٥:- میں دونوں سال کی قیمتوں کی تبدیلی کا اَوسط نکالا، جس کے لئے ٨٠ء کی قیمتوں کو ٩٧ء کی قیمتوں پر تقسیم کیا، یعنی: ٥٠ / ١٠٠ = ٢، یہ اَوسط تبدیلی ہے۔

کالم ٦:- اس میں اَوسط تبدیلی کو اَشیاء کے وزن کے ساتھ ضرب دیا، یعنی:

٥٠٪×٢ = ٥٠/١٠٠×٢/١ = ١

مجموعہ: سے مراد یہ ہے کہ اَوسط تبدیلی کو اَشیاء کے وزن میں ضرب سے جو حاصلِ ضرب نکلا، اس کو جمع کیا، یعنی:-

۱٫۰+۶٫۰+۹٫۰=۵٫۲

"۵٫۲" کا مطلب یہ ہے کہ وہ اشیاء کی ٹوکری جس کو ایک شخص ۸۰ء میں سو روپے میں خرید سکتا تھا، وہ ۹۷ء میں انہی اشیاء کی ٹوکری کو دو سو پچاس روپے میں خرید سکے گا، کیونکہ کرنسی کی حقیقی قیمت میں ۲۵٪ کے تناسب سے کمی واقع ہوگئی۔

اگر ہم فرض کریں کہ ۸۰ء میں ایک شخص کی ماہانہ تنخواہ ۵۰۰۰ روپے تھی، اور ۹۷ء میں اس کی ماہانہ تنخواہ زیادہ ہوکر ۱۰۰۰۰ روپے ہوگئی، تو اس کی ماہانہ تنخواہ کی قیمت اور حیثیت کا حساب مندرجہ ذیل طریقے سے کیا جائے گا:-

سال	ظاہر قیمت	زیادتی کا تناسب	حقیقی قیمت	کیفیت
۱۹۸۰ء	۵۰۰۰	۱٫۰	۵۰۰۰	۱×۵۰۰۰/۰
۱۹۹۷ء	۱۰۰۰۰	۲٫۵	۴۰۰۰	۲×۱۰۰۰۰/۵

تو گویا کہ ۱۰۰۰۰ روپے ۴۰۰۰ روپے مساوی ہوگئے۔

لہٰذا اگر کسی نے ۸۰ء میں ۴۰۰۰ روپے قرض لئے تھے، تو اب ۹۷ء میں وہ ۱۰۰۰۰ روپے واپس کرے، بصورتِ دیگر حق دار پر ظلم ہوگا، اسی وجہ سے بعض معیشت دان کہتے ہیں کہ اس زمانے میں قرض/دَین کو اِشاریہ کے ساتھ منسلک کرنا ضروری ہے، اور اس کے حساب سے قروض اور دیون کی ادائیگی کرنی چاہئے۔

کیا قرض اور اُجرت کو اِشاریہ کے ساتھ منسلک کیا جاسکتا ہے؟

(Indexation System)

حکم شرعی کے اِعتبار سے قرض/دَین کا اِشاریہ کے ساتھ مربوط کرنے اور اُجرت کو اس کے ساتھ مربوط کرنے کا حکم الگ الگ ہے، قرض یا دَین کا اِشاریہ کے ساتھ مربوط کرنے کی شریعت میں کوئی گنجائش نہیں ہے، البتہ اُجرت میں کچھ تفصیل ہے، دونوں مسئلوں کا خلاصہ ذیل میں مذکور ہے۔

قرضوں کو اِشاریہ کے ساتھ منسلک کرنا شرعاً کیسا ہے؟

اس سلسلے میں حق بات یہ ہے کہ قرضوں پر مذکورہ بالا زیادتی کو جائز کہنا اور اس کو عین انصاف قرار دینا شرعی قواعد کے مطابق نہیں، اس لئے کہ شریعتِ اسلامیہ میں قرضوں کو اسی مقدار کی مثل ادا کرنا واجب ہے، اس میں کسی کو اِختلاف نہیں ہے، حتیٰ کہ جو لوگ قرضوں کی قیمتوں کے اِشاریہ کے ساتھ تعلق کے جواز کے قائل ہیں، وہ بھی اس اُصول کو مانتے ہیں، لہٰذا اب ''مثل'' کی تعیین کرنی ہے، کہ مثل سے کیا مراد ہے؟ کیونکہ مثل کی دو قسمیں ہیں: ایک مثل معنوی اور ایک مثل صوری، تو قرضوں کی واپسی میں جس مثل کا اعتبار ہے، اس سے مراد مثل صوری ہے، یا مثل معنوی ہے، مثل معنوی سے یہاں مراد قیمت ہے، اور مثل صوری کا مطلب یہ ہے کہ جتنی چیز گنتی کے حساب سے یا وزن کے حساب یا کیل کے حساب سے قرض لی ہے، اسی مقدار میں واپس کرے، خواہ اس کی قیمت کچھ بھی ہو۔

قرآن وسنت اور لوگوں کے معاملات کے مشاہدے سے جو بات صاف طور پر معلوم ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ ''مثل'' سے یہاں مراد مثل صوری ہی ہے، یعنی کمیت میں برابری ضروری ہے نہ کہ قیمت اور مالیت میں، چند دلائل ذیل میں مذکور ہیں:-

۱- اگر ایک شخص دُوسرے سے ایک کلو گندم بطور قرض لے، اور قرض لیتے وقت ایک گندم کی قیمت پانچ روپے تھی، اور جب وہ قرض دار قرضہ واپس کرنے لگا، تو اس وقت ایک کلو گندم کی قیمت دو روپے ہوگئی تھی، تو اَب بھی وہ صرف ایک کلو گندم واپس کرے گا، زیادہ نہیں، باوجود یہ کہ ایک کلو گندم کی قیمت پانچ روپے سے کم ہو کر دو روپے رہ گئی، اور اس مسئلے میں فقہائے متقدمین ومتأخرین کا اِجماع ہے، فقہاء میں سے کوئی بھی اس مسئلے میں یہ نہیں کہتا کہ اس صورت میں جب کہ گندم کی مالیت کم ہوگئی ہے صرف ایک کلو گندم واپس کرنا قرض خواہ پر ظلم ہے، اس لئے گندم کی قیمت میں جتنی کمی واقع ہوئی ہے، اسی نسبت سے اِضافہ کر کے قرض خواہ کو واپس کرے، یعنی ایک کلو گندم کی بجائے اب قرض دار ڈھائی کلو

گندم واپس کرے، اس لئے کہ ڈھائی کلو گندم کی مالیت اب وہی ہے، جو قرض لیتے وقت ایک کلو گندم کی تھی۔

یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ قرض میں جس ''مثلیت'' اور برابری کا اِعتبار ہے، وہ مقدار اور کمیت میں برابری ہے، قیمت اور مالیت میں برابری معتبر نہیں۔

۲- تمام فقہائے کرامؒ کے نزدیک یہ مُسلّم ہے کہ قرضوں کی واپسی میں برابری کی شرط صرف سود سے بچنے کے لئے ہے، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مطلوبہ برابری کو رِبا الفضل کی احادیث میں پوری تشریح کے ساتھ واضح فرمادیا ہے، چند اَحادیثِ مبارکہ بطورِ نمونہ ملاحظہ ہوں!

عن ابی سعید الخدری رضی الله تعالی عنه : قال : کنا نرزق تمر الجمع علی عهد رسول الله ﷺ، وهو الخلط من تمر فکنا نبیع صاعین بصاع، فبلغ ذلك رسول الله ﷺ فقال: لا صاعین تمرا بصاع، ولا صاعین حنطة بصاع ولا ذرهما بدرهمین۔

''حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ہمارے پاس ہر قسم کی ملی جلی کھجوریں آیا کرتی تھیں، ہم (گھٹیا کھجور کے) دو صاع (بڑھیا کھجور) کے ایک صاع کے بدلے میں بیچ دیتے تھے، جب حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اِطلاع ہوئی، تو آپ نے فرمایا کہ دو صاع کھجور کو ایک صاع کھجور کے بدلے میں مت بیچو، اور نہ دو صاع گندم ایک صاع گندم کے بدلے میں بیچو، اور ایک دِرہم دو درہم کے بدلے میں مت بیچو۔[1]

---

(۱) جامع الاصول، ابن الاثیر الجزری (الامام مجد الدین ابی السعادات المبارك بن محمد) المتوفی ۶۰۶ھ، حلوان، مکتبة الحلوانی، طبع ۱۳۸۹ھ (۵۴۶/۱)

اس حدیثِ مبارک سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قیمت میں مثلیت اور برابری کا اِعتبار نہیں کیا، بلکہ کیت میں برابری اور مثلیت کا اعتبار کیا، کیونکہ یہ بات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم تھی کہ جو کھجور دو صاع کے بدلے میں بیچی جائے گی وہ اس کھجور کے مقابلے میں زیادہ قیمتی ہوگی، جو ایک صاع کے عوض بیچی جائے گی، لیکن اس کے باوجود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اس پر راضی نہیں ہوئے، بلکہ مقدار اور ناپ میں مماثلت اور برابری کا حکم دیا، اور قیمت کا اِعتبار نہیں کیا۔

عن ابی سعید وابی هريرة رضی الله تعالى عنهما : ان رسول الله ﷺ استعمل رجلا على خيبر فجاء هم بتمر جنيب، فقال : اكل تمر خيبر هكذا ؟ قال: انا لنأخذ الصاع بالصاعين والصاعين بالثلاث، قال: لا تفعل، بع الجمع بالدراهم ثم ابتع بالدراهم جنيبا۔

"حضرت ابوسعید خدری اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو خیبر کا عامل بنا کر بھیجا، وہ عامل جب واپس آیا، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جنیب (کھجور کی ایک عمدہ قسم) کھجور پیش کیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سوال کیا کہ کیا خیبر کی تمام کھجوریں ایسی ہوتی ہیں؟ انہوں نے جواب دیا: ہم ایک صاع کو دو صاع کے بدلے میں اور دو صاع کو تین صاع کے بدلے میں تبدیل کر لیتے ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایسا مت کرو، بلکہ جمع کھجور کو پہلے دَراہم کے عوض فروخت کر دو، پھر ان دَراہم سے جنیب کھجور خرید لیا کرو۔"[1]

یہ حدیث شریف اس بات کی واضح دلیل ہے کہ اَموالِ رِبویہ میں جو تماثل اور

(۱) جامع الاصول (۱/۵۵)۔

برابری مطلوب ہے، وہ مقدار میں تماثل ہے، قیمت میں تماثل اور برابری مطلوب نہیں، اس لئے کہ جنیب کھجور جمع کھجور کے مقابلے میں بہت اعلیٰ درجے کی قیمتی اور عمدہ کھجور تھی، لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کھجور کی ایک قسم کی دُوسری قسم سے تبدیل کرنے کی صورت میں عمدہ اور گھٹیا ہونے کا بالکل اعتبار نہیں کیا، بلکہ وزن میں برابری کو ضروری قرار دیا۔

عن عبادة بن صامت رضی الله تعالی عنه: قال رسول الله ﷺ: الذهب بالذهب والفضة بالفضة والبر بالبر والشعير بالشعير والتمر بالتمر والملح بالملح مثلا بمثل سواء بسواء يدا بيد، فاذا اختلفت هذه الاصناف فبيعوا كيف شئتم اذا كان يدا بيد۔

''حضرت عبادۃ بن صامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ فرماتے ہیں کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سونے کو سونے کے بدلے میں چاندی کو چاندی کے بدلے میں گندم کو گندم کے بدلے میں، جو کو جو کے بدلے میں کھجور کو کھجور کے بدلے میں اور نمک کو نمک کے بدلے میں ہاتھ دَر ہاتھ بیچو، ہاں اگر ان اشیاء کی بیع میں جنس مختلف ہو جائے، تو پھر جس طرح چاہو، بیچو، بشرطیکہ ہاتھ دَر ہاتھ ہو۔''(۱)

عن ابی هريرة رضی الله تعالی عنه قال: قال رسول الله ﷺ: الذهب بالذهب وزنا بوزن مثلا بمثل والفضة بالفضة وزنا بوزن مثلا بمثل فمن زاد او استزاد فهو ربا۔

''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سونا سونے کے بدلے میں وزن کر کے بیچو،

(۱) جامع الاصول (۵۵۲/۱)۔

اور چاندی کو چاندی کے بدلے میں وزن کر کے بیچو، ان میں جو شخص زیادتی کرے، یا زیادتی طلب کرے، تو وہ زیادتی سود ہے۔"(1)

عن عبادة بن الصامت رضی الله تعالی عنه ان النبی ﷺ قال: الذهب بالذهب تبرها وعينها، والفضة بالفضة تبرها وعينها، والبر بالبر مدين بمدين والشعير بالشعير مدين بمدين والتمر بالتمر مدين بمدين والملح بالملح مدين بمدين فمن زاد او اسزداد فقد اربی۔

"حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سونے کو سونے کے بدلے میں چاہے وہ سونے کا ٹکڑا ہو، یا ڈھلا ہوا سکہ ہو، چاندی کو چاندی کے بدلے میں چاہے وہ چاندی کا ٹکڑا ہو، یا ڈھلا ہوا سکہ ہو، اور دو مدی گندم کو دو مدی گندم کے بدلے میں، اور دو مدی جو کو دو مدی جو کے بدلے میں، اور دو مدی کھجور کو دو مدی کھجور کے بدلے میں اور دو مدی نمک کو دو مدی نمک کے بدلے میں بیچو، اور جس شخص نے زیادتی کی یا زیادتی طلب کی، اس نے سود لیا۔"(2)

مندرجہ بالا ساری احادیث اس بات کو واضح طور پر بیان کرتی ہیں کہ شریعت میں جو تماثل اور برابری مطلوب ہے، وہ مقدار میں برابری ہے، اَموالِ رِبویہ میں قیمت کے تفاوت کا کوئی اِعتبار نہیں۔

اس سلسلے میں ایک حدیث اور ہے، جو خاص کر قرض ہی میں مثلیت اور برابری کو واضح کرتی ہے:-

---

(۱) جامع الاصول (۱/۵۵۴)۔

(۲) جامع الاصول۔

عن عبدالله بن عمر رضی الله تعالى عنهماقال: كنت ابيع الابل بالبقيع فابيع بالدنانير وآخذ الدراهم، وابيع بالدراهم وآخذ الدنانير آخذ هذه من هذه، واعطى هذه من هذه، فاتيت رسول الله ﷺ وهو في بيت حفصة، فقلت : يارسول الله !رويدك اسئلك، انى ابيع الابل بالبقيع فابيع بالدنانير وآخذ الدراهم وابيع بالدراهم وآخذ الدنانير، آخذهذه من هذه واعطى هذه من هذه، فقال رسول الله ﷺ : لابأس ان تاخذها بسعر يومها مالم تفترقا وبينكما شئی۔

''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا: میں مقامِ بقیع میں اُونٹ بیچا کرتا تھا، تو کبھی دِیناروں کے ذریعے بھاؤ کر کے اُونٹ بیچتا، اور بجائے دِینار کے مشتری سے دَراہم لے لیتا، اور کبھی دَراہم کے ذریعے بھاؤ کرتا، اور بجائے دَراہم کے دِینار وصول کرتا، یعنی دِینار کے بدلے دِرہم اور دِرہم کے بدلے دِینار وصول کرتا، اور ادا کرتے وقت بھی دَراہم کے بدلے دِرہم اور دِرہم کے بدلے دِینار ادا کرتا ہوں، ایک مرتبہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، اس وقت آپ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے گھر پر تھے، میں نے کہا: میں مقامِ بقیع میں اُونٹ بیچا کرتا تھا، تو کبھی دِیناروں کے ذریعے بھاؤ کر کے اُونٹ بیچتا، اور بجائے دِینار کے مشتری سے دَراہم لے لیتا، اور کبھی دَراہم کے ذریعے بھاؤ کرتا، اور بجائے دَراہم کے دِینار وصول کرتا، یعنی دِینار کے بدلے دِرہم اور دِرہم کے بدلے دِینار وصول کرتا، اور ادا کرتے وقت بھی دَراہم کے

بدلے دِرہم اور دِرہم کے بدلے دِینار اَدا کرتا ہوں، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، اس طرح معاملہ کرنے میں کوئی حرج نہیں، بشرطیکہ اسی روز کے بھاؤ کے برابر لو، اور تم دونوں کے درمیان اس حالت میں جدائی نہ ہو، کہ تمہارے درمیان کوئی لین دین باقی ہو۔"(۱)

اس حدیث سے اِستدلال اس طرح ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے لئے اس چیز کو جائز قرار دیا کہ جب بیع دِینار کے ذریعے ہو، تو ادائیگی کے روز دِینار کی جو قیمت ہو، اس قیمت کے برابر دَراہم وصول کرلیں، جس روز ذمہ واجب ہوئے ہوں، اس روز کی قیمت کا اعتبار نہیں، مثلاً بیع میں ایک دِینار طے ہوا، اور بیع کے روز ایک دِینار کی قیمت دس دِرہم تھی، اور اس وقت مشتری نے ادا نہیں کی، کچھ روز بعد جب مشتری نے قیمت ادا کرنا چاہا تو اس وقت اس کے پاس دَراہم تو تھے مگر دِینار نہیں تھے، اور اس روز ایک دِینار کی قیمت گیارہ دِرہم ہوگئی، تو اَب مشتری بائع کو گیارہ دِرہم ہی ادا کرے گا۔

قرآن وسنت کی روشنی میں یہ بات تمام فقہاء کے نزدیک مُسلَّم ہے کہ قرض کی واپسی کے وقت مقدار میں یقینی مثلیت اور برابری شرط ہے، اٹکل اور اَندازے سے واپس کرنا جائز نہیں حتیٰ کہ اگر ایک شخص نے ایک صاع گندم بطورِ قرض لئے اور یہ شرط ٹھہرائی کہ قرض دار مجھے بغیر ناپ کے صرف اَندازے اور تخمین سے ایک صاع واپس کرے، تو قرض کا یہ معاملہ جائز نہیں، اس لئے کہ اَموالِ رِبویہ میں اندازے اور تخمین سے ایک صاع واپس کرنا جائز نہیں، اسی وجہ سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بیع مزابنہ کو حرام قرار دیا ہے، بیع مزابنہ یہ ہے کہ درخت پر لگی ہوئی کھجور کو ٹوٹی ہوئی کھجور کے بدلے میں بیچا جائے اور اس کی حرمت کی وجہ یہی ہے کہ جو کھجور ٹوٹی ہوئی ہے، اس کی مقدار وزن کے ذریعے معلوم کی

(۱) سنن ابوداود کتاب البیوع۔

جاسکتی ہے، اور جو کھجور درخت پر لگی ہوئی ہے اس کی مقدار معلوم کرنے کا طریقہ اندازہ اور تخمین کے علاوہ کوئی اور نہیں ہے، اس وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بیع کو علی الاطلاق حرام قرار دے دیا، حالانکہ بعض اوقات اندازہ بالکل صحیح یا صحیح کے قریب ہوتا ہے، لہٰذا اَموالِ رِبویہ میں سے بعض کو بعض سے تبادلہ کرنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے، وہ یہ کہ دونوں میں تبادلہ عملی طور پر مقدار میں برابری کے ذریعے ہو، اندازہ اور تخمین کے ذریعے برابری کافی نہیں ہے۔

دُوسری طرف اگر قرضوں کو قیمتوں کے اِشاریے سے منسلک کیا جائے، تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ قرض کی ادائیگی میں حقیقی مثلیت کا اعتبار نہیں کیا گیا، بلکہ ایک تخمینی مثلیت پر ادائیگی کی بنیاد رکھی گئی، اس لئے کہ قیمتوں کے اِشاریے میں اشیاء کی قیمتوں میں کمی اور زیادتی کا جو تناسب نکالا جاتا ہے، وہ تقریبی اور تخمینی ہوتا ہے، جس کی بنیاد ایک ایسا مخصوص حسابی طریقہ ہے جو اَندازے اور اٹکل ہی کے ذریعے کیا جاتا ہے۔

چنانچہ اس حسابی طریقے میں درج ذیل مقامات پر اٹکل اور اندازے سے کام لیا جاتا ہے۔

ا- اِشاریے میں درج شدہ اشیاء کی تعیین

یہ بات معلوم ہی ہے کہ ہر شخص کی اپنی خاص ضروریات ہوتی ہیں، اس لئے ایک شخص کی اشیائے ضرورت بھی دُوسرے شخص سے مختلف ہوں گی، لہٰذا ایک شخص کی "اشیاء کی ٹوکری" دُوسرے شخص کی ٹوکری سے مختلف ہوگی، لیکن اِشاریے میں درج شدہ ٹوکری صرف ایک ہے، جس میں اشیاء کو اس کے استعمال کرنے والوں کی کثرت کی بنیاد پر درج کیا جاتا ہے، اس لئے بعض اوقات اس میں ایسی اشیاء بھی درج ہوتی ہیں، جن کی بعض لوگوں کو پوری زندگی میں کبھی ضرورت ہی پیش نہیں آتی، اس لئے ان بعض کے اعتبار سے یہ اِشاریہ دُرست نہیں ہوسکتا، لہٰذا معلوم ہوا کہ اِشاریے میں بعض اشیاء صرف اندازے اور تخمین سے درج کی جاتی ہیں۔

۲-اشیاء کے وزن (اہمیت) کی تعین

دُوسرے یہ کہ اشیاء کے وزن اور صارفین کے اعتبار سے اس کی اہمیت کے تعین میں اندازے اور اٹکل سے کام لیا جاتا ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ اشیاء کی اہمیت ایک اضافی چیز ہے، جو اشخاص کے اختلاف سے مختلف ہو جاتی ہے، بعض اوقات ایک چیز ایک شخص کے نزدیک بہت اہمیت کی حامل ہے، اور وہی چیز دُوسرے شخص کے لئے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی، اِشاریہ اس مفروضے پر بنایا جاتا ہے کہ ہر چیز کی جو اہمیت ہم نے فرض کی ہے، وہ تمام صارفین کے اِعتبار سے ہے، اور یہ درمیانی اَوسط کی بنیاد پر فرض کی جاتی ہے، جو صرف اندازے اور تخمین ہی سے نکالی جاتی ہے۔

۳-اشیاء کی قیمت کا تعین

تیسرے یہ کہ مختلف سالوں میں اشیاء کی قیمتوں کا تعین بھی اندازے اور اٹکل سے کیا جاتا ہے، اس لئے کہ ظاہر ہے کہ ایک ہی چیز کی قیمت مختلف شہروں اور جگہوں کے اعتبار سے مختلف ہوگی، اور اِشاریے میں صرف ایک ہی جگہ کی قیمت کا اندراج ممکن ہے، اس لئے اگر ایک ملک کا اِشاریہ بنانا ہو، تو صرف تمام جگہوں کی قیمتوں کا درمیانی اَوسط نکال کر ہی بنایا جا سکتا ہے، ظاہر ہے کہ یہ اَوسط اندازے اور تخمین ہی کے ذریعے نکالا جا سکے گا۔

مندرجہ بالا بحث سے معلوم ہو گیا کہ اِشاریہ اپنے تمام مراحل میں اندازے اور تخمین پر مبنی ہے، اور اگر کسی جگہ پر حساب بہت باریک بینی اور پوری احتیاط سے بھی کیا جائے، تو بھی اس کے نتیجے کو زیادہ سے زیادہ تقریبی تو کہہ سکتے ہیں، یقینی اور واقعی پھر بھی نہیں کہہ سکتے، جبکہ اُوپر احادیث کی روشنی میں یہ واضح ہو چکا ہے کہ قرضوں کی واپسی میں اٹکل اور اندازے کی شرط لگانا جائز نہیں، لہٰذا قرضوں کی ادائیگی کا قیمتوں کے اِشاریے سے منسلک کر دینا کسی حال میں دُرست نہیں۔ (۱)

(۱) فقہی مقالات، عثمانی (جسٹس مفتی محمد تقی عثمانی) کراچی، میمن اسلامک پبلشرز کراچی ۱۹۹۴ء (۱/۴۹)۔

اسلامی فقہ اکیڈمی جدہ کی قرارداد درج ذیل ہے:-

ان مجلس مجمع الفقه الاسلامي المنعقد في دورة مؤتمره الخامس بالكويت من ١ الى ٦ جمادى الاولى ١٤٠٩هج -١٠ الى ١٥ كانون الاول (ديسمبر) ١٩٨٨م---قرر مالي: العبرة في وفاء الديون الثابتة ما هي بالمثل وليس بالقيمة لان الديون الثابتة تقضي بامثالها، فلايجوز ربط الديون الثابتة في الذمة ايا كان مصدرها بمستوى الاسعار والله اعلم-

''اسلامی فقہ اکیڈمی کی مجلس جس کی پانچویں کانفرنس کویت میں یکم تا ۶ر جمادی الاولیٰ ۱۴۰۹ھ- ۱۰ تا ۱۵ر دسمبر ۱۹۸۸ء نے درج ذیل قرارداد پیش کی: ''جو قروض ذمہ میں واجب ہوں، ان کی ادائیگی میں مثل کا اعتبار ہے، اور قیمت کا اعتبار نہیں، کیونکہ قروض کی ادائیگی میں مثل کا اعتبار ہوتا ہے، لہٰذا قروض اور دیون جو ذمہ میں واجب ہوں، ان کو کسی حال میں اِشاریے کے ساتھ منسلک نہیں کیا جاسکتا۔''[1]

مزدوروں کی اُجرتوں کو اِشاریے کے ساتھ وابستہ کرنا

جہاں تک اُجرتوں کی قیمتوں کے اِشاریے سے ربط کا مسئلہ ہے، تو جب تک اُجرت قرض نہ بن جائے، اس وقت تک اس کا حکم ''قرضوں کے ربط'' سے مختلف ہوگا، البتہ اُجرت اگر قرض بن جائے، تو اس صورت میں اس کا حکم بھی وہی ہوگا، جو قرضوں کے ربط کا حکم ہے۔

---

(۱) مجلة المجمع الفقه الاسلامي، الدورة الخامسة، العدد الخامس، الجزء الثالث ١٤٠٩هج /١٩٨٨ء (ص ٢٢٦١)-

تفصیل اس کی یہ ہے کہ اُجرتوں کو اِشاریے کے ساتھ مربوط کرنے کی تین صورتیں ممکن ہیں:-

پہلی صورت

پہلی صورت کہ اُجرتیں اور تنخواہیں نوٹوں کے ذریعے طے ہوجائیں، کہ اتنی اُجرت یا تنخواہ دی جائے گی، اور مالک اور مزدور کے درمیان یہ معاہدہ ہوجائے کہ یہ تنخواہ ہر سال قیمتوں کے اِشاریے کے زیادتی کے تناسب سے بڑھتی رہے گی، مثلاً حکومت ایک شخص کو تین ہزار روپے ماہوار تنخواہ ملازم رکھے، اور یہ معاہدہ کرے کہ یہ تنخواہ ہر سال کے شروع میں قیمتوں کے اِشاریے میں زیادتی کے تناسب سے بڑھتی رہے گی، اس صورت میں اس ملازم کو ہر سال کے آخر تک ہر ماہ تین ہزار روپے ہی قبول کرنے پڑیں گے، اور درمیان سال میں قیمتوں کے اِشاریے میں زیادتی کے تناسب کو نہیں دیکھا جائے گا، البتہ جب نیا سال شروع ہوگا، تو اس وقت اِشاریے کو دیکھا جائے گا، کہ ایک سال کے اندر اس میں کس تناسب سے زیادتی ہوئی، مثلاً قیمتوں کے اِشاریے میں ۵٪ کے تناسب سے زیادتی ہوئی تھی، تو اس ملازم کی تنخواہ میں بھی اسی تناسب سے زیادتی کرنی ہوگی، لہٰذا اب نئے سال سے اس کی تنخواہ تین ہزار ایک سو پچاس روپے ہوجائے گی۔

یہ طریقہ بہت سے ممالک مثلاً پاکستان وغیرہ میں رائج ہے، اور اس قسم کے ربط کی شریعت میں کوئی ممانعت نہیں ہے، اس لئے کہ اس صورت میں کا حاصل یہ ہے کہ دونوں فریق اُجرتوں اور تنخواہوں میں ہر سال یا ہر چھ ماہ بعد ایک متعین شرح تناسب سے زیادتی پر متفق ہوگئے ہیں، اور یہ زیادتی کا تناسب اگرچہ عقد کے وقت تو فریقین کے علم میں نہیں تھا، مگر وہ پیمانہ معلوم ہے جس کی بنیاد پر تناسب کا تعین ہوگا، اس لئے زیادتی کی مقدار میں جو جہالت کا شبہ تھا، وہ مرتفع ہوگیا، یا یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہر نئے سال کے شروع میں جس تناسب سے قیمتوں میں زیادتی ہوئی ہوگی، اسی تناسب سے اِضافہ شدہ اُجرت پر اس عقدِ اِجارہ کی

تجدید کی جائے گی، اور اس میں کوئی شرعی ممانعت نہیں ہے۔

دُوسری صورت

اُجرتوں کے قیمتوں کے اِشاریے سے ربط کی دُوسری صورت یہ ہے کہ اُجرت کی تعیین نوٹوں کی ایک معلوم مقدار پر ہو جائے، لیکن عقد میں شرط کرلیں کہ مالک کے ذمہ یہ مقدار معلوم واجب نہیں، بلکہ اس کے ذمہ وہ مقدار واجب ہوگی جو قیمتوں کے اِشاریے کی رُو سے مہینے کے آخر میں اس مقدار معلوم کے مساوی اور برابر ہوگی۔

مثلاً زید نے عمرو کو ایک ماہ کے لئے ملازم رکھا اور یہ طے پایا کہ زید عمرو کو مہینے کے آخر میں قیمتوں کے اِشاریے کے لحاظ کرتے ہوئے اتنی رقم اُجرت میں دے گا، جو موجودہ ایک ہزار روپے کے مساوی ہوگی، چنانچہ قیمتوں کے اِشاریے میں ایک ماہ کے اندر دو فیصد کے تناسب سے قیمتیں بڑھ گئیں، تو اَب زید مہینے کے آخر میں عمرو کو ایک ہزار بیس روپے ادا کرے گا، اس لئے کہ یہ ایک ہزار اور بیس روپے شروع مہینے کے ایک ہزار روپے کے مساوی ہیں۔

لیکن جب مہینے کے آخر میں یہ طے ہوگیا کہ تنخواہ ایک ہزار اور بیس روپے ہے، تو اَب یہ تنخواہ ہمیشہ کے لئے ایک ہزار اور بیس روپے ہی رہے گی، زائد نہ ہوگی، لہٰذا اگر مالک مہینے کے آخر میں یہ تنخواہ ادا نہیں کرسکا حتیٰ کہ ایک مہینہ اور گزر گیا، یا ایک سال گزر گیا، اور اس نے تنخواہ ادا نہیں کی، تب بھی مالک کے ذمہ ایک ہزار اور بیس روپے واجب ہوں گے، قیمتوں کے اِشاریے میں زیادتی سے اس میں زیادتی نہیں آئے گی، مثلاً اگر اس عرصے میں قیمتوں کے اِشاریے میں دس فیصد کے تناسب سے اِضافہ ہوچکا ہے، اس لئے اب مجھے ایک ہزار بیس روپے پر دس فیصد کے حساب سے اِضافہ کرکے اُجرت دی جائے، اس لئے عقد کے وقت ہی آپس کے اتفاق سے اُجرت کے بارے میں یہ بات طے ہوچکی تھی کہ مہینے کے آخر میں جتنے روپے موجودہ ایک ہزار کے مساوی ہوں گے، وہ دیئے جائیں گے، اور

صرف تعین کے لئے قیمتوں کے اِشاریے کو مدِنظر رکھا جائے گا، لیکن جب مہینے کے آخر میں قیمتوں کے اِشاریے کی بنیاد پر ایک مرتبہ اُجرت طے ہوگئی، تو اَب قیمتوں کے اِشاریے کا کام مکمل ہو چکا، اب اس کی ضرورت نہیں رہی اور اَب وہ معین اُجرت مالک کے ذمہ قرض ہوگئی، جس میں آئندہ نہ تو زیادتی ہوسکتی ہے، اور نہ کمی واقع ہوسکتی ہے، قیمتوں کے اِشاریے میں چاہے کتنے بھی تغیرات واقع ہوجائیں۔

جہاں تک اس صورت کی شرعی حیثیت کا تعلق ہے، اس میں جسٹس مفتی محمد تقی صاحب کی رائے یہ ہے کہ یہ بھی جائز ہے، بشرطیکہ قیمتوں کا اِشاریہ اور اس کے حساب کا طریقہ فریقین کو اچھی طرح معلوم ہو، تا کہ بعد میں لاعلمی کی بناء پر آپس میں جھگڑا نہ ہوجائے، اس لئے کہ یہاں دونوں فریق اس بات پر متفق ہیں کہ طے شدہ اُجرت ایک ہزار روپے نہیں، بلکہ قیمتوں کے اِشاریے کے اِعتبار سے مہینے کے آخر میں جتنے روپے موجودہ ایک ایک ہزار روپے کے مساوی ہوں گے، وہ مالک پر دینے واجب ہوں گے، جس کو حساب کے ذریعے نکالنے کا طریقہ دونوں فریق کو معلوم بھی ہو، لہٰذا اُجرت کی مقدار میں اتنی جہالت جھگڑا کا سبب نہیں بنے گی، اور شرعاً اتنی جہالت متحمل ہوتی ہے۔

تیسری صورت

تیسری صورت کہ اُجرت تو روپے کی معین مقدار کے ذریعے طے ہوجائے، اور فریقین کے درمیان یہ شرط ہوجائے کہ وہ اُجرت مالک کے ذمہ واجب ہوگی، جو عقدِ اِجارہ میں طے ہوئی ہے، لیکن جس دن یہ اُجرت ادا کرے گا، اس دن قیمتوں کے اِشاریے میں جس تناسب سے اِضافہ ہوا ہوگا، اسی تناسب سے وہ اُجرت میں بھی اِضافہ کرکے ادا کرے گا۔

مثلاً ایک شخص نے کسی کو ایک ہزار روپے پر ملازم رکھا، اور دونوں کے درمیان یہ طے ہوگیا کہ اُجرت ایک ہزار روپے ہے، لیکن مالک پر یہ ضروری نہیں ہوگا کہ جس دن وہ یہ اُجرت ادا کرے گا، اس دن قیمتوں کے اِشاریے میں جس تناسب سے اشیاء کی قیمتوں میں

اِضافہ ہوا ہوگا، اسی تناسب سے وہ بھی ایک ہزار روپے میں اِضافہ کردے گا، لہٰذا مالک نے اگر یہ اُجرت مہینے کے آخری دن میں ادا کی اور اس روز قیمتوں کے اِشاریے میں دو فیصد کے تناسب سے اِضافہ ہو چکا تھا، تو اَب مالک بھی دو فیصد کے تناسب سے اِضافہ کرکے ایک ہزار اور بیس روپے ادا کرے گا، اور اگر مالک نے یہ اُجرت ایک سال کے بعد ادا کی، اور اس وقت تک قیمتوں میں دس فیصد کے تناسب سے اشیاء کی قیمتوں میں اِضافہ ہو چکا تھا، تو اب مالک بھی دس فیصد کے تناسب سے اِضافہ کرکے گیارہ سو روپے ادا کرے گا۔

یہ صورت شرعاً جائز نہیں، کیونکہ ''قرضوں کے قیمتوں کے اِشاریے کے ساتھ ربط'' کی طرح ہے، جس کی تفصیل پیچھے گزر گئی ہے۔

تیسری اور دُوسری صورت میں فرق

دُوسری صورت میں اِشاریہ سے صرف متفقہ اُجرت کی تعیین کا کام لیا جاتا ہے، اور اِشاریے کی بنیاد پر جب ایک مرتبہ اُجرت متعین ہوگئی، تو اِشاریے کا کام ختم ہو چکا، اب ہمیشہ کے لئے یہی متعین اُجرت مالک کے ذمہ واجب رہے گی، اس پر زیادتی نہ ہوگی، چاہے مالک جب بھی ادا کرے۔

بخلاف تیسری صورت کے کہ اس صورت میں اُجرت ایک ہزار روپے متعین تھی، جو ادا نہ کرنے کی بنا پر مالک کے ذمہ قرض (دَین) بن گئی تھی، اور پھر اس قرض کو اِشاریے کے ساتھ ملا دیا گیا تھا، لہٰذا اس تیسری صورت کا بھی وہی حکم ہوگا، جو اس سلسلے میں قرضوں کا ہے۔[1]

فلوس کی قیمت میں تبدیلی اور اقوالِ فقہاء

اس مسئلے پر مفصل کلام ''اِفراطِ زَر اور تفریطِ زَر'' کے عنوان کے تحت ہوا ہے، مزید بحث کی ضرورت نہیں ہے۔

---

(۱) فقہی مقالات (۱/۷۴)، احکام الاوراق النقدیة (ص ۷۲)، کاغذی نوٹ اور کرنسی کا حکم۔

باب ہفتم

زرِ اِعتباری یا زرِ تجارت (Credit Money)

اِعتبار (Credit) کی حقیقت

''اِعتبار'' انگلش لفظ "Credit" کا ترجمہ ہے، عربی میں کریڈٹ کو "ائتمان" کہتے ہیں، جس کے معنی اِعتبار اور اِعتماد کے ہیں۔

اِصطلاحی تعریفات درج ذیل ہیں:-

برٹانیکا میں کریڈٹ کی تعریف یوں کی گئی ہے:-

Transaction between two parties in which one (the creditor or lender) supplies money , goods , services or securities in return for a promised future payment by the other (the debtor or borrower)(۱)

''کریڈٹ ایک ایسا معاملہ ہے، جس میں ایک پارٹی زر، سامان، خدمات یا سیکورٹیز مہیا کرتی ہے، جبکہ دُوسری طرف سے مستقبل میں موعود ادائیگی ہوتی ہے۔''

مختصر الفاظ میں یہ تعریف کی گئی ہے:-

Present right to a future payment

آئندہ ادائیگی پر حالیہ حق کا نام کریڈٹ ہے۔ (۲)

کریڈٹ کی ایک اور تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے:-

---

(۱) Britannica V:3,P: 722

(۲) Footnotes on Introduction to Economics principles P: 341

"یعرف الائتمان بانه تنازل عن مال حاضر لقاء مال مستقبل واساسه الثقة"[۱]

''کریڈٹ کی تعریف یہ کی جاتی ہے کہ آئندہ مال کے بدلے میں حالیہ مال سے دستبردار ہونا، اور اس کی بنیاد اِعتماد ہے۔''

موسوعة المصطلحات الاقتصادية میں کریڈٹ کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے:-

"منح حق استخدام او امتلاك السلع والخدمات دون دفع القيمة فوراً"[۲]

اس تعریف کا بھی حاصل وہی ہے، جو سابقہ تعریفات کا ہے۔

اُردو کتابوں میں درج ذیل تعریف کی گئی ہے:-

''اِعتبار سے مراد بھروسہ، یقین یا اِعتماد ہے جو قارض اپنے کسی مقروض پر اسے قرضہ دیتے وقت یا اُدھار مال دیتے وقت کرتا ہے، اور یہ سمجھتا ہے کہ مقروض اسے طے شدہ مدّت کے بعد قرض کی رقم واپس کردے گا، یا اس نے اُدھار پر جو مال خریدا تھا، اس کی قیمت ادا کرے گا۔''[۳]

حاصل یہ کہ ''کریڈٹ'' اِعتماد، یقین، اور اِعتبار کو کہتے ہیں، اور اس میں اسی اِعتماد کی بنیاد پر اُدھار معاملہ ہوتا ہے۔

---

(۱) القاموس الاقتصادی، النجفی(حسن النجفی)بغداد، مديرية مطبعة الادارة المحلية۱۹۷۷م (ص۸۸)

(۲) موسوعة المصطلحات الاقتصادية والاحصائية، هيكل(الدكتور عبدالعزيز فهمي هيكل) بيروت، دارالنهضة العربية ۱۹۸۰م (ص۱۸۲)

(۳) تعارف زَر و بنکاری، شیخ مبارک علی، ریسرچ سکالر اوسلو یونیورسٹی ناروے، رہبر پبلشرز کراچی طبع اوّل ۱۹۹۱ء (ص۲۲۱)۔

زَرِاعتباری یا زَرِتجارت کی حقیقت

زَرِاعتباری یا زَرِتجارت کی تعریف یہ کی گئی ہے:۔

صکوک مکتوبة بشکل قانونی محدد تتضمن التزاما بدفع مبلغ من النقود فی وقت معین اوقابل للتتعین ویمکن نقل الحق الثابت بطریق التظهیر والمناولة۔(۱)

لکھے ہوئے صکوک ہیں جو محدود ہوں، اور قانونی شکل میں ہوں، اور جن میں اس بات کی ضمانت ہو کہ ایک معین وقت میں زَر کی کچھ مخصوص مقداران کی بنیاد پر دی جائے گی، اور جو حق واجب ہو اس کو دُوسرے کی طرف تظہیر یا مناولہ کے طریقے سے منتقل کرنا ممکن ہو۔

ڈاکٹر محمد زکی شافعی اس سلسلے میں تحریر فرماتے ہیں:۔

ومن هنا یطلق علیها اصطلاح النقود الائتمانیة لان الائتمان عبارة عن الوعد بدفع مبلغ من النقود ومن هنا ایضا لیست النقود الائتمانیة سوی دیون تترتب لصالح حاملها فی ذمة الدولة او البنوك وتعتمد فیما تتمتع به من قبول عام فی المعاملات علی عنصر الثقة۔(۲)

اسی وجہ سے ان پر زَرِاعتباری کی اِصطلاح کا اِطلاق ہوتا ہے، کیونکہ "ائتمان" زَر کی مخصوص مقدار کے دینے کے وعدے کو کہتے ہیں، اسی وجہ سے زَرِاعتباری دیون ہی ہیں جو حکومت یا بنکوں کے ذمہ حاملین کے لئے واجب ہوتے ہیں، اور اِعتماد کی بنیاد پر معاملات

---

(۱) احکام الاوراق النقدیة والتجاریة للجعید (ص ۲۲۱)

(۲) مقدمة فی النقود والبنوك، شافعی(محمد زکی) بیروت، دارالنهضة العربیة طبع هفتم (ص ۴۳)۔

میں عام طور پر قبول کیے جاتے ہیں۔

اُردو میں زَرِ اعتباری کی آسان الفاظ میں یہ تعریف کی گئی ہے:-

قرض کی صورت میں لین دین کرنے یا اُدھار پر مال کا لین دین کرنے کو اِعتبار کہا جاتا ہے، اور اس مقصد کے لئے جو تحریری وعدہ بطورِ آلہ استعمال کیا جاتا ہے اسے اِعتباری زر کا نام دیا جاتا ہے۔ [1]

زَرِ اِعتباری کی چاری خصوصیات

ان تعریفات سے معلوم ہوتا ہے کہ زَرِ اعتباری میں چار خصوصیات پائی جاتی ہیں:-

۱-ان میں لین دین تظہیر (Endorsment) کے طریقے سے ہوتا ہے۔

۲-دَین کا محل زَر کی مخصوص مقدار ہے۔

۳-معاملات میں زَر کا وظیفہ ادا کرتا ہے۔

۴-خاص شکل میں لکھے ہوئے دستاویزات ہیں (یعنی محدود اور قانونی شکل میں)۔

زَرِ اِعتباری کی مشہور قسمیں

زَرِ اعتباری کی مشہور قسمیں درج ذیل ہیں:-

۱-ہنڈی (Bill of Exchange)

۲-بانڈز (Bonds)

۳-چیک (Cheque)

۴-پرامیسری نوٹ (Promissory Note)

۵-ڈرافٹ (Draft)

بعض مصنّفین نے کمی بیشی کے ساتھ زَرِ اعتباری کی مذکورہ قسمیں بیان کی ہیں۔

---

(۱) تعارف زَر و بنکاری، شیخ مبارک علی، ریسرچ سکالر اوسلو یونیورسٹی ناروے، رہبر پبلشرز کراچی طبع اوّل ۱۹۹۱ء، (ص ۲۲۱)۔

اس عنوان کے تحت صرف زرِ اعتباری کی موٹی موٹی قسمیں بیان کرنی ہیں، ان اقسام کی مختلف اَقسام اور اَحکام اور دیگر مختلف مالی دستاویزات کی تفصیل بابِ ہشتم میں اِن شاء اللہ تعالیٰ آئے گی۔

نوٹ

یاد رکھنا چاہئے کہ بہت سارے مصنّفین نے کرنسی نوٹ کو بھی زرِ اعتباری کی اَقسام میں ذِکر کیا ہے، لیکن کرنسی نوٹ کی حیثیت اور تفصیلات گزشتہ ابواب میں ذِکر ہوچکی ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کرنسی نوٹ بحالاتِ موجودہ بذاتِ خود ''ثمن'' ہے، لہٰذا قانونی اور شرعی لحاظ سے کرنسی نوٹ کی وہ حیثیت نہیں ہوگی جو دیگر آلات مثلاً چیک وغیرہ کی ہے۔

زرِ اعتباری کی اَقسام سے متعلق بطورِ نمونہ چند حوالہ جات ملاحظہ ہوں:-

الجعید فرماتے ہیں:-

تستقسم الاوراق التجارية الى ثلثة انواع:

اولا: الكمبيالة ....

ثانيا: السند ....

ثالثا: الشيك........ (1)

زرِتجاری کی تین قسمیں ہیں: ہنڈی، بانڈ، چیک۔

ڈاکٹر اے، این آگروال کہتے ہیں:-

We shall now discuss the chief forms of credit instruments :
Promissory notes Bank Notes and currency notes , Bill of exchange ...Cheque ..Bank Draft.

اب ہم زرِ اعتباری کی کچھ موٹی قسمیں بیان کرتے ہیں: پرومیسری

(۱) احكام الاوراق النقدية والتجارية للجعيد (ص ۲۲۱)

نوٹ، بنک نوٹ، کرنسی نوٹ، ہنڈی، چیک اور بنک ڈرافٹ۔ (۱)

حسن نجفی کہتے ہیں:۔

وادوات الائتمان هی الاوراق التجارية الممثلة بالسفتجة والسند الاذنی والشيك وهی اوراق قابلة للتحويل وتستخدم فی عمليات الائتمان لآجال قصيرة، اوراق البنكوت، الاوراق المالية وهی الاسهم والسندات۔ (۲)

انہوں نے شیئرز اور مختلف سرٹیفکیٹس کو بھی زرِ اعتباری میں شامل کیا ہے۔

ابراہیم صالح عمر کہتے ہیں:۔

فالنقود الورقية هی نقود ائتمانية لكونها ائتمانا يمنحه من يملك هذه النقود للجهة التی اصدرتها ای انها دين والتزام فی ذمة المصرف المصدرلها۔ (۳)

انہوں نے کرنسی نوٹوں کو بھی زرِ اعتباری میں شمار کیا ہے۔

شیخ مبارک علی کہتے ہیں:۔

آلاتِ اعتبار کی مختلف اقسام کو ذیل میں بیان کیا جاتا ہے: چیک (Cheque) مبادلتی بل یا مبادلتی ہنڈی (Bill of Exchange) اقرارنامہ (Promissory Notes) مطالباتی بنک ڈرافٹ (Bank Draft)۔ (۴)

---

(۱) Introduction to Economics principles P: 352

(۲) القاموس الاقتصادی، النجفی (حسن النجفی) بغداد، مديرية مطبعة الادارة المحلية ۱۹۷۷م (ص ۸۸)

(۳) النقود الائتمانية، العمر (ابراهيم بن صالح العمر) بيروت، دارالعاصمة ۱۴۱۴ھ،

(۴) تعارف زر و بنکاری، شیخ مبارک علی، ریسرچ سکالر اوسلو یونیورسٹی ناروے، رہبر پبلشرز کراچی طبع اوّل ۱۹۹۱ء (ص ۲۶۴)۔

زَرِ اِعتباری کا اِرتقاء

اس میں شک نہیں کہ ہنڈی، چیک وغیرہ کا اِرتقاء بینکنگ کے اِرتقاء کے ساتھ ہی ہوا ہے، اور ہو رہا ہے، اس سلسلے میں کچھ مختصر جائزہ ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے:-

بعض ماہرینِ اِقتصاد کا خیال ہے کہ ہنڈی بصورتِ موجودہ قرونِ وسطیٰ میں متعارف ہوئی ہے، ان میں بعض نے اس کی تحدید بھی کی ہے کہ ہنڈی اٹھارویں صدی عیسوی میں متعارف ہوئی ہے، اور اس کی ابتداء اس طرح ہوئی کہ یہ عقدِ صَرف کے لئے بطورِ آلہ استعمال ہوتی تھی، یعنی ایک ملک کے زَر کے دُوسرے ملک کے زَر کے تبادلے میں ہنڈی کا طریقۂ کار بطورِ آلہ استعمال ہوتا تھا۔

چیک اُنیسویں صدی کی نصف میں متعارف ہوا ہے، اور اس کے متعارف ہونے کا منشاء کمرشل بنکوں کا وجود میں آنا ہی ہے۔

لیکن اس میں شک نہیں کہ زَرِ اِعتباری کی جڑیں بہت پُرانی ہیں، چنانچہ دیکھئے فقہائے کرام نے ''سفتجہ'' (جس کا تفصیلی تذکرہ گزشتہ ابواب میں ہو چکا ہے) اپنی کتابوں میں ذِکر کیا ہے، اسی طرح ''حوالہ'' فقہ کی ہر کتاب میں مذکور ہے، اور اس کے بڑے تفصیلی اَحکام کتبِ فقہ میں مذکور ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یورپی تعامل کی اصل یہی چیزیں ہیں۔

چنانچہ بعض مستشرقین نے اس کی تصریح بھی کی ہے، جوزیف شاخت، ڈاکٹر ہوفلین، اور روبسون سے وضاحت کے ساتھ یہ بات منقول ہے۔

جوزیف کے کلام میں ہے کہ Chaqae یہ فرانسیسی لفظ ہے جو ''حوالہ'' کی بگڑی ہوئی شکل ہے، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ چیک ''صک'' کی بگڑی ہوئی شکل ہو۔

روبسون کہتے ہیں کہ اہلِ عرب کو تجارت کے میدان میں فضیلت وسبقت حاصل ہے، اہلِ عرب نے تجارت کو دفتری شکل دی، کفالہ کی وضاحت کی، فقراء کے لئے بیت

المال قائم کیا، ''سفتجہ'' کو رواج دیا۔[1]

نیز یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ شروع زمانے میں بلکہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کے زمانے میں ''صکوک'' موجود تھے، صحابہ کرامؓ نے ان صکوک کے لین دین پر نکیر بھی فرمائی، کیونکہ یہ صکوک طعام کے ہوتے تھے، اور طعام کی بیع (خرید و فروخت) قبضے سے قبل ناجائز ہے۔

جاء فی الموطاء للامام مالك رحمه الله تعالی:-

وحدثنی عن مالك انه بلغه ان صكوكا خرجت للناس فی زمان مروان بن الحكم من طعام الجار، فتبايع الناس تلك الصكوك بينهم قبل ان يستوفوها فدخل زيد بن ثابت ورجل من اصحاب النبی ﷺ علی مروان بن الحكم فقالا: اتحل الربا يا مروان؟ فقال: اعوذ بالله وماذلك؟ فقال: هذه الصكوك تبايعها الناس ثم باعوها قبل ان يستوفوها فبعث مروان بن الحكم الحرس يتتبعونها ينزعونها من ايدی الناس ويردونها الی اهلها۔

يقول الشيخ الكاندهلوی رحمه الله تعالی تحته:-

صكوك جمع صك وهو الورقة المكتوبة بدين--والمراد ههنا الورقة التی يكتب فيها ولی الامر برزق من الطعام لمستحقيه بان لفلان كذا وكذا من الطعام وغيره۔[2]

مؤطا امام مالک میں ہے: امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:-

(۱) احكام الاوراق النقدية والتجارية للجعيد۔

(۲) اوجز المسالك، الكاندهلوی (شيخ الحديث مولانا محمد زكريا) ملتان، اداره تاليفات اشرفيه (۱۱/۲۰۲)

''مروان بن الحکم کے زمانے میں لوگوں میں طعام کے صکوک ظاہر ہوئے، تو لوگ ان کا معاملہ قبل القبض کرنے لگے، چنانچہ زید بن ثابتؓ اور ایک اور صحابیؓ مروان بن حکم کے پاس تشریف لے آئے، اور کہا کہ آپ رِبا کو جائز قرار دے رہے ہیں؟ مروان بن حکم نے کہا کہ اللہ کی پناہ، یہ کس طرح؟ انہوں نے کہا کہ یہ صکوک ہیں، لوگ ان کی خرید و فروخت قبل القبض کر رہے ہیں، چنانچہ مروان بن حکم نے پہرداروں کو بھیجا کہ صکوک ضبط کریں، اور اصل مالکوں کو واپس کریں۔

اس کے تحت حضرت شیخ الحدیثؒ تحریر فرماتے ہیں:-

''صکوک'' ''صک'' کی جمع ہے، اس سے مراد وہ کاغذ (دستاویز) ہے، جس میں دَین لکھا ہوا ہوتا تھا، ......اور یہاں اس سے مراد وہ دستاویز ہے، جس میں حاکم مستحق افراد کے لئے راشن وغیرہ لکھ کر دیتا تھا کہ فلاں کا اتنا حصہ ہے، اور فلاں کا اتنا حصہ۔''

اس روایت سے یہ بات بالکل واضح اور صاف طور پر معلوم ہوتی ہے کہ زَرِ اِعتباری کا رِواج بہت پُرانا ہے، البتہ اس کی نئی اور ترقی یافتہ شکلیں بعد میں وجود میں آئیں۔

زَرِ اِعتباری اور اس کے وظائف

زَرِ اِعتباری کے بہت سے معاشی اور اِقتصادی فوائد ہیں، اور یہ کئی وظائف ادا کرتا ہے، ذیل میں ہم چند اہم وظائف کا ذِکر کرتے ہیں:-

۱- نقلِ زَر سے اِستغناء:- یعنی زَرِ اِعتباری کا ایک اہم فائدہ یہ ہے کہ اس کی بدولت آدمی کو نقد ایک جگہ سے دُوسری جگہ منتقل کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی، یہ بات معلوم ہے کہ باہمی معاملات کے لئے آدمی کو نقلِ رقم کی ضرورت پڑتی ہے، مثلاً کوئی چیز خریدنی ہو،

یا کسی کا قرضہ ادا کرنا ہو وغیرہ، تو اس کے لئے پیسہ ایک جگہ سے دُوسری جگہ لے جانا پڑتا ہے، زَرِ اِعتباری کی وجہ سے آدمی اس مشقت سے محفوظ رہتا ہے، جس کی وجہ سے چوری وغیرہ کا خوف بھی نہیں رہتا، چنانچہ مبادلاتی بل (Bill of Exchange) اسی مقصد کے لئے ایجاد ہوا ہے، اور یہی وظیفہ چیک بھی ادا کرتا ہے۔

۲- ادائیگی کا آلہ (Instrument of Payment):- زَرِ اِعتباری ادائیگی کا آلہ ہے، اور اس کی وجہ سے ادائیگیوں میں بڑی سہولت ہو جاتی ہے، جس میں چیک سرِ فہرست ہے۔

۳- اِعتماد کا آلہ ہے (Instrument of Credit):- زَرِ اِعتباری کو اِعتباری اس وجہ سے کہتے ہیں کہ اس سے اِعتماد اور اِعتبار پیدا ہوتا ہے، چنانچہ اسی اِعتماد کی بنیاد پر زَرِ اِعتباری کے ذریعے باہمی لین دین ہوتا ہے، ''اِعتماد'' زَرِ اِعتباری کا اہم وظیفہ ہے۔

اب مبادلاتی بلوں اور چیکوں کے الگ الگ فوائد ملاحظہ ہوں:-

چیکوں کے نظام کے فوائد

چیکوں کے ذریعے لین دین کا نظام بہت سے فوائد کا حامل ہے، مثلاً:-

۱- سہل اور کم خرچ:- چیک ادائیگی اور وصولی دونوں کا انتہائی سہل اور کم خرچ ذریعہ ہوتا ہے، چھوٹی سے چھوٹی رقم سے لے کر بڑی سے بڑی رقم کی ادائیگی اور وصولی کاغذ کے ایک حقیر پُرزے کی بدولت بلاخوف وخطر اور کوئی وقت ضائع کئے بغیر عمل میں آجاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ ترقی یافتہ ملکوں میں بڑے بڑے کاروباری اور صنعتی اِدارے نقد رقموں کی بجائے چیکوں کے ذریعے لین دین کو زیادہ محفوظ، سہل اور باکفایت سمجھتے ہوئے انہیں ادائیگیوں اور وصولیوں کے ذریعے کے طور پر بے روک ٹوک قبول کرتے ہیں۔

۲- ادائیگیوں کا محفوظ ذریعہ:- چیک کو ادائیگیوں کے لئے محفوظ ترین ذریعے کے طور پر بھی بخوبی استعمال کیا جاتا ہے، کاروباری اِدارے اور تاجر لوگ باہمی ادائیگیوں

کے لئے عموماً کراس چیک جاری کرتے ہیں، ایسے چیک چونکہ جس شخص یا اِدارے کے نام جاری کئے جائیں، وہ صرف ان کے کھاتوں میں جمع ہونے کے بعد ہی قابلِ وصول ہوتے ہیں، اس لئے ان کے چوری یا ضائع ہوجانے کے باوجود ان میں مندرجہ رقم کے ضائع ہونے خطرہ نہیں ہوتا، اس کے علاوہ ادائیگیوں کی رسید کا قانونی تقاضا بھی پورا کرتے ہیں۔

۳-با کفایت عمل پیرائی:- چیکوں کے استعمال سے نقد زر کا استعمال کم ہوجاتا ہے، اس سے نقد زر کے لین دین کی بچت ہوجاتی ہے، بڑی بڑی ادائیگیوں اور وصولیوں کا تصفیہ کھاتوں میں اندراج سے ہوجاتا ہے، اور اس عمل میں نقد زر کے باہمی لین دین اس کے گننے، اِدھر اُدھر لے جانے اور پھر اس کی حفاظت کرنے جیسے اِقدامات کی ضرورت نہیں پڑتی، اس طرح چیک ادائیگیوں اور وصولیوں کا اِنتہائی با کفایت عمل ثابت ہوتا ہے، جس کی بدولت کاروباری سرگرمیوں کو خوب پھلنے پھولنے کے زیادہ سے زیادہ مواقع حاصل ہوجاتے ہیں۔

مبادلاتی بلوں (Bill of Exchange) کے فوائد

مبادلاتی بل اِعتبار کے کاروبار کے لین دین میں متعدّد فوائد انجام دیتا ہے، مثلاً:-

۱-بطور وسیلہ مبادلہ:- یہ بل ملکی اور بین الاقوامی تجارت میں بطور وسیلہ مبادلہ (Medium of Exchange) کے فوائد کا حامل ہوتا ہے، اور تجارتی لین دین میں ادائیگی کے لئے مؤثر اور اہم ذریعۂ ادائیگی تصوّر کیا جاتا ہے۔

۲-فریقین کے لئے فائدے کا باعث:- مبادلاتی بل کی صورت میں ایک طرف اُدھار پر مال فروخت کرنے والے فریق کو اپنی رقم کی عدم وصولی کا خطرہ کم سے کم رہ جاتا ہے، تو دُوسری طرف مال کے خریدار کو اس کی بدولت یہ سہولت حاصل ہوجاتی ہے کہ وہ رقم ادا کئے بغیر مطلوبہ مال خرید سکتا ہے، اور بل کی ادائیگی اس کی مدت ختم ہونے پر کرسکتا ہے، اس وقت تک اشیاء فروخت ہوچکی ہوتی ہیں، اس طرح مبادلاتی بل فروخت کار اور

خریدار کے درمیان اُدھار کاروباری لین دین میں ایک اہم وسیلۂ ادائیگی بن کر دونوں فریقین کو فائدہ پہنچاتا ہے۔

۳- ادائیگیوں کا محفوظ ذریعہ:- مبادلاتی بل ادائیگی کے ایک محفوظ ذریعے کے فرائض بھی بخوبی انجام دیتا ہے، کیونکہ عدمِ ادائیگی کی صورت میں بل کا حامل شخص عدالتی چارہ جوئی کے ذریعے بآسانی بل کی رقم وصول کرسکتا ہے۔

۴- بل پر کٹوتی کا فائدہ:- مبادلاتی بل مدّت پوری ہونے سے پہلے بھی کیش ہوسکتا ہے، جس کے لئے اسے بنک میں کٹوتی کے لئے پیش کیا جاسکتا ہے، کٹوتی کی صورت میں بنک بل کی بقیہ مدّت کا سود مقررہ شرح سے کاٹ کر باقی نقد رقم ادا کردیتا ہے۔

زَرِ اِعتباری کے معتبر ہونے کی شرطیں

اہلِ قانون کے نزدیک ''زَرِ اِعتباری'' کے معتبر ہونے کی کچھ شرطیں ہیں، جن کے بغیر زَرِ اِعتبار زَر ہی نہیں، اور قانوناً اس کے ساتھ زَر سا معاملہ نہیں کیا جاتا، ذیل میں ہم ان شرطوں کا خلاصہ بیان کرتے ہیں:-

۱- باہمی رضامندی:- اس شرط کا پایا جانا مرتب (Drawer) اور مرتب الیہ (Drawee) دونوں میں ضروری ہے، مرتب کی طرف سے اس پر دستخط، اور مرتب الیہ کا اس کو وصول کرنا ہی ان دونوں کی رضامندی اور خوشی کی علامت ہے۔

۲- سبب:- یعنی جس کی وجہ سے یہ دستاویز یا کاغذ تیار کیا جاتا ہے۔ جس کو ''باعث'' اور ''داعی'' بھی کہتے ہیں۔ لہٰذا سبب سے مراد باعثِ تحریر ہے۔

۳- محل:- جس کی بدولت زَرِ اِعتباری زَر ہو، اور وہ نقد ہی ہے، یعنی زَرِ اِعتباری کا محل ''نقد'' ہے، چنانچہ سامان وغیرہ پر مشتمل کاغذ زَرِ اِعتباری نہیں ہوسکتا۔

۴- اہلیت:- اہلیت کا پایا جانا ایک ایسی شرط ہے جس کا پایا جانا ہر چیز کے لئے ضروری ہے، اہلیت کے بغیر کوئی چیز قانوناً و شرعاً معتبر نہیں، بعض اہلِ قانون نے اہلیت کے

لئے عمر کی قید بھی لگائی ہے، یعنی اکیس سال، اکیس سال سے کم عمر والا شخص زرِ اعتباری کے ساتھ لین دین نہیں کرسکتا اِلّا یہ کہ محکمے کی طرف سے اس کو اس کی اجازت حاصل ہو۔ جیسا کہ ستر بن ثواب الجعید اپنی کتاب میں تحریر کرتے ہیں:-

واھل القانون یحددون سنا معینة للاھلیة وھی احدی وعشرین سنة۔

اہلِ قانون اہلیت کے لئے عمر کی حد بندی کرتے ہیں، اور وہ اکیس سال ہے۔[1]

۵- مرتبُ (Drawer) کے دستخط:- زرِ اعتباری پر مرتب کے دستخط ضروری ہیں۔

۶- مرتب الیہ (Drawee):- وہ شخص جس کے نام حکم نامہ لکھا جاتا ہے، اس کا نام دستاویز پر لکھنا ضروری ہے۔

۷- وصول کنندہ (Payee):- حکم نامہ پر وصول کنندہ کا نام کا ہونا بھی ضروری ہے۔

۸- جاری کرنے کی تاریخ اور جگہ کا نام لکھنا ضروری ہے۔

۹- ادائیگی کی تاریخ اور جگہ کا نام لکھنا بھی ضروری ہے۔

۱۰- رقم کا اِندراج اور مقدار کی تعیین بھی ضروری ہے۔

۱۱- ''مالیت وصول شدہ'' یا ''برائے مالیت وصول شدہ'' کے الفاظ کا اِندراج بھی ضروری ہے۔

یہ یاد رکھنا چاہئے کہ عام طور پر مبادلاتی بل (ہنڈی) اور چیک کے تین فریق ہوتے ہیں:-

---

(۱) احکام الاوراق النقدیة والتجاریة الجعید (ستر بن ثواب) السعودیة، الطائف، مکتبة الصدیق، طبع اول ۱۹۹۳ء (ص ۲۴۹)۔

الف:-مرتب(Drawer)

ب:-مرتب الیہ(Drawee)

ج:-وصول کنندہ(Payee)

اور بانڈز کے عام طور پر دوفریق ہوتے ہیں: مرتب اور مرتب الیہ۔

اسی وجہ سے مبادلاتی بل (ہنڈی) اور چیک کو عربی میں "ثلاثیۃ الاطراف" اور بانڈز کو "ذوطرفین" کہا جاتا ہے۔[1]

زَرِ اِعتباری میں لین دین کے طریقے

زَرِ اِعتباری میں لین دین کا اہم طریقہ "تظہیر" (Endorsement) ہے، تظہیر سے مراد قابلِ منتقلی آلاتِ اِعتبار یعنی چیکوں، وعدے ناموں اور مبادلاتی بلوں وغیرہ کی رقم کی وصولی کے لئے کسی دُوسرے شخص کو اِختیار دینا ہے، آلاتِ اِعتبار خصوصاً وعدے ناموں اور مبادلاتی بلوں کی ادائیگی کے لئے مدت دی ہوئی ہوتی ہے جو ملکی آلاتِ اِعتبار میں کم سے کم ایک ماہ اور زیادہ سے زیادہ تین ماہ اور غیر ملکی بلوں کی صورت میں چھ ماہ تک ہوتی ہے، اس مدّت کے دوران آلاتِ اِعتبار ایک دُوسرے اور دُوسرے سے تیسرے شخص کو منتقل ہوتے رہتے ہیں، تاہم اس کے لئے تحریری تظہیر ضروری ہوتی ہے، اور یہ اسی صورت میں دُرست قرار دی جاسکتی ہے جبکہ متعلقہ شخص اس کا مجاز ہو، اور اس میں وہ ساری شرائط پائی جاتی ہوں، جن کا تذکرہ گزشتہ صفحات میں آچکا ہے۔

تظہیر (Endorsement) کے قانونی تقاضے

تظہیر کو قانونی طور پر مندرجہ ذیل تقاضوں کو پورا کرنا چاہئے:-

ا-تظہیر کو مبادلاتی بل پر درج کیا جانا چاہئے، اور اس مقصد کے لئے سپرد کرنے

(۱) احکام الاوراق النقدیۃ والتجاریۃ الجعید (ستر بن ثواب) السعودیۃ، الطائف، مکتبۃ الصدیق، طبع اول ۱۹۹۳ء(ص ۲۵۰)۔

والے کے دستخط بھی کافی سمجھے جاتے ہیں۔

۲- تظہیر کے لئے ضروری ہے کہ وہ بل کو مکمل طور پر سپرد کئے جانے کے لئے ہونی چاہئے، یعنی بل کو جزوی طور پر کسی کے سپرد نہیں کیا جاسکتا، اور نہ ہی ایک بل کو ایک ہی وقت میں مختلف اشخاص کے سپرد کیا جاسکتا ہے۔

۳- اگر بل کی ادائیگی دو یا دو سے زیادہ افراد کے حکم سے مشروط ہو، تو ایسی صورت میں فرداً فرداً ان تمام مجاز کی طرف سے ادا کی جانی چاہئے۔

۴- جب بل حسبِ حکم ادا کیا جانے والا ہو، اور اس میں سپرد کنندہ کا نام غلطی سے لکھا گیا ہو، تو ایسے شخص کو بل کسی دُوسرے شخص کو سپرد کرتے وقت وہی نام لکھنا چاہئے جو بل پر لکھا گیا ہو، تاہم اگر وہ چاہے تو سپردگی (تظہیر) کے ساتھ اپنا صحیح نام لکھ دے، وہ بل میں لکھے گئے نام کی تصدیق بھی کرنے کا مجاز ہوتا ہے۔

۵- اگر بل کئی بار تظہیر کے ذریعے منتقل کیا جاتا رہا ہو، تو اس صورت میں سپردگی کی اہمیت اور اصلیت اس کی ترتیب کے ذریعے ظاہر کی جاتی ہے، مثلاً ایک بل یکم جنوری کو انور کے نام سپرد کیا گیا، اور وہی بل تیس جنوری کو اکبر کے نام اور اکبر نے وہی بل تیس جنوری کو حامد کے نام کر دیا، تو ایسی صورت میں انور، اکبر اور حامد کا حق بل پر اسی تریب سے قائم کیا جائے گا۔

تظہیر (Endorsement) کی اَقسام

تظہیر کو مندرجہ ذیل سات اَقسام میں تقسیم کیا گیا ہے:-

۱- تظہیرِ محض (Blank Endorsement):- محض تظہیر بل کی پشت پر مجاز سپردکار کے محض دستخطوں پر مشتمل ہوتی ہے، اس قسم کی تظہیر اگر کسی بل کے پابند (Payee) یا سپرد کنندہ (Endorsee) کی طرف سے کی گئی ہو، تو پھر وہ بل ایک عام حاملِ بل کی طرح قابلِ ادا ہوگا یعنی اسے جو شخص بھی پیش کرے گا، وہ اسے ادا کر دیا جائے گا۔

۲- خصوصی تظہیر (Special Endorsement):- خصوصی تظہیر یا سپردگی وہ ہے جو اس شخص کے نام مخصوص کردے جسے یا جس کے حکم سے بل قابلِ ادا ہو، اس قسم کی تظہیر میں سپرد کار بل کی پشت پر اپنے دستخطوں کے ساتھ اس شخص کا نام بھی درج کردیتا ہے، جسے یا جس کے حکم سے وہ بل قابلِ ادا ہوتا ہے۔

۳- مشروط تظہیر (Conditional Endorsement):- مشروط تظہیر کی صورت میں بل کی ادائیگی کو کسی شرط کے پورا ہونے سے مشروط کردیا جاتا ہے، مثلاً اکرم کو اس بل کی رقم بل آف لینڈنگ (Bill of Landing) کی حوالگی پر ادا کردی جائے، تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اکرم مذکورہ بل آف لینڈنگ کی حوالگی کے بعد ہی بل کی رقم وصول کرنے کا حقدار ہوگا۔

۴- جزوی تظہیر (Partial Endorsement):- جزوی تظہیر کی صورت میں بل کی کل رقم کا کچھ حصہ کسی اور شخص کو اَدا کرنے لئے کہا جاتا ہے مثلاً ایک ہزار روپے کے اس بل میں سے سات سو روپے اکرم کو اَدا کردیئے جائیں، جزوی تظہیر کی صورت میں اکرم اس بل میں سات سو روپے کی رقم وصول کرنے کا مجاز تو بن جاتا ہے، مگر بل اس کے نام منتقل نہیں ہوسکتا ہے۔

۵- پابند تظہیر (Restrictive Endorsement):- پابند تظہیر کی صورت میں بل کی ادائیگی کسی خاص شخص کے لئے مخصوص کردی جاتی ہے مثلاً اس بل کی رقم صرف اکرم کو اَدا کردی جائے، یا اس بل کی رقم صرف اس کھاتہ نمبر میں جمع کی جائے وغیرہ۔

۶- منفی تظہیر (Negative Endorsement):- جب سپرد کار اپنے دستخطوں کے ساتھ ان الفاظ کا اضافہ کردے "بلا رُجوع یا عدم ادائیگی کی ذمہ داری میری نہیں ہوگی" (Sans Recourse or Without Recourse to Me) تو اس حوالگی کے تحت منتقل کرنے والے پر زیادہ ذمہ داری عائد نہیں ہوتی، اور اگر وہ بلا اِخراجات (Sans Frains) یا (No Charges) کے الفاظ لکھ دے، تو اس سے وہ دیگر قسم کے اِخراجات کی

ذمہ داری سے مستثنیٰ ہو جائے گا۔

۷۔ مجاز تظہیر (Facultative Endorsement):۔ مجاز سپردگی وہ ہے جس میں سپرد کار اپنے کچھ یا سارے حقوق سے دستبردار ہو جائے، مثلاً کسی شخص کے نام ایک بل کی عدمِ ادائیگی کے نوٹس کو واپس لے لینا مجاز سپردگی ہوگی۔



باب ہشتم

مالیاتی دستاویزات

چونکہ مالیاتی دستاویزات کے شرعی حکم بیان کرنے میں ''بیع الدین'' اور ''حوالہ'' کی بحث بکثرت آئے گی، اور مالی دستاویزات میں سے اکثر کا شرعی حکم اسی بحث پر موقوف ہے، اس لئے ضروری ہے کہ مالی دستاویزات پر گفتگو کرنے سے پہلے ''بیع الدین'' اور ''حوالہ'' سے بحث کی جائے، اس کی مختلف صورتیں بیان کی جائیں، اور ہر صورت کا شرعی حکم بیان کیا جائے۔

آج کل کے سرمایہ دارانہ نظام (Capitalism) میں ''بیع الدین'' کا لین دین بکثرت ہونے لگا ہے، اور بہت سارے مالی دستاویزات میں اس کا رِواج ہونے لگا ہے، کبھی قیمتِ اسمیہ (Face Value) سے کم پر مالی دستاویز بیچا جاتا ہے، اور کبھی قیمتِ اسمیہ سے زیادہ پر۔

''بیع الدین'' ترکیبِ اِضافی ہے، جو دو اَجزا پر مشتمل ہے، یعنی بیع اور دَین، بیع کے معنی فروخت (Sale) کرنے کے ہیں، اور دَین کے معنی اُدھار (Debt) کے ہیں، تو اس مرکب کے معنی ہوئے اُدھار کو فروخت کرنا۔

بیع الدین کی بہت ساری صورتیں ہیں، جو تین قسم میں منحصر کی گئی ہیں:-

۱-بیع الدَّین بالدَّین

۲-بیع الدَّین ممَّن علیه الدَّین

۳- بیع الدَّین مِن غیر مَن علیه الدَّین

۱- بیع الدَّین بالدَّین

اس کو "بیع الکالی بالکالی" بھی کہتے ہیں، "کالی" بھی اُدھار کو کہتے ہیں۔ اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں کہ معاملہ خود مدیون کے ساتھ ہو، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ معاملہ کسی تیسرے شخص کے ساتھ ہو۔ مثلاً زید عمرو سے کہتا ہے کہ میں نے تم سے ایک ٹن گندم دو ہزار روپے میں خریدی، لیکن میں گندم پر اور تم دو ہزار روپے پر ایک ماہ بعد قبضہ کریں گے، اس مثال میں دو ہزار روپے زید کے ذمہ دَین ہے، اور ایک ٹن گندم عمرو کے ذمہ دَین ہے، یہ بیع الدین بالدین ہے، اس لئے کہ دونوں طرف معاملہ اُدھار پر ہوا۔

یا مثلاً زید نے بیعِ سلم کے طریقے سے ایک ٹن گندم بیچی، لیکن جب وقتِ مقرّرہ آ گیا، تو وہ ایک ٹن گندم دینے سے عاجز رہا، تو اس نے خریدنے والے سے کہا کہ میرے ذمہ جو تمہارا ایک ٹن گندم ہے، وہ مجھے تین ہزار روپے میں بیچو، لیکن میں تین ہزار روپے ایک ماہ بعد اَدا کروں گا، یہ بیع الدین بالدین ہے، جیسا کہ ظاہر ہے۔

یہ قسم جمہور علمائے کرام کے نزدیک ناجائز ہے، اور اس میں ان کی دلیل مشہور حدیث ہے جو درج ذیل ہے:-

> ان النبی صلی الله علیه وسلم نهی عن بیع الکالی بالکالی۔
>
> رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُدھار بمقابلہ اُدھار فروخت کرنے سے منع فرمایا ہے۔[1]

---

(۱) هذا الحدیث مروی عن عبدالله بن عمر رضی الله عنهما فیما اخرجه الحاکم فی المستدرك ۲:۶۵ رقم الحدیث:۲۳۴۲ طبع بیروت ۱۴۱۱هـ والدارقطنی فی سننه ۳:۷۱ رقم الحدیث:۲۶۹ من کتاب البیوع، والبیهقی فی سننه الکبریٰ ۵:۲۹۰ باب ما جاء فی النهی عن بیع الدین بالدین، وعبدالرزاق فی مصنّفه ۸:۹۰ رقم الحدیث:۱۴۴۴ وغیره۔

اس حدیث شریف پر بعض علماء نے کچھ کلام کیا ہے، لیکن اُصولِ حدیث کے پیشِ نظر یہ حدیث قابلِ استدلال ہے، اور اُمت نے اس حدیث کو قبول کیا ہے، اور علماء نے اس حدیث سے اس باب میں اِستدلال کیا ہے، اس کو "تلقی بالقبول" کہتے ہیں، اس سے حدیث کے ضعف کی تلافی ہوجاتی ہے، چنانچہ علامہ سیوطی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:-

وكذا ما اعتضد بتلقي العلماء له بالقبول قال بعضهم: يحكم للحديث بالصِّحة إذا تلقاه الناس بالقبول وإن لم يكن له اسناد صحيح، قال ابن عبدالبر في الإستذكار: لما حكى عن الترمذى ان البخارى صحح حديث البحر: هو الطهور ماءه، وأهل الحديث لا يصححون مثل اسناده، لكن الحديث عندى صحيح لأن العلماء تلقوه بالقبول وقال في التمهيد: روى عن جابر عن النبي صلى الله عليه وسلم: الدينار أربعة وعشرون قيراطًا، قال: وفي قول جماعة العلماء وإجماع الناس علىٰ معناه غنى عن الاسناد فيه۔[1]

علامہ سیوطی رحمہ اللہ کے اس کلام کا حاصل یہی نکلتا ہے کہ اگر کوئی حدیث ضعیف ہو، لیکن اس کو تلقی بالقبول حاصل ہوجائے تو اس حدیث کا ضعف ختم ہوجاتا ہے۔

بہرحال جمہور فقہائے کرام کا اس بات پر اِتفاق ہے کہ "بيع الكالى بالكالئ" ناجائز ہے، بلکہ بعض علمائے کرام نے تو اس پر اجماع نقل کیا ہے۔

۲-بيع الدَّين ممَّن عليه الدَّين

یعنی جس پر دَین ہو، اسی کو دَین بیچا جائے، مثلاً زید کے ذمہ عمرو کا دَین ہے، تو زید مدیون ہے اور عمرو دائن ہے، تو زید عمرو سے کہتا ہے کہ تمہارا جو قرضہ میرے ذمہ ہے، اس

(۱) تدريب الراوى للسيوطى ص:۲۵، طبع المدينة المنوَّرة۔

کے بدلے میں مجھ سے یہ کپڑا خرید و، یا عمرو کہے کہ جو قرضہ میرا تمہارے ذمہ ہے، اس کو میں تمہیں اس کپڑے کے بدلے میں بیچ دیتا ہوں، یہ صورت جمہور فقہائے کرام کے نزدیک جائز ہے۔

علامہ کاسانی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:-

ويجوز بيعه (يعني الدّين) ممّن عليه لأن المانع هو العجز عن التسليم ولا حاجة إلى التسليم هنا ونظيره: بيع المغصوب انه يصح من الغاصب ولا يصح من غيره إذا كان الغاصب منكرًا ولا بيّنة للمالك۔

جس پر دَین ہے، اس پر دَین فروخت کرنا جائز ہے، کیونکہ مانع عجز عن التسلیم ہے، اور یہاں تسلیم کی ضرورت ہی نہیں الخ۔ (۱)

لیکن یادرکھنا چاہئے کہ جتنی شرطیں عام بیع کے معتبر ہونے کے لئے ضروری ہے، وہ تمام شرطوں کا متحقق ہونا یہاں بھی ضروری ہے، مثلاً عام بیع میں یہ شرط ہے کہ مبیع بائع کے قبضے میں ہو، یہ شرط بیع الدین کی مذکورہ صورت میں ہونا بھی ضروری ہے، اور اسی وجہ سے مسلم فیہ (مبیع) کو مسلم الیہ کو قبضے سے پہلے فروخت کرنا جائز نہیں، جیسا کہ علامہ کاسانیؒ نے اس کی تصریح فرمائی ہے:-

ولا يجوز بيع المسلم فيه لأن المسلم فيه مبيع ولا يجوز المبيع قبل القبض۔

مسلم فیہ کو فروخت کرنا جائز نہیں، کیونکہ مسلم فیہ مبیع ہے، اور مبیع کو قبضے سے پہلے فروخت کرنا جائز نہیں۔ (۲)

اسی طرح اگر دَین اور اس کا عوض دونوں رِبوی ہوں، تو اس کے جواز کے لئے

(۱) بدائع الصنائع (۱۴۸/۵)۔

(۲) ایضًا۔

رِبویات کی شرائط پوری کرنا ضروری ہے، اسی وجہ سے اکثر فقہائے کرام نے منع فرمایا ہے کہ دَینِ مؤجل کو معجّل کیا جائے بشرطیکہ بعض دَین کو معاف کیا جائے، جسے "ضع وتعجل" کا مسئلہ کہتے ہیں، اور انگریزی میں اس کو "Rebat" کہتے ہیں، جس پر علمائے کرام نے متعلقہ مقام پر مفصل بحث کی ہے۔

اسی طرح اگر مدیون نے اپنا دَین دائن سے دَین کی مقدار سے زائد ثمنِ مؤجل پر خریدا، تو یہ بھی عین رِبا ہے، اور یہ "اتقضی أم تربی" کے اندر داخل ہے، جس کی حرمت قرآن وسنت میں موجود ہے، مثلاً:-

زید کے عمرو کے ذمہ ایک ہزار روپے دَین واجب الاداء ہے، اب عمرو زید سے یہ ایک ہزار روپے ڈیڑھ ہزار روپے میں ایک ماہ کی تاجیل پر خرید رہا ہے، تو اس کا رِبا ہونا بالکل ظاہر ہے۔

۳- بیع الدَّین مِن غیر مَن علیه الدَّین

یہ بیع الدین کی تیسری صورت ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ دائن اپنا دَین کسی تیسرے شخص (Third Person) کو فروخت کرتا ہے، اس کے حکم میں اِختلاف ہے۔

حضراتِ حنفیہ اور حنابلہ کا موقف یہ ہے کہ یہ صورت ناجائز ہے، چنانچہ اِمام محمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں:-

> لا ینبغی للرجل إذا کان له دین أن یبیعه حتّٰی یستوفیه لأنه غرر فلا یدری أیخرج أم لا یخرج۔
>
> جب تک کوئی شخص اپنا دَین وصول نہ کرے، اس کے لئے اس کو فروخت کرنا جائز نہیں، کیونکہ اس میں غرر ہے، کچھ پتہ نہیں کہ وہ دَین وصول ہو یا نہ ہو۔[1]

(۱) الموطا للإمام مالك رحمه الله، باب الرجل یکون له العطایا أو الدَّین علی الرجل فیبیعه (ص:۳۵۴)۔

علامہ کاسانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:-

ولا ينعقد بيع الدَّين من غير من عليه الدَّين لأن الدَّين إما أن يكون عبارة عن مال حكمي في الذمه وإما أن يكون عبارة عن فعل تمليك المال وتسليمه وكل ذلك غير مقدور التسليم في حق البائع ولو شرط التسليم على المديون لا يصح أيضًا لأنه شرط التسليم على غير البائع فيكون شرطًا فاسدًا فيفسد البيع۔

غیر مدیون کے ساتھ بیع الدین کا عقد منعقد نہیں ہوتا، کیونکہ یا تو دَین مالِ حکمی فی الذمہ سے عبارت ہے، اور یا تملیک المال کے فعل سے عبارت ہے، اور دونوں صورتیں بائع کے حق میں غیر مقدور التسلیم ہیں، اور اگر مدیون پر تسلیم کو شرط قرار دیا جائے، تو یہ بھی دُرست نہیں، کیونکہ یہ شرط غیر بائع کی طرف متوجہ ہے، تو یہ شرط فاسد ہوگی، جس سے بیع فاسد ہو جائے گی۔ (۱)

قاضی ابو یعلیٰ حنبلی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:-

واختلف في بيع الدَّين ممَّن هو عليه فنقل ابو طالب المنع ونقل منه جواز ذلك ولا تختلف الرواية انه لا يجوز بيعه من غير من هو في ذمه الخ۔

دَین کو فروخت کرنا ممن علیہ الدین میں اختلاف ہے، چنانچہ ابوطالب نے منع نقل فرمایا ہے، لیکن جواز بھی منقول ہے، اور دَین کو ممن لیس علیہ الدین کے ناجائز ہونے میں کوئی اختلافِ روایت نہیں۔ (۲)

(۱) بدائع الصنائع (۱۴۸/۵)۔

(۲) كتاب الروايتين والوجهين لأبي يعلى (۳۵۷/۱)۔

علامہ مرداوی حنبلی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:-

لا يجوز بيع الدَّين المستقر لغير من هو في ذمته وهو الصحيح من المذهب وعليه الأصحاب الخ۔

دَین کو فروخت کرنا ممن لیس علیہ الدین کو جائز نہیں، یہی صحیح مذہب ہے، اور اسی کو اصحاب نے اِختیار کیا ہے۔[1]

اہم نوٹ

یہ یاد رکھنا چاہئے کہ بیع الدین ممن لیس علیہ الدین بیع کے طریقے سے ممنوع ہے، اگر یہ حوالے کے طریقے سے ہو، تو سب کے نزدیک جائز ہے، بیع اور حوالہ میں یہ فرق ہے کہ حوالہ میں اگر محال علیہ مفلس ہوجائے، یا اِنکار کرے، اور گواہ موجود نہ ہوں، تو اس صورت میں محتال (اصل دائن) اپنا دَین وصول کرنے کے لئے محیل (اصل مدیون) کی طرف رُجوع کرسکتا ہے، لیکن بیع کی صورتِ حال یہ ہے کہ جب مدیون اپنا دَین فروخت کرے، تو گویا کہ دَین خریدنے والا تمام حقوق میں مدیون کا قائم مقام بن جاتا ہے، لہٰذا جب مدیون مفلس ہوجائے یا دَین کا اِنکار کرے، تو اس کے لئے جائز نہیں کہ دَین فروخت کرنے والے کی طرف رُجوع کرے، یہیں سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ بیع کی صورت میں غرر ہے، اور حوالہ کی صورت میں غرر نہیں ہے، اس لئے کہ دائن محیل کی طرف رُجوع کرسکتا ہے، کما مرَّ۔

بہرحال حنفیہ اور حنابلہ کے نزدیک بیع الدین ممن لیس علیہ الدین ناجائز ہے، جہاں تک مالکی اور شافعی مذہب کا تعلق ہے تو وہ درج ذیل ہے:-

مذہبِ مالکی

ان کے نزدیک بھی اصل یہی ہے کہ یہ صورت ناجائز ہے، لیکن چند شرائط کے

(۱) الانصاف للمرداوی (۱۱۲/۵)، وراجع أيضًا الفروع لابن مفلح (۱۸۵/۴)۔

ساتھ انہوں نے اس کی اجازت دی ہے، جن کا خلاصہ درج ذیل ہے:-

۱- مدیون حاضر ہو۔

۲- مدیون دَین کا اِقرار کرتا ہو۔

۳- دَین اس قبیل سے ہو کہ اس کی بیع قبل القبض جائز ہو، لہٰذا دَین اگر طعام کی شکل میں ہو، تو اس کی بیع جائز نہیں، کیونکہ طعام کی بیع قبل القبض جائز نہیں۔

۴- دَین کا تبادلہ غیر جنس کے ساتھ ہو۔

۵- یہ معاملہ سونے وچاندی کا نہ ہو۔

۶- مدیون اور دَین خریدنے والے کے درمیان عداوت نہ ہو۔

اس سلسلے میں علامہ زرقانی مالکیؒ کی عبارت ملاحظہ ہو:-

ومنع بيع الدَّين على الغائب ولو قربت غيبته أو ثبت ببيّنة وعلم ملاءه بخلاف الحوالة عليه فإنها جائزة ...... ومنع بيع دَين على حاضر ولو ببيّنة إلّا أن يقرّ والدَّين مما يباع قبل قبضه وبيع غير جنسه وليس ذهبا بفضة ولا عكسه وليس بين مشتريه ومن عليه عداوة ولا قصد اعناته فلا بد من هذه الخمسة شروط لجواز بيعه زيادة على قوله يقر۔[1]

اس عبارت کا حاصل وہی شرائط ہیں جو اُوپر مذکور ہوئیں۔

مذہبِ شافعی

ان کے ہاں اس سلسلے میں روایات مختلف ہیں، علامہ نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:-

اعلم ان الاستبدال بيع لمن عليه دَين، فاما بيعه لغيره كمن له على انسان مائة فاشترى من آخر عبدًا بتلك

(۱) شرح الزرقانی علیٰ مختصر خلیل (۸۳/۳)۔

المائة فلا يصح على الأظهر لعدم القدرة على التسليم وعلى الثاني يصح بشرط ان يقبض مشترى الدّين ممّن عليه وان يقبض بائع الدّين العوض في المجلس فإن تفرقا قبل قبض احدهما بطل العقد، قلت: الأظهر الصحة۔[1]

وفي شرح المهذب: فاما بيعه لغيره كمن له علىٰ رجل مائة فاشترى من آخر عبدًا بتلك المائة ففي صحته قولان مشهوران أصحهما: لا يصح لعدم القدرة على التسليم والثاني: يصح بشرط ان يقبض مشترى الدّين ممّن هو عليه وان يقبض بائع الدّين العوض في المجلس فإن تفرقا قبل قبض احدهما بطل العقد۔[2]

ان نصوص کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ بیع الدین من غیر المدیون شافعیہ کے ہاں جائز نہیں، البتہ اگر مشتری مجلسِ عقد میں دَین پر قبضہ کرلے، لیکن ظاہر ہے کہ اس شرط کی وجہ سے دَین دَین ہی نہیں رہا، تو حاصل یہی رہا کہ بیع الدین ممن لیس علیہ ان کے ہاں جائز نہیں۔ اسی وجہ سے علامہ نووی رحمہ اللہ تعالیٰ نے منہاج الطالبین میں عدمِ جواز کا قول ہی ذکر کیا ہے، چنانچہ فرمایا:-

وبيع الدَّين لغير من عليه باطل في الأظهر بأن اشترى عبد زيد بمائة له علىٰ عمرو۔[3]

ان عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ اکثر شافعیہ مطلقاً بیع الدین ممن لیس علیہ کو ناجائز کہتے ہیں۔

---

(۱) روضة الطالبين للنووي (۵۱۴/۳)۔

(۲) المجموع شرح المهذب (۳۰۰/۹)۔

(۳) منهاج النووي مع مغني المحتاج (۷۱/۲)۔

خلاصہ

خلاصۂ بحث یہ کہ بیع الدین کی تین صورتیں ہیں، پہلی صورت جمہور علماء کے نزدیک ناجائز ہے، دُوسری صورت جائز ہے، اور تیسری صورت حنفیہ، حنابلہ اور اکثر شافعیہ کے نزدیک ناجائز ہے، البتہ مالکیہ کے نزدیک چند شرائط کے ساتھ یہ صورت جائز ہے، لیکن ان تمام شرائط کو پورا کرنا آسان کام نہیں، اس لئے ظاہر یہی ہے کہ ان کے مذہب کا حاصل بھی عدمِ جواز ہی نکلتا ہے۔ (۱)

حوالہ

دُوسری بحث جس کا تذکرہ مالیاتی دستاویزات میں بکثرت ہوتا ہے، وہ حوالہ کی بحث ہے، لہٰذا حوالہ کی تعریف وحقیقت، چند مخصوص اِصطلاحات، حوالہ کی شرائط اور اَحکام کا خلاصہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

حوالہ کی تعریف

حوالہ لغت میں ''نقل'' کو کہتے ہیں، یعنی منتقل ہونا یا منتقل کرنا، اور اِصطلاحِ شرع میں اس کی تعریف درج ذیل ہے:-

نقل الدَّین من ذمة المحیل إلیٰ ذمة المحتال علیه۔

دَین محیل کے ذمہ سے محتال علیہ کے ذمہ کی طرف منتقل ہوجائے۔ (۲)

یعنی دَین (Debt) محیل کے ذمہ واجب ہوتا ہے، لیکن حوالہ کے بعد اس کے

---

(۱) من أراد أن یطالع هذا البحث الأنیق بالإستیعاب فله أن یراجع کتاب "بحوث فی قضایا فقهیة معاصرة" المجلد الثانی، للشیخ المفتی محمد تقی العثمانی، مکتبه دارالعلوم کراتشی، طبع ربیع الأوّل ۱۴۲۶ من الهجرة النبویة علیٰ صاحبها الصلاة والسلام۔

(۲) الدر المختار، کتاب الحوالة، اور ہندیہ کے الفاظ یہ ہیں: نقل الدین من ذمة إلیٰ ذمة هو الصحیح کذا فی النهر الفائق (۳/۹۵)۔

ذمہ سے محتال علیہ کے ذمہ کی طرف منتقل ہوجاتا ہے، اور محیل کا ذمہ فارغ ہوجاتا ہے، جس کی تفصیل آگے آرہی ہے، اور یہی فرق ہے حوالہ اور کفالہ میں کہ حوالہ میں ''انتقال'' پایا جاتا ہے، اور کفالہ میں ''ضم'' پایا جاتا ہے، یعنی کفالہ میں اصل مدیون کے ساتھ کفیل کا ذمہ بھی مشغول ہوجاتا ہے، اور اصل مدیون بری عن الدین نہیں ہوتا۔

اِصطلاحات

محیل:- اصل مدیون(Debter) کو کہتے ہیں۔

محتال/محال/محتال لہٗ/محال لہٗ:- اصل دائن(Creditor) کو کہتے ہیں۔

محتال علیہ/محال علیہ:- تیسرے شخص(Third Person) کو کہتے ہیں، یعنی جو قرضے کی ادائیگی اپنے ذمہ لے لیتا ہے۔

محال بہ:- دَین(Debt) کو کہتے ہیں۔

توی:- لغت میں ہلاک المال کو کہتے ہیں، اور شریعت میں اس کی دو صورتیں ہیں:-

۱-محال علیہ حوالہ کا اِنکار کرے، اور قسم بھی کھائے کہ میں نے حوالہ قبول نہیں کیا ہے، اور محتال کے پاس شرعی گواہ نہیں ہیں۔

۲-محال علیہ مُفلِس ہونے کی حالت میں مرجائے۔

ان دونوں صورتوں میں اگر دائن اصل مدیون سے اپنے دَین کا مطالبہ نہ کرے، تو اس کا مال ہلاک یعنی ضائع ہوجائے گا، اس کو ''توی'' کہتے ہیں۔

رُکنِ حوالہ

حوالہ کا رُکن صرف ایجاب وقبول ہے، یعنی محیل کی طرف سے ایجاب ہو، اور محال علیہ اور محال دونوں کی طرف سے قبول ہو، جیسا کہ علامہ کاسانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:-

اما رکن الحوالة فهو الإيجاب والقبول، الإيجاب من

المحیل والقبول من المحال علیه والمحال جمیعا الخ۔[1]

شرائطِ حوالہ

حوالہ میں اطرافِ ثلاثہ یعنی محیل، محال لہٗ، اور محال تینوں کا عاقل ہونا، بالغ ہونا، اور تینوں کی رضامندی کا پایا جانا ضروری ہے، لہٰذا اَطرافِ ثلاثہ میں سے کسی بھی طرف کو مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ نیز محال بہ کا دَین ہونا بھی ضروری ہے، لہٰذا اَعیان کا حوالہ دُرست نہیں۔ نیز دَین وغیرہ کا معلوم ہونا ضروری ہے، لہٰذا حوالہ بالمجہول جائز نہیں۔ چنانچہ معاییر شرعیہ میں لکھا ہے:-

یشترط أن یکون کل من الدَّین المحال به والدَّین المحال علیه معلومًا صحیحًا قابلًا للنقل۔[2]

اَقسامِ حوالہ

حوالہ کی درج ذیل چار قسمیں ہیں:-

۱۔ حوالہ مقیدہ، ۲۔ حوالہ مطلقہ، ۳۔ حوالہ حالہ، ۴۔ حوالہ موَجلہ۔

حوالہ مقیدہ:- اس میں محیل کا محتال علیہ کے ذمہ کوئی دَین یا عین واجب ہوتا ہے، اور حوالہ میں یہ شرط لگائی جاتی ہے کہ محتال علیہ اسی میں سے محیل کا دین ادا کرے گا، اس صورت میں محتال علیہ کو دَین کی ادائیگی کی صورت میں محیل کی طرف رُجوع کرنے کی ضرورت نہیں۔

حوالہ مطلقہ:- اس میں محیل کا محتال علیہ کے ذمہ کوئی دَین یا عین واجب الادا نہیں ہوتا، بلکہ مذکورہ بالا شرائط کے مطابق محتال علیہ اپنے مال میں سے محیل کی طرف سے دَین ادا کردیتا ہے، اور پھر محیل کی طرف رُجوع کرلیتا ہے کہ میری رقم دے دو۔

---

(۱) بدائع الصنائع للکاسانی کتاب الحوالة (۱۵/۶)۔

(۲) المعاییر الشرعیة (ص:۱۰۱)۔

حوالہ حالہ:- یہ وہ حوالہ ہے کہ جس میں دَین محتال علیہ کے ذمہ فی الحال واجب ہو، خواہ پہلے سے اس طرح ہو، یا پہلے سے مؤجل ہو، لیکن حوالہ میں اَجل کو ساقط کردیا گیا ہو۔

حوالہ مؤجلہ:- یہ وہ حوالہ ہے کہ جس میں دَین محتال علیہ کے ذمہ مؤجل طریقے سے واجب ہوتا ہے، خواہ پہلے سے اس طرح ہو، یا پہلے سے معجّل ہو، لیکن حوالہ میں اَجل کی قید لگائی گئی ہو۔ (۱)

اَحکامِ حوالہ

۱- حوالہ میں محیل اپنے دَین سے بَری ہو جاتا ہے۔

۲- اس میں محال کو محال علیہ سے دَین کے مطالبے کی ولایت حاصل ہو جاتی ہے۔

۳- اگر محال محال علیہ کا تعاقب شروع کرے، تو محال علیہ کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ محیل کا تعاقب کرے۔

محال علیہ حوالہ سے کس طرح خارج ہوگا؟ اس کی صورتیں

۱- حوالہ فسخ ہو جائے۔

۲- توی کی صورت میں، جس کی تفصیل اصطلاحات کے ذُیل میں گزر گئی۔

۳- محال علیہ دَین کو اَدا کرے۔

۴- محال دَین محال علیہ کو ہبہ کرے۔

۵- محال دَین محال علیہ کو صدقہ کرے۔

۶- محال مر جائے، اور محال علیہ اس کا وارث ہو۔ (۲)

---

(۱) المعايير الشرعية (ص:۱۰۱)۔

(۲) كل ذلك مأخوذ من بدائع الصنائع للعلامة الكاساني كتاب الحوالة، كذا في الكتب العامّة للفقه۔

چیک (Bank Cheque)

بیع الدین اور حوالہ کی بحث کا خلاصہ ذکر کرنے کے بعد اب ہم اللہ تعالیٰ کے نام سے مالیاتی دستاویزات کا مختصر جائزہ لے رہے ہیں، اللہ تعالیٰ ہر مرحلے پر اپنی مدد شاملِ حال رکھے۔

چیک کی تعریف

چیک ایک قسم کا تحریری اور دستخط شدہ حکم نامہ ہوتا ہے جس میں بنک کا کوئی کھاتہ دار سے اس کے کھاتہ سے ایک مخصوص رقم کسی دُوسرے شخص کو اَدا یا منتقل کرنے کی ہدایت کرتا ہے۔[1]

ڈاکٹر محمد عثمان شبیر "چیک" کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں:۔

الشیك مأخوذ من الصك وهو وثيقة بمال أو نحوه والشيك محرر يتضمن أمرًا مكتوبًا يطلب به الساحب من المسحوب عليه (المصرف) ان يدفع بمجرد الإطلاع عليه مبلغًا معيّنًا من النقود لشخص معيّن أو لإذنه أو لحامله۔

چیک صک سے لیا گیا ہے، صک مال وغیرہ کے وثیقے کو کہتے ہیں، اور چیک ایک مکتوب ہے جس میں ایسا حکم لکھا ہوا ہوتا ہے جس سے لکھنے والا بنک سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اس پر مطلع ہونے کے بعد ایک خاص مقدار رقم کی کسی خاص شخص یا اس کے اِذن سے یا حامل (Bearer) کو اَدا کرے۔[2]

---

(۱) تعارف زر و بنکاری (ص:۲۲۳)۔

(۲) المعاملات المالية العصرية في الفقه الإسلامي (شبير) محمد عثمان شبير، اردن، دار النفائس، طبع ثالث ۱۴۱۹ھ۔

ڈاکٹر جعید نے یوں تعریف کی ہے:-

هو امر مكتوب وفقا لأوضاع حددها العرف يطلب به الآمر (الساحب) من المسحوب عليه ويكون بنكا غالبًا ان يدفع بمقتضاه وبمجرد الإطلاع مبلغًا معيّنًا لإذن شخص معيّن أو لحامله۔[1]

اس تعریف کا حاصل بھی وہی ہے جو اُوپر مذکور ہوا۔

آگرہ وال نے یوں چیک کی تعریف کی ہے:-

A cheque is an instrument containing an unconditional order, singed by the depositor, directing his banker to pay on demand a definite sum of money to himself or to the person named therein or the bearer of the cheque.

چیک ایک ایسا آلہ ہے جو غیر مشروط حکم پر مشتمل ہو، اور اس پر ڈپازٹر کے دستخط ہوں، جس میں وہ اپنے بنکر کو ہدایت دیتا ہے کہ مطالبے پر ایک خاص رقم اس کو، یا جس کا اس میں نام ہو، یا حامل ہو ادا کرے۔[2]

چیک کے اطراف

کسی بھی چیک کے عموماً تین فریق ہوتے ہیں:-

الف:- مرتب/ساحب (Drawer)

ب:- مرتب الیہ/مسحوب علیہ (Drawee) جو عموماً بنک ہی ہوتا ہے۔

ج:- وصول کنندہ/مستفید (Payee)۔

''الف'' سے مراد وہ شخص ہے جو چیک جاری کرتا ہے اور اس پر دستخط کرتا ہے،

---

(۱) أحكام الأوراق النقدية والتجارية، الجعيد (ستر بن ثواب) السعودية، الطائف، مكتبة الصديق، طبع اوّل ۱۹۹۳ء (ص: ۳۶۰)۔

(۲) Introduction to Economic Principles. Dr. A.N.Agrawal

''ب'' سے مراد وہ فریق ہے جس کو چیک پیش کیا جاتا ہے، جو عموماً بنک ہی ہوتا ہے، اور ''ج'' سے مراد وہ شخص ہے جس کو چیک میں درج شدہ رقم مل جائے۔

چیک اور مبادلاتی بل (Bill of Exchange) میں چند نمایاں فروق

۱- مبادلاتی بل کسی بھی شخص کے نام جاری کیا جا سکتا ہے، جبکہ چیک صرف متعلقہ بنک کے نام ہی جاری کیا جا سکتا ہے۔

۲- مبادلاتی بل جس کے نام جاری کیا جائے، اس کی طرف سے اس کی قبولیت ضروری ہے، جبکہ چیک میں بنک کی طرف سے قبولیت ضروری نہیں۔

۳- مبادلاتی بل کی ادائیگی مطالبے یا مستقبل کی کسی قابلِ تعین تاریخ پر ہوتی ہے، جبکہ چیک کی ادائیگی اس پر لکھی ہوئی تاریخ کے مطابق مطالبے پر ہوتی ہے۔

۴- مبادلاتی بل کراس نہیں کیا جا سکتا، جبکہ چیک کو کراس کیا جا سکتا ہے۔

۵- مبادلاتی بل میں ڈسکاؤنٹ ہو سکتا ہے، جبکہ چیک میں کوئی ڈسکاؤنٹ نہیں کیا جا سکتا۔

۶- مبادلاتی بل میں درج رقم قسطوں میں ادا کی جا سکتی ہے، جبکہ چیک میں درج شدہ رقم کو قسطوں میں ادا نہیں کیا جا سکتا، وغیرہ۔

چیک کی چند مشہور اَقسام

بنک چیک کی بہت ساری قسمیں ہیں، یہاں چند مشہور اَقسام کو ذِکر کیا جاتا ہے:-

۱- حامل چیک (Bearer Cheque):- یہ چیک کی ایک عام اور سادہ ترین قسم ہے، اس قسم کا چیک بنک میں جو شخص بھی پیش کرتا ہے، بنک اس کی بلا حیل و حجت ادائیگی کرتا ہے، اس قسم کے چیک کی ادائیگی کا بنک ہرگز ذمہ دار نہیں ہوتا، کیونکہ اس پر اس قسم کی کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی کہ وہ اس امر کی لازمی تصدیق کرے کہ اس کے کھاتہ دار نے وہ چیک جس شخص کے نام جاری کیا ہے، آیا اسے کیش کرانے والا واقعی وہی شخص

ہے یا کوئی دُوسرا، جو شخص بھی اسے پیش کرے بنک اسے ادائیگی کرتا ہے، بشرطیکہ چیک کے ضروری مندرجات میں کوئی غلطی نہ ہو۔

۲- **ہدایتی چیک (Order Cheque)**:- یہ وہ چیک ہوتا ہے جو جس شخص کے نام جاری کیا گیا ہو، بنک اس شخص کے نام کی ضروری تصدیق اور تسلی کے بعد ہی اس کی ادائیگی کرتا ہے، نام کی تصدیق کرانا اس شخص کی ذمہ داری ہوتا ہے جس کے نام پر وہ چیک جاری کیا گیا ہو، تصدیق کے بعد یہ ذمہ داری بنک کی بن جاتی ہے کہ جس کے نام چیک جاری کیا گیا ہے یہ چیک مجاز شخص کے علاوہ کوئی دُوسرا شخص کیش نہیں کرا سکتا۔

۳- **خط کشیدہ چیک (Cross Cheque)**:- یہ محفوظ ترین چیک ہوتا ہے، کیونکہ وہ جس شخص یا اِدارے کے نام جاری کیا گیا ہو، وہی اسے کیش کرانے کا مجاز ہوتا ہے، اس میں جعل سازی کے اِمکانات بہت کم ہوتے ہیں، نیز یہ چیک اکاؤنٹ میں جمع کیا جاتا ہے، براہِ راست کیش نہیں ہوتا، اور اس کی کسی چوری وغیرہ کا بھی اندیشہ نہیں ہوتا۔

۴- **پس تاریخی چیک (Post Dated Cheque)**:- یہ وہ چیک ہوتا ہے جو آئندہ کی کسی تاریخ کے لئے جاری کیا گیا ہو، مثلاً آج تیس ستمبر ۲۰۰۶ء کو ایک تاجر کسی ادائیگی کے سلسلے میں کسی دُوسرے تاجر کو پندرہ دسمبر ۲۰۰۶ء کی تاریخ کا چیک دیتا ہے، اس چیک کا مقصد تاخیر سے ادائیگی کرنا ہوتا ہے تاکہ ادائیگی کرانے والے کو اس دوران اپنے کھاتے میں مطلوبہ رقم جمع کرانے کی سہولت حاصل ہوجائے، اور چیک وصول کرنے والے کو یہ تسلی رہے کہ اسے دی گئی تاریخ پر وصولی ہوجائے گی، ایسا چیک مقررہ تاریخ سے قبل کیش نہیں کیا جاسکتا۔

چیک کو مسترد (Dishonour) کرنے کی وجوہات

بنک درج ذیل قسم کی وجوہات کی بناء پر چیک کو مسترد کرسکتا ہے:-

۱- دستخطوں میں فرق ہو۔

۲-مقررہ تاریخ سے پہلے پیش کیا جائے۔

۳-مقرّرہ تاریخ کے بعد پیش کیا جائے۔

۴-اکاؤنٹ میں مطلوبہ رقم ناکافی ہو۔

۵-اکاؤنٹ ہولڈر کا اِنتقال ہو جائے۔

۶-بنک دیوالیہ ہو جائے۔

۷-عدالت اس سے متعلق حکم جاری کرے۔

۸-چیک میں کوئی تبدیلی ہوئی ہو۔

۹-مقدارِ رقم میں فرق ہو۔

۱۰-دستخطوں میں دھوکے سے کام لیا گیا ہو۔

چیک کی شرعی تکییف

چیک کی شرعی تکییف میں مختلف اقسام اور مختلف حالات کی وجہ سے علماء کے مختلف اقوال سامنے آتے ہیں، کہ چیک حوالہ ہے یا وکالہ ہے، یا کیا ہے، ہم یہاں صرف اس کے ضروری خلاصے کے ذِکر کرنے پر اِکتفا کرتے ہیں۔

سیّد محمد باقر الصدر نے چیک کی شرعی تکییف کے بارے میں جو بحث کی ہے، اس کا حاصل درج ذیل ہے:-

> چیک میں چیک لکھنے والا عام طور پر مدیون (Debtor) ہوتا ہے، اور مستفید (Beneficiary) دائن (Creditor) ہوتا ہے، لہٰذا مدیون بنک کے لئے چیک لکھتا ہے، اور اس کو دائن کو دیتا ہے، تا کہ اس کا قرضہ چک جائے، پھر کبھی مدیون کا بنک میں بیلنس ہوتا ہے، اور کبھی نہیں ہوتا، بلکہ اوور ڈرافٹ کا معاملہ ہوتا ہے لہٰذا ان دونوں حالتوں کا حکم لکھا جاتا ہے:-

پہلی حالت:- اگر چیک لکھنے والا خود اپنے اکاؤنٹ سے رقم نکلواتا ہے، تو یہ محض اپنا قرض وصول کرنا ہے، جسے ''استیفاء دَین'' کہتے ہیں، لہٰذا اس صورت میں اگر محررِ چیک مستفید کا مدیون ہو، اور وہ چیک لکھ کر مستفید کو دیدے، تو یہ حوالہ ہے، اور یہ دائن کا حوالہ ہے، بمقابلہ مدیون، یہ شرعاً دُرست ہے، اور اس سے مدیون کا ذمہ فارغ سمجھا جائے گا۔

دُوسری حالت:- کہ محرر کا بنک میں کوئی بیلنس نہ ہو، اور یہ ''سحب علی المکشوف'' (Overdraft) ہو، اور محرر مستفید کا مدیون ہو، دائن یعنی مستفید یہ چیک بنک کو پیش کرتا ہے تا کہ وہ اپنی قیمت وصول کرے، تو یہ صورت بھی حوالہ کی ہے، لیکن اس میں محتال علیہ محیل کا مدیون نہیں ہے، اسی وجہ سے فقہاء کی اِصطلاح کے مطابق اس کو ''حوالہ علی البری'' کہتے ہیں، اور یہ بھی جائز ہے، بنک اگر چیک قبول کرے، تو گویا کہ اس نے حوالہ کو قبول کرلیا، تو اس کا ذمہ محال کے لئے مشغول ہو جائے گا اس رقم کے ساتھ جو محال کا محول کے ذمہ واجب ہے، اور محول بنک کا مدیون ہو جائے گا۔[۱]

اس کا حاصل یہ ہوا کہ:-

۱- اگر محرر کا بنک میں بیلنس ہے، اور وہ خود اپنے لئے بنک سے چیک کے ذریعے پیسے نکلواتا ہے، تو یہ محض استیفاء دَین ہے۔

۲- اور اگر محرر کا بنک میں بیلنس موجود ہے، اور محرر کسی اور کو چیک دیتا ہے، اور وہ محرر کا دائن ہے، تو یہ دائن کا حوالہ ہے مدیون کے مقابلے میں۔

---

(۱) البنك الاربوی فی الإسلام، الصدر (السید محمد باقر الصدر) بیروت لبنان، دار التعارف للمطبوعات، طبع ششم ۱۴۱۰ھ۔

۳- اور اگر محرر کا بنک میں بیلنس نہیں، اور محرر اپنے لئے بنک سے رقم نکلواتا ہے تو یہ قرض کا معاملہ ہے کہ بنک مقرض ہے، اور محرر مستقرض ہے۔

۴- اور محرر کا بنک میں بیلنس نہیں، اور محرر کسی اور کو چیک لکھ کر دیتا ہے، اور وہ محرر کا دائن ہے، تو یہ بھی حوالہ ہے، جس کی تفصیل دُوسری حالت میں گزر گئی۔

اور "Shari'a Standards" میں چیک کی شرعی تکییف کے بارے میں جو خلاصہ لکھا گیا ہے، وہ اسی کے الفاظ میں ذیل میں ملاحظہ ہو:-

An issuance a cheque against a current account is a form of hawala if the beneficiary is a creditor of the issuer or the account holder for the amount of the cheque, in which case the issuer, the bank and the beneficiary are the transferor, the payer and the transferee respectively.

If the beneficiary is not a creditor to the issuer of the cheque, then this is not a hawala transaction because there can be no hawala transaction without an existing debt. In the absence of a debt, the transaction becomes an agency contract for recovery of the amount of the debt on behalf of the transferor, which is lawful in Sharia.

If the beneficiary of the amount of a cheque is a creditor to the issuer, then issuing a cheque against the account of the issuer without a balance is unrestricted transfer of debt if the bank accepts the overdraft. If the bank rejects the overdraft, then this is not considered a transfer of debt, in which case the potential beneficiary may have recourse to the issuer.

The holder of a traveler's cheque, the value of which has been paid by him to the issuing institution, is a creditor to such an institution. If the holder of the traveler's cheque endorses the cheque in favour of his creditor, it becomes a transfer of debt in favour of a third party against the issuing institution that is a debtor to the holder

of the traveler's cheque. This is a restricted transfer of debt and the amount of the debt is the value of the cheque for which the institution received payment.(1)

اس کا حاصل یہ ہے کہ:-

۱-کرنٹ اکاؤنٹ کے لئے چیک کو جاری کرنا حوالہ ہے، جبکہ مستفید محرر کا دائن ہو، تو محرر محیل ہے، بنک محال علیہ ہے، اور مستفید محال ہے۔

۲-اور جب محرر مستفید کا مدیون نہ ہو، تو یہ حوالہ نہیں، کیونکہ حوالہ بغیر دَین کے نہیں ہوتا، بلکہ یہ وکالہ بالقبض ہے، جو شرعاً جائز ہے۔

۳-جب محرر مستفید کا مدیون ہوا، اور محرر کا بنک میں بیلنس نہ ہو، تو یہ حوالہ مطلقہ ہے جب بنک اس کو قبول کرے، اور اگر بنک اس کو قبول نہ کرے، تو یہ حوالہ نہیں، اور حامل کو محرر کی طرف رُجوع دُرست ہے۔

۴-سفری چیک کا حامل جو اس کی قیمت اِدارے کو اَدا کرتا ہے، حامل اس اِدارے کا دائن سمجھا جائے گا، اور اگر حامل اس کو اپنے دائن کے حق میں انڈورس کرے، تو یہ حوالہ بن جائے گا، اور یہ حوالہ مقیدہ ہے، حوالہ مطلقہ اور حوالہ مقیدہ کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔

مولانا محمد تقی عثمانی صاحب تکملہ فتح الملہم میں چیک اور اس کے اَحکام کے بارے میں فرماتے ہیں:-

فالصحیح ان الشیك المصرفی سند یدل علی ان الذی وقع علیه قد وکّل حامله لقبض دَینه من البنك ومقاصة دَینه منه فلیس ذٰلك من الا ثمان فی شیء فلا یعتبر القبض علیه قبضًا علیٰ مبلغه حتّٰی ینقده البنك ولا یتادی باداءه الزکوٰة حتّٰی ینقده الفقیر ولا یجوز اشتراء الذهب

(1) Shari'a Standards 1423 AH, 2002 Accounting and Auditing Organization for Islamic Financial Institutions.

والفضة به لفقدان التقابض في المجلس ويجوز لموقعه ان يعزل حامله عن الوكالة قبل ان يبلغ به الى البنك۔

صحیح یہ ہے کہ بنک چیک ایک سند ہے جو اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جس نے اس پر دستخط کئے ہیں، وہ حامل کو وکیل بناتا ہے تاکہ وہ اس کا دَین وہاں سے وصول کرے، اور پھر مقاصہ ہوجائے، لہٰذا چیک ثمن نہیں، اس لئے چیک پر قبضہ اس کے اندر درج شدہ رقم پر قبضہ تصور نہیں ہوگا جب تک اس کو کیش نہ کرایا جائے، جب تک فقیر اس کو کیش نہ کرائے، اس وقت تک اس سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی، نیز چیک سے سونا چاندی کی خریداری بھی جائز نہیں، کیونکہ مجلس کے اندر تقابض نہیں پایا جاتا، اور اس کے دستخط کنندہ کے لئے جائز ہے کہ اس کے حامل کو وکالت سے معزول کرے، جب تک وہ اس کو لے کر بنک نہ پہنچ جائے۔[1]

کتاب البنک اللاربوی اور شرعیہ اسٹینڈرڈز کی مذکورہ عبارات کی روشنی میں بندے کا خیال یہ ہے کہ بعض صورتوں میں چیک کا معاملہ ضرور حوالہ کے زُمرے میں آجاتا ہے، اس لئے علی الاطلاق چیک میں حوالہ کی نفی بظاہر دُرست نہیں، اور اس کو ہر حال میں محض رسید قرار دینا اور اس معاملے کو وکالت قرار دینا محلِ نظر ہے، نیز خط کشیدہ حکم بظاہر اس وقت ہے جبکہ سونے یا چاندی پر بھی مجلسِ عقد میں قبضہ نہ ہو، ورنہ اگر سونے یا چاندی پر مجلسِ عقد میں قبضہ پایا جائے، تو میرے خیال میں یہ معاملہ دُرست ہونا چاہئے، کیونکہ چیک میں درج شدہ رقم کوئی کرنسی ہوگی، اور کرنسی کے ساتھ سونے چاندی کا اُدھار معاملہ دُرست ہے، کیونکہ یہ بیعِ صَرف میں داخل نہیں۔

---

(۱) تكملة فتح الملهم شرح الصحيح لمسلم، العثماني (محمد تقي العثماني) كراتشي، مكتبة دارالعلوم كراتشي، (۵۱۵/۱)۔

ہنڈی (Bill of Exchange)

"Bill of Exchange" کی حقیقت اور تعریف

اس کی حقیقت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب اپنی مشہور اُردو تصنیف ''اسلام اور جدید معیشت وتجارت'' میں اس طرح بیان فرماتے ہیں:-

بل آف ایکسچینج ایک خاص قسم کی دستاویز ہے، جب کوئی تاجر اپنا مال فروخت کرتا ہے، تو خریدار کے نام بل بناتا ہے، بعض اوقات اس بل کی ادائیگی کسی آئندہ تاریخ میں واجب ہوتی ہے، اس بل کو دستاویزی شکل دینے کے لئے مدیون اس کو منظور کر کے اس پر دستخط کر دیتا ہے کہ میرے ذمہ فلاں تاریخ کو اس بل کی ادائیگی واجب ہے، اس کو عربی میں ''کمبیالۃ''، اُردو میں ''ہنڈی'' اور انگریزی میں "Bill of Exchange" کہتے ہیں، اور اس کو ''مبادلاتی بل'' بھی کہتے ہیں، اس دستاویز میں ادائیگی کی جو تاریخ لکھی ہوئی ہوتی ہے، اس تاریخ کے آجانے کو عربی میں ''نضج الکمبیالۃ'' اور انگریزی میں "Maturity" کہتے ہیں، اس تاریخِ ادائیگی کو "Maturity Date" کہتے ہیں۔ ہنڈی میں لکھا ہوا دَین تو مدیون سے تاریخِ ادائیگی آنے پر ہی لیا جاسکتا ہے، مگر دائن کو فوری طور پر رقم کی ضرورت ہوتی ہے، تو کسی تیسرے شخص کو وہ بل دے کر لکھی ہوئی رقم لے لیتا ہے، اور بل کی پشت پر دستخط کر کے اس کے حقوق اس تیسرے شخص کی طرف منتقل کر دیتا ہے، تیسرا شخص اس پر لکھی ہوئی رقم میں کٹوتی بھی کر دیتا ہے، مثلاً ہنڈی پر ایک ہزار روپے لکھے ہوئے ہیں تو وہ نو سو پچاس روپے دیتا ہے، اس عمل کو عربی میں ''خصم

الـکـمبيـالة" اور انگریزی میں "Discounting of the Bill of Exchange" اور اُردو میں ''بٹہ لگانا'' کہتے ہیں۔ اور ہنڈی کی پشت پر جو دستخط کئے جاتے ہیں اس کو عربی میں "تـــظهيـــر" اور انگریزی میں "Endorsement" کہتے ہیں، اور اُردو میں ''عبارت ظہری لکھنا'' کہتے ہیں۔ ہنڈی پر بٹہ لگانے کی شرح "Maturity" کو مدِ نظر رکھ کر طے ہوتی ہے، تاریخِ ادائیگی جتنی قریب ہوتی جائے، بٹہ لگانے کی شرح کم ہوتی جاتی ہے۔ بینک بھی عموماً ہنڈی کی ڈسکاؤنٹنگ کرتے ہیں، اور یہ بھی بینکوں کے قصیر المیعاد قرضوں میں داخل ہے، اس لئے کہ بل کی ادائیگی "Maturity" عموماً تین ماہ میں ہوتی ہے۔[1]

اسی کو مولانا محمد تقی عثمانی صاحب نے اپنی مشہور عربی تصنیف ''بحوث'' میں درج ذیل الفاظ کے ساتھ ذکر فرمایا ہے:-

الـنـوع الثـانـي مـن الأوراق المالية التي تتداول في السوق اليـوم تسـمـى كـمبيـالة وهي عبارة عن الوثيقة التي يكتبها الـمشتري للبائع في بيع مؤجل ويعترف فيها بانه وجب في ذمتـه ثـمـن الـمبيـع، وانه يلتزم بأداء في تاريخ آجل، وان البـائـع حـامل الكمبيالة ربما يريد استعجال الحصول علىٰ مبـلـغهـا فلا ينتظر إلىٰ تاريخ نضج الكمبيالة بل يبيعها إلىٰ طـر ف ثـالـث بـأقـل مـن قيـمتهـا الإسمية ويسمـى حسم الـكـمبيـالة أو خصم الكمبيالة "Discounting" والـعادة في

---

(۱) اسلام اور جـديـد معيشت و تـجارت، عثماني (محمد تقي عثماني) كراچي، مكتبه معارف القرآن كراچي، طبع جديد ۱۴۲۴ھ (ص: ۱۲۲)۔

سوق الأوراق ان مقدار هذا الحسم نسبة مبلغ الكمبيالة تحدد علىٰ اساس مدة نضجها فكُلَّما كانت مدة نضجها اكثر كانت نسبة الحسم اكثر وكُلَّما كانت المدة أقل كانت نسبة الحسم اقل۔[1]

اس کا حاصل بھی وہی ہے جو اُردو متن میں بیان ہوا۔

ڈاکٹر عبدالعزیز فہمی ہیکل نے اس کی تعریف یوں کی ہے:-

هى نوع من السندات الاذنية التى تستخدم فى التجارة الخارجية فى الدول الغربية يعتهد بموجبها الساحب (The Drawer) وبدون شروط ان يدفع للمسحوب لصالحه (The Drawee) مبلغًا من المال فى تاريخ معين۔

یہ ان دستاویزات میں سے ہے جو بیرونی تجارت میں مغربی ممالک میں استعمال ہوتا ہے، اس کی بموجب لکھنے والا ذمہ داری لیتا ہے بغیر کسی شرط کے کہ وہ مستفید کو کسی خاص تاریخ میں مال کی ایک مقدار دے گا۔[2]

آگروہ وال نے اس کی یوں تعریف کی ہے:-

A bill of exchange is an order from a creditor to the debtor to pay a certain sum of money to himself or to the bearer.

بل آف ایکسچینج دائن کی طرف سے مدیون کے لئے ایک حکم نامہ ہے

(۱) بحوث فى قضايا فقهية معاصرة، العثمانى (محمد تقى العثمانى) كراتشى، مكتبه دارالعلوم كراتشى، طبع جديد ۱۴۲۶ھ (۱۱۲/۲)۔

(۲) موسوعة المصطلحات الإقتصادية الإحصائية، هيكل (الدكتور عبدالعزيز فهمى هيكل) بيروت، دار النهضة العربية (ص:۷۵)۔

کہ مدیون دائن کو یا حامل کو خاص مقدار پیسوں کی ادا کرے۔ (۱)

بل آف ایکسچینج ایکٹ مجریہ ۱۸۸۲ء میں اس کی تعریف ان لفظوں میں بیان کی گئی ہے:۔

> An unconditional order in writing, addressed by one person to another singed by the person giving it, requiring the person to whom it is addressed to pay on demand or at a fixed or determinable future time a sum certain in money or to the order of a specified person, or to bearer.

> مبادلاتی بل ایک غیر مشروط تحریری حکم نامہ ہے جو حکم دینے والے شخص یا فریق کے دستخطوں سے کسی دُوسرے شخص یا فریق کے نام جاری کیا جاتا ہے، جس میں ایک مخصوص رقم اس میں مذکورہ شخص کو یا اس کے حکم پر کسی دُوسرے شخص یا حاملِ بل کو اس کے مطالبے پر یا آئندہ کی کسی مقرّرہ تاریخ کو یا کسی قابلِ تعین تاریخ کو اَدا کرنے کے لئے کہا گیا ہوتا ہے۔ (۲)

ہنڈی کی شرائط

ہنڈی یا مبادلاتی بل میں مندرجہ ذیل شرائط کا پایا جانا ضروری ہے:۔

۱- یہ ایک حکم نامے کی صورت میں ہونا چاہئے، درخواست یا گزارش وغیرہ کی صورت میں نہیں ہونا چاہئے۔

۲- یہ حکم نامہ غیر مشروط ہونا چاہئے، یعنی اس میں درج رقم کی ادائیگی کو کسی شرط کے پورا ہونے سے مشروط نہیں ہونا چاہئے۔

۳- یہ حکم نامہ تحریری شکل میں ہونا ضروری ہے۔

---

(۱) Intrudaction to Economic Principles. Dr. A.N.Agarwal

(۲) بحوالہ تعارف زر و بنکاری، شیخ مبارک علی (ص:۲۳۴)۔

۴- یہ حکم نامہ ایک شخص یا فریق کی طرف سے کسی دُوسرے شخص یا فریق کے نام ہونا چاہئے، اگر بل مرتب کرنے والا اور جس کے نام مرتب کیا گیا ہو، دونوں ایک ہی شخص ہوں، تو اس کا شمار مستند بل میں نہیں ہوگا۔

۵- بل مرتب کرنے والے پر اس کے دستخط ہونے چاہئیں، اگر اس شخص کا تعلق کسی کمپنی سے ہو، تو وہ لازماً بااِختیار شخص ہونا چاہئے۔

۶- بل میں لکھی ہوئی مخصوص رقم کی ادائیگی اس کے مطالبے پر یا آئندہ کی کسی مقررہ تاریخ کو یا مستقبل کی کسی قابلِ تعین تاریخ کو ہونی چاہئے۔

۷- بل میں قابلِ ادائیگی مخصوص رقم کا اِندراج ہونا چاہئے، اگر قابلِ ادا مخصوص رقم کا اِندراج نہیں ہوگا، تو اس بل کی کوئی قانونی حیثیت نہیں ہوگی۔

۸- بل کی رقم بل میں مذکورہ شخص کو یا اس کے حکم پر کسی دُوسرے مخصوص شخص کو یا حامل کو اَدا ہونی چاہئے۔(۱)

بل آف ایکسچینج کی چند مشہور قسمیں

اس بل کو اس کی نوعیت کے اِعتبار سے ان تین اَقسام میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:-

①- بلحاظ مقام ②- بلحاظ مقاصد ③- بلحاظ اُدائیگی قیمت

بلحاظ مقام

بلحاظ مقام بل کی دو قسمیں ہیں:-

ملکی بل (Inland Bill):- یہ وہ بل ہے جسے اندرون ملک ہی تجارتی لین دین میں استعمال کیا جاسکتا ہے، دُوسرے لفظوں میں بل کے فریقین کا تعلق ایک ہی ملک سے ہوتا ہے، اور اس بل کے عوض رقم کا لین دین بھی اندرون ملک ہی ہوگا۔

غیر ملکی بل (Foreign Bill):- یہ وہ بل ہوتا ہے جس کے فریقین میں ملکی

---

(۱) تعارفِ زَر و بنکاری، شیخ مبارک علی۔

تاجر کے علاوہ غیر ملکی تاجر بھی شامل ہو، مثلاً اگر پاکستان کے کسی تاجر نے سنگاپور کے کسی تاجر کے نام کوئی بل بنایا ہے، اور اس نے اس کی ادائیگی تحریری طور پر قبول کر لی ہے، تو یہ بل غیر ملکی بل کہلائے گا، کیونکہ اس بل کی ادائیگی سنگاپور میں ہوگی۔

بلحاظ مقاصد

اس لحاظ سے بھی بل کی دو قسمیں ہیں:-

تجارتی بل (Commercial Bill):- وہ بل جو تجارتی لین دین کے تصفیے کے لئے بنایا جائے، اسے تجارتی بل کہتے ہیں، کاروباری دُنیا میں اکثر و بیشتر یہ ہوتا ہے کہ کسی شئ کا خریدار اس کی رقم فروخت کنندہ کو نقد اُدا کرنے کے بجائے اس سے مستقبل میں ادائیگی کے لئے بل بنوالیتا ہے، اور اس پر اس امر کی اپنی قبولیت ثبت کر دیتا ہے کہ وہ بل میں درج رقم اس کی ہدایت کے مطابق دی گئی مقررہ تاریخ کو اُدا کرے گا۔

اعانتی بل (Accommodation Bill):- یہ بل تجارتی اُدھار کے لین دین کے تصفیے کے لئے نہیں، بلکہ کسی کی مالی اعانت کے لئے بنائے جاتے ہیں، ایسے بلوں کا مقصد کسی شخص کو بل کی کٹوتی کا موقع فراہم کر کے کچھ عرصے کے لئے اس کی مالی اعانت کرنا ہوتا ہے۔

بلحاظ ادائیگی وقت

اس لحاظ سے بھی بل کی دو قسمیں ہیں:-

عندالطلب (On Demand Bill):- وہ بل جو پیش کرنے یا دِکھانے پر قابلِ ادائیگی ہو، اسے عندالطلب بل کا نام دیا جاتا ہے۔

مدتی بل (Time Bill):- یہ وہ بل ہوتا ہے جو مستقبل میں کسی مخصوص تاریخ یا کسی معینہ مدت کے بعد قابلِ ادائیگی ہو، یہ مدت یا تو بل کی اِجرائی تاریخ سے شروع ہوتی ہے، یا پھر قبولیت کی تاریخ سے۔

بل کی تیاری کا طریقۂ کار

بل کی تیاری میں مندرجہ ذیل اُمور کو ملحوظ رکھنا ضروری ہوتا ہے:-

۱- ریونیو ٹکٹ چپکانا:- بل کو قانونی آلہ مبادلہ کی حیثیت دینے کے لئے مرتب یا جاری کنندہ کو اس کے عوض ایک مخصوص رقم کا سرکاری ٹیکس ادا کرنا ہوتا ہے، جسے بل کے اُوپر ایک کونے پر ٹکٹ کی شکل میں چپکانا پڑتا ہے۔

۲- رقم کا اِندراج:- بل میں مندرج قابلِ ادا رقم کو ہندسوں اور الفاظ دونوں میں صاف اور واضح طور پر لکھا جاتا ہے۔

۳- تاریخ کا اِندراج:- بل جس تاریخ کو مرتب یا تیار کیا جائے، وہ واضح اور صاف طور پر تحریر کی جانی چاہئے، تاریخ عام طور پر بل کے اُوپر ٹکٹ کے مخالف کونے پر درج کی جاتی ہے۔

۴- وصول کنندہ کا نام:- بل جس شخص یا فریق کو اَدا کیا جانا مقصود ہو، اس میں اس کا نام بھی اس کے متن میں صاف اور واضح طور پر تحریر کیا جانا چاہئے۔

۵- مالیت وصول شدہ:- بل ہمیشہ ایک مخصوص قدر یا مالیت کے لئے لکھا جاتا ہے، لہٰذا بل میں یہ الفاظ ''مالیت وصول شدہ ہے'' یا برائے مالیت وصول شدہ (For Value Received) ضرور تحریر کئے جانے چاہئیں۔

۶- مرتب کے دستخط ثبت ہوں:- بل میں اس کے مرتب کے دستخط ثبت ہونا بھی لازمی ہے، دستخط کے بغیر بل کی کوئی قانونی حیثیت نہیں۔

۷- مرتب الیہ کا نام اور پتہ:- بل کے آخر میں اس کے مرتب الیہ کا نام اور پتہ نچلے سرے پر دستخط کی مخالف سمت میں درج کیا جانا ضروری ہے۔

۸- بل کی قبولیت:- صرف بل کی تیاری کے بعد اس میں مندرج رقم کسی شخص پر واجب الاداء نہیں ہو جاتی، بلکہ اس کے لئے ضروری ہے کہ مرتب الیہ یا اس کی

طرف سے کوئی مجاز شخص اپنی تحریری قبولیت کا اِندراج بل پر کردے، اس کے بغیر بل کی کوئی قانونی حیثیت نہیں ہوتی۔

بل کی کٹوتی (Discounting of Bill of Exchange)

تجارتی دُنیا میں اُدھار لین دین میں سہولت کے پیشِ نظر مدتی بل عموماً زیادہ استعمال کئے جاتے ہیں، مدتی بل کی ادائیگی کے لئے مستقبل کی کوئی تاریخ مقرر ہوتی ہے، چنانچہ اگر حامل کو بل میں لکھی ہوئی رقم کی مقررہ مدت سے ضرورت پڑ جائے، تو اسے کٹوتی کے لئے کسی بنک میں پیش کرتا ہے، آج کے ترقی یافتہ دور کے تقریباً تمام تجارتی بنک اس قسم کے بلوں پر کٹوتی کی سہولت مہیا کر کے کاروباری لوگوں کو مالیات فراہم کرنے کے کاروبار میں سرگرم عمل ہیں، دراصل بنک ایسے بل کو خریدتے ہیں، اور اس کے عوض بل میں درج شدہ رقم سے کچھ کم رقم ادا کرتے ہیں، کٹوتی کا تعین بنک کی مروّجہ شرحِ سود کے مطابق کیا جاتا ہے، اس قسم کی کٹوتی کو بنک کی طرف سے حاملِ بل کے لئے ایک قسم کا قلیل مدتی قرضہ بھی کہا جا سکتا ہے جس پر بنک کٹوتی کی صورت میں پیشگی سود کی وصولی کر لیتا ہے۔

ہنڈی (Bill of Exchange) کی شرعی تکییف

اگر مرتب (ساحب) مستفید کا مدیون ہو، تو اس صورت میں ہنڈی از قبیل حوالہ ہے، مرتب محیل ہوگا، مرتب الیہ محال علیہ ہوگا، اور مستفید محال ہوگا، اور اگر مرتب مستفید کا مدیون نہ ہو، تو اس صورت میں ہنڈی از قبیل حوالہ نہیں ہوگا، بلکہ یہ وکالہ ہوگا۔

پھر جاننا چاہئے کہ اگر مرتب اور مرتب الیہ میں مدیونیت کا علاقہ نہ ہو، تو یہ حوالہ مطلقہ ہے۔

فی المعاییر الشرعیة: تعتبر الکمبیالة من قبیل الحوالة إذا کان الشخص المستفید الذی سحبت لأمره دائنًا للساحب، ویکون الساحب هو المحیل الذی یصدر أمرًا

للمسحوب عليه بدفع مبلغ معين من النقود في تاريخ معين للمستفيد المحدد۔

أما الجهة الملتزمة بدفع المبلغ المعين (المسحوب عليه) فهي المحال عليه، والمستفيد حامل الكمبيالة هو المحال، فإن لم يكن المستفيد دائنًا للساحب كان إصدار الكمبيالة توكيلًا من الساحب للشخص في قبض واستيفاء مبلغ الكمبيالة۔

تعتبر الكمبيالة في حال عدم وجود مديونية بين الساحب والمسحوب عليه من قبيل الحوالة المطلقة۔[1]

اس عبارت کا حاصل وہی ہے، جو ہم نے اُوپر بیان کیا۔

وفي تكملة فتح الملهم: فاما البون والكمبيالة والوثائق الأخرى التي يكتب عليها مبلغ الدين منذ يوم إجراءها، فإن التعامل بها حوالة صحيحة بلا ريب لأن الذي أصدرها قد كتب عليها إني مدين لكل من يحملها بهٰذا المبلغ المعلوم فكلما سلمها حاملها إلىٰ رجل آخر، فقد احال دينه عليه، وقد وجد رضا المحيل والمحتال صريحًا ورضا المحتال عليه معنى لأن المحتال عليه هو الذي اجرى هٰذه الأوراق أوّل مرّة وقد رضي بأداء مبلغها إلىٰ كل من يحملها فرضاه عام لكل من يحملها وأما تلفظ الإيجاب والقبول فلا يشترط في الحوالة بل تنعقد الحوالة بالتعاطي كما ينعقد البيع۔

(۱) المعايير الشرعية، هيئة المحاسبة والمراجعة للمؤسسات المالية الإسلامية ۱۴۲۴ھ۔

بانڈ، ہنڈیاں اور دیگر مالی دستاویزات جن پر خاص مقدار لکھی ہوئی ہوتی ہے، جاری کرنے کے دن سے، ان کے ساتھ تعامل بلاشبہ حوالہ صحیحہ ہے، کیونکہ جس نے اس کو جاری کیا ہے، اس نے اس پر لکھا ہے کہ میں ہر اس شخص کا مدیون ہوں جس کے پاس یہ بل موجود ہو، پس جب وہ یہ بل کسی اور آدمی کو دیتا ہے تو وہ حوالہ کر رہا ہے، اس میں محیل اور محتال کی رضامندی صراحۃً پائی جاتی ہے، اور محتال علیہ کی رضامندی معنیً پائی جاتی ہے، کیونکہ وہ جاری کرتے وقت اس بات پر راضی ہے کہ وہ اس میں لکھی ہوئی رقم ہر اس شخص کو اَدا کرے گا، جس کے پاس یہ بل موجود ہو، جہاں تک ایجاب وقبول کے تلفظ کا تعلق ہے تو وہ حوالہ میں شرط نہیں، (یعنی تلفظ شرط نہیں ہے) بلکہ یہ تعاطی سے بھی منعقد ہوتا ہے، جیسا کہ بیع تعاطی سے منعقد ہو جاتی ہے۔ [1]

کٹوتی (Discounting) کا حکم

جمہور علمائے معاصرین نے کہا ہے کہ یہ "بیع الدین من غیر مَن علیہ باقل منہ" جو ناجائز ہے، بیع الدین کی پوری تفصیل شروع میں ذکر ہو چکی ہے۔

فقہائے کرام نے ایک پیپر کا ذِکر کیا ہے، جو ہنڈی کے مشابہ ہے، اور اس کو "جامکیہ" کا نام دیا ہے، یہ اس دستاویز کو کہتے ہیں جس کو بیت المال یا متولّیٔ وقف کسی ایسے شخص کے لئے جاری کرتا ہے، جس کا بیت المال یا وقف میں مالی حق موجود ہو، اور اس کو پیسوں کی فی الحال ضرورت ہے، تو وہ کسی آدمی سے کہتا ہے کہ جامکیہ میں جو رقم لکھی ہوئی ہے، اس سے کم مجھے دو، تو یہ ناجائز ہے کیونکہ یہ بیع الدین میں داخل ہے، علامہ حصکفی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اِس طرح ذِکر کیا ہے:-

---

(۱) تکملة فتح الملهم شرح الصحيح لمسلم، العثماني (محمد تقي العثماني) كراتشي، مكتبة دارالعلوم كراتشي (۵۱۵/۱)۔

وأفتى المصنف (أى صاحب تنوير الأبصار) ببطلان بيع الجامكية لما في الاشباه: بيع الدين إنما يجوز من المديون۔

وقال ابن عابدين تحته: عبارة المصنف في فتاواه: سئل عن بيع الجامكية وهو أن يكون لرجل جامكية في بيت المال ويحتاج إلىٰ دراهم معجلة قبل أن تخرج الجامكية، فيقول له رجل: بعنى جامكيتك التى قدرها كذا بكذا انقص من حقه في الجامكية، فيقول: بعتك۔ فهل البيع المذكور صحيح أم لا؟ لكونه بيع الدَّين بنقد، اجاب: إذا باع الدَّين من غير من هو عليه كما ذكر لا يُصحّ۔ قال مولانا فى فوائده: وبيع الدَّين لا يجوز ولو باعه المديون أو وهبه۔[1]

اور حنابلہ کی کتابوں میں یہ عبارت ہے:۔

ولا يصح بيع العطاء قبل قبضه لأن العطاء مغيب فيكون من بيع الغرر وهو أن العطاء قسطه في الديوان، ولا يصح بيع رقعة به اى بالعطاء لأن المقصود بيع العطاء لا هى۔

عطا کو قبض کرنے سے پہلے فروخت کرنا جائز نہیں، کیونکہ عطا حاضر نہیں، لہٰذا اس میں غرر ہے کیونکہ عطا کی قسط دیوان میں ہے، اور اس کی دستاویز بیچنا بھی جائز نہیں، کیونکہ یہاں مقصود عطا ہی کو فروخت کرنا ہے، نہ کہ دستاویز۔[2]

(۱) الدر المختار مع ردّ المحتار، مطلب في بيع الجامكية۔

(۲) كشف القناع للبهوتى (۱۵۶/۳)۔

یاد رکھنا چاہئے کہ حنفیہ اور حنابلہ کی اصل کے مطابق بیع الدَّین مِن غیر مَن علیہ الدَّین مطلقاً ناجائز ہے، لہٰذا اس مسئلہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہنڈی ڈسکاؤنٹ کے بغیر فروخت کرنا بھی جائز نہیں، کیونکہ یہ بیع الدین من غیر من علیہ الدین ہے، جو علی الاطلاق ناجائز ہے۔

البتہ مالکیہ کی اصل کے مطابق ہنڈی کا ثمن یا تو نقود میں سے نہ ہو، یا پھر ثمن اس کی قیمت کے برابر ہو، اور شوافع کا مذہب بھی اس طرح معلوم ہو رہا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ کٹوتی تو بہرحال کسی کے نزدیک بھی جائز نہیں۔

اس سلسلے میں مجمع الفقہ الاسلامی جدہ کی قرارداد کے الفاظ درج ذیل ہیں:-

إن حسم الأوراق التجارية غير جائز شرعًا لأنه يؤل إلىٰ ربا النسيئة المحرم۔

مالیاتی دستاویزات کی کٹوتی بہرحال ناجائز ہے، کیونکہ اس کا نتیجہ رِبا النسیئہ کی شکل میں نکلتا ہے، جو حرام ہے۔[1]

مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مذکورہ موقف سے متفق نہیں، وہ اس معاملے کو بیع الدین قرار نہیں دیتے، بلکہ اس کو حوالہ قرار دے رہے ہیں، چنانچہ ان کے الفاظ ملاحظہ ہوں:-

ڈسکاؤنٹنگ کی فقہی حیثیت یہ ہے کہ دائن جس کے ہاتھ میں بل ہے، وہ دَین کا بٹہ لگانے والے (Discounter) کی طرف حوالہ کر دیتا ہے۔ اور یہ حوالہ بِأنقص من الدَّین ہے جو ناجائز ہے، اس لئے کہ یہ رِبا الفضل ہے۔ ڈسکاؤنٹنگ کے اس معاملے کو بیع الدَّین نہیں کہا جاسکتا، اس لئے کہ بیع اور حوالہ میں یہ فرق ہوتا ہے کہ بیع کے بعد دائن بری الذمہ ہو جاتا ہے، اور دَین کے تمام حقوق اس شخص کی

---

(۱) مجلة مجمع الفقه الإسلامي، العدد السابع ۲/۲۱۷، قرار رقم ۲/۲/۶۶، فقرہ۳، بحواله "بحوث في قضايا فقهية معاصرة" المجلد الثاني۔

طرف راجع ہوجاتے ہیں جس سے دَین خریدنا ہوتا ہے۔ اور حوالہ میں محیل ہی دائن رہتا ہے، وہ بری الذمہ نہیں ہوتا، اگر محتال کو دَین نہ ملے تو وہ محیل کی طرف رُجوع کا حق دار ہوتا ہے، اور آج کل ڈسکاؤنٹنگ میں صورتِ حال یہی ہوتی ہے کہ اگر بٹہ لگانے والے (Discounter) کو بل وصول نہ ہوتو وہ اصل دائن سے رُجوع کرتا ہے، لہٰذا یہ "بیع الدَّین من غیر من علیه الدَّین" نہیں، بلکہ "حوالة الدَّین بانقص من الدَّین" ہے۔[1]

اسی کو حضرت مفتی صاحب اپنی عربی تصنیف میں اس طرح بیان فرماتے ہیں:۔

والذی یظهر لی أن حسم الکمبیالة لیس بیعًا فی الحقیقة وإنما هو إقراض وحوالة، فالذی یحسم الکمبیالة یقرض إلیٰ حاملها مبلغًا ثم یحیل الحامل المقترض إیاه علیٰ مصدر الکمبیالة والدلیل علیٰ ذٰلك ان فی قوانین معظم البلاد لا یتحمل الحاسم خطر عدم التسدید بل یحق له ان یرجع علیٰ حامل الکمبیالة إذا لم یقع التسدید من مصدر الکمبیالة وهٰذا شان الحوالة علیٰ مذهب الحنفیة۔[2]

Bill of Exchange کی کٹوتی کا شرعی متبادل (Alternative)

اس کی کئی جائز صورتیں ہوسکتی ہیں، ان میں سے ایک صورت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ تاجر اس بل کو فروخت کرنے کی بجائے بنک کو اپنا قرض وصول کرنے کا وکیل بنائے، اور

---

(۱) اسلام اور جدید معیشت وتجارت ص:۱۵۰۔

(۲) بحوث فی قضایا فقهیة معاصرة، العثمانی (محمد تقی العثمانی) کراتشی، مکتبه دارالعلوم کراتشی، طبع جدید ۱۴۲۶ھ۔

اس کے لئے وکالہ فیس مقرر کردے، پھر اس بنک سے بل پر درج شدہ رقم کے برابر قرض لے لے، بنک تاجر کے وکیل کی حیثیت سے قرضہ وصول کرنے کے بعد تاجر کو دیئے ہوئے قرض کے بدلے میں اپنا قرض وصول کرے۔

مثلاً: زید کے پاس ایک بل ہے جس پر ایک لاکھ روپے کا مبلغ درج ہے، تو زید بنک کو وکیل بناتا ہے کہ وہ اس رقم کو بل کے جاری کرنے والے سے ایک ہزار روپے کے عوض وصول کرے، پھر بنک زید کو عقد مستقل کے ساتھ ننانوے ہزار روپے قرض دیتا ہے، پھر جب بنک ایک لاکھ روپے اصل آدمی سے وصول کرلے گا، تو مقاصہ واقع ہوجائے گا، تو بنک اس میں سے ننانوے ہزار روپے اپنے قرض کے طور پر رکھ لے، اور ایک ہزار روپے وکالہ فیس کے طور کے رکھ لے۔

لیکن یہ معاملہ دُرست ہونے کے لئے چند شرائط کا پایا جانا ضروری ہے:-

الاوّل: ان یکون کل واحد من العقدین منفصلًا عن الآخر فلا تشترط الوکالة فی القرض والقرض فی الوکالة۔

الثانی: ان لا تکون اجرة الوکالة مرتبطة بمدّة نضج الکمبیالة بحیث تکون الاُجرة زائدة إن کانت المدّة طویلة وتکون اقل إن کانت قصیرة۔

الثالث: ان لا یزاد فی اُجرة الوکالة بسبب القرض الذی اقرضه البنك فإنه یکون حینئذ قرضًا جرّ منفعة۔

۱-قرض اور وکالہ کے دونوں عقد بالکل ایک دُوسرے سے الگ الگ ہوں، وکالہ عقدِ قرض کے لئے شرط نہ ہو، اور عقدِ قرض وکالہ کے لئے شرط نہ ہو۔

۲-وکالہ فیس (Maturity) کی مدت کے ساتھ مربوط نہ ہو کہ اگر مدّت لمبی ہو، تو اُجرت زیادہ ہو، اور اگر مدّت کم ہو، تو اُجرت بھی کم ہو۔

۳-قرض کی وجہ سے وکالہ فیس میں اِضافہ نہ ہو، ورنہ یہ "کل قرض جرّ

منفعة" میں داخل ہو جائے گا، جو نا جائز ہے۔[1]

مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب تحریر فرماتے ہیں:-

لیکن اس تجویز میں دو باتیں قابلِ غور ہیں۔ ایک یہ کہ عموماً وکالت کی اُجرت کو بل کی رقم کی تعداد کے ساتھ مربوط کیا جائے گا، بل کی رقم زیادہ ہو، تو اُجرت بھی زیادہ ہوگی، اور رقم کم ہو، تو اُجرت بھی کم ہوگی۔ دُوسری بات یہ کہ اُجرت کو مدّت کے ساتھ بھی مربوط کیا جائے گا، بل کی پختگی زیادہ مدت کے بعد ہونی ہو، تو اُجرت زیادہ ہوگی، اور پختگی کم مدت میں ہونی ہو، تو اُجرت کم ہوگی۔ اب یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ اُجرت کو رقم کی تعداد اور مدّتِ پختگی کے ساتھ مربوط کرنا دُرست ہے یا نہیں؟

اُجرت کو رقم کی تعداد کے ساتھ مربوط کرنے کا جواز معلوم ہوتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ دَلالی (سمسرة) کی اُجرت کو مالیت کے ساتھ وابستہ کرنے میں اختلاف ہے، لیکن علامہ شامی رحمہ اللہ نے جواز کو ترجیح دی ہے۔ یعنی دلال نے زیادہ مالیت کی چیز بیچی ہے تو زیادہ اُجرت لینا، اور کم مالیت کی چیز میں دلال بنا ہے، تو کم اُجرت لینا جائز ہے۔ اس کی جو وجہ علامہ شامی رحمہ اللہ نے لکھی ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ گو یہاں مالیت کم یا زیادہ ہونے کی صورت میں دَلال کی محنت اور عمل برابر ہے، مگر اُجرت مقرر کرتے ہوئے صرف عمل اور محنت کو نہیں دیکھا جاتا، بلکہ اُجرت مقرر ہونے میں عمل کی قدر اور نوعیت کا بھی دخل ہوتا ہے، کم مالیت کی چیز کی دلالی کی قدر کم ہے، اور زیادہ

---

(۱) بحوث في قضايا فقهية معاصرة، العثماني (محمد تقي العثماني) كراتشي، مكتبه دارالعلوم كراتشي، طبع جديد ۱۴۲۶ھ۔

مالیت کی چیز کی قدر زیادہ ہے، لہٰذا اس کی بنا پر اُجرت میں بھی کمی بیشی ہوسکتی ہے۔ اس پر قیاس کرتے ہوئے وکالت کی اُجرت کو مقدارِ رقم کے ساتھ وابستہ کرنے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، مگر اُجرت کو مدّت اور زمانے کے ساتھ مربوط کرنے کا کوئی جواز سمجھ میں نہیں آتا۔ اس لئے کہ یہ عینہ والی شکل ہے کہ بلاسود قرض لے کر قرض کی مدّت کے حساب سے وکالت کی اُجرت وصول کرلی گئی یعنی جو سود قرض پر نہیں لیا جاسکا، وہ وکالت کی اُجرت بڑھا کر وصول کرلیا گیا۔(۱)

حاصل یہ کہ وکالہ فیس کو مذکورہ معاملے میں:-

۱- بل کی رقم کی تعداد کے ساتھ مربوط کرنے کی گنجائش ہے۔

۲- لیکن بل کی پختگی کی مدّت کے ساتھ مربوط کرنا جائز نہیں۔

مالیاتی دستاویزات کی تظہیر (Endorsement) کی فقہی تکییف

تظہیر کی دو قسمیں ہیں:-

تظہیر تملیکی، اور تظہیر توکیلی۔

پہلی قسم میں مظہر (Endorser) دستاویز کی قیمت کو مظہر اِلیہ (Beneficiary) کو منتقل کرتا ہے، اب اگر مظہر مظہر اِلیہ کا مدیون ہو، تو یہ حوالہ ہے، اور اگر ایسا نہ ہو، تو یہ توکیل بالقبض ہے۔

دُوسری قسم میں کلائنٹ تظہیر کے ذریعے اِدارے سے دستاویز کی قیمت وصول کرنا چاہتا ہے، یہ حوالہ نہیں، بلکہ یہ وکالہ ہے، جو جائز ہے، خواہ اُجرت کے ساتھ ہو، یا بدون اُجرت ہو۔

---

(۱) اسلام اور جدید معیشت وتجارت ص:۱۵۱۔

بنکی تحویلات (Remittances / Transfer of Money) کی شرعی تکییف

اگر کلائنٹ بنک/ اِدارہ سے کہے کہ میرے کرنٹ اکاؤنٹ سے اسی کرنسی میں فلاں شخص کو رقم بھیج دے، تو یہ حوالہ ہے، اور اس پر اِدارہ جو اُجرت لیتا ہے، وہ جائز ہے، کیونکہ یہ پہنچانے کی اُجرت ہے۔ بقیہ تفصیلات اس مسئلے کی گزشتہ ابواب میں ذِکر ہوچکی ہیں۔[1]

پرومیسری نوٹ/ اِقرارنامہ (Promissory Note)

An unconditional promise in writing made by one person to another signed by the maker engaging to pay on demand or at a fixed or determinable future time, a sum certain in money to or to the order of a specified person, or to bearer.

اِقرارنامہ ایک شخص کا اپنے دستخط کے ساتھ کسی دُوسرے شخص کے نام ایک غیرمشروط تحریری وعدہ ہوتا ہے، جس میں اِقرارنامہ تیار کرنے والا یہ وعدہ کرتا ہے کہ وہ اس میں تحریر کردہ رقم کو جب وہ طلب کی جائے یا مستقبل کی کسی مقررہ قابلِ تعین مدّت پر اسے یا اس کے حکم کے مطابق کسی دُوسرے شخص کو یا اس کے اِقرارنامے کے حامل یا قابض شخص کو اَدا کرے گا۔[2]

ایک اِقرارنامے کی لازمی شرائط یہ ہوتی ہیں:-

۱- غیرمشروط۔

۲- تحریری۔

۳- ایک خاص رقم کی ادائیگی۔

---

(۱) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: المعاییر الشرعیة بالعربیة، و Sharia Standards۔

(۲) تعارفِ زرو بنکاری ص:۲۵۸۔

۴- ادائیگی کسی مذکورہ شخص کو یا اس کے حکم پر کسی اور شخص کو یا اس کے حامل یا قابض کو۔

۵- ادائیگی مطالبے پر، یا مستقبل کی کسی قابلِ تعین تاریخ پر۔

۶- وعدہ کرنے والے کے دستخط۔

Promissory Note: a financial instrument containing an unconditional undertaking singed by the maker to pay on demand, or at a fixed or determinable time in future, a certain sum of money to the holder or to the bearer of the instrument, or to the order of a designated party.(1)

اس تعریف کا حاصل بھی وہی ہے جو اُوپر مذکور ہوا۔

حکمِ شرعی

اس نوٹ پر قبضہ اس میں درج رقم پر قبضہ نہیں لہٰذا اس کے ساتھ ان معاملات میں تعامل دُرست نہیں، جن میں قبضہ شرط ہے، مثلاً بیع صَرف میں، یا بیعِ سلم، یعنی صَرف میں اس کو بدلِ صَرف اور سلم میں اس کو رأس المال بنانا جائز نہیں۔

اسی طرح اس کو فیس ویلیو سے زیادہ پر فروخت کرنا بھی جائز نہیں، وغیرہ۔(۲)

بل آف ایکسچینج، چیک اور پرامیسری نوٹ کے آپس میں ایک دُوسرے کے ساتھ کچھ اہم فروق

چیک اور بل (Bill of Exchange) میں فرق

۱- مبادلاتی بل کسی بھی شخص کے نام جاری کیا جاسکتا ہے، جبکہ چیک صرف

---

(1) Glossary; Banking and Finance, English-English-Urdu, Shakil Faruqi Student Edition, State Bank of Pakistan, Institute of Bankers Pakistan, Lahore School of Economics.

(۲) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: المعايير الشرعية۔

متعلقہ بنک کے نام ہی جاری کیا جاسکتا ہے۔

۲- مبادلاتی بل جس کے نام جاری کیا جائے، اس کی طرف سے اس کی قبولیت ضروری ہے، جبکہ چیک میں بنک کی طرف سے قبولیت ضروری نہیں۔

۳- مبادلاتی بل کی ادائیگی مطالبے یا مستقبل کی کسی قابلِ تعین تاریخ پر ہوتی ہے، جبکہ چیک کی ادائیگی اس پر لکھی ہوئی تاریخ کے مطابق مطالبے پر ہوتی ہے۔

۴- مبادلاتی بل کراس نہیں کیا جاسکتا ہے، جبکہ چیک کو کراس کیا جاسکتا ہے۔

۵- مبادلاتی بل میں ڈسکاؤنٹ ہوسکتا ہے، جبکہ چیک میں کوئی ڈسکاؤنٹ نہیں کیا جاسکتا۔

۶- مبادلاتی بل میں درج رقم قسطوں میں ادا کی جاسکتی ہے، جبکہ چیک میں درج شدہ رقم کو قسطوں میں ادا نہیں کیا جاسکتا، وغیرہ۔

بل اور پرامیسری نوٹ میں فرق

۱- بل جب قبول کرلیا جاتا ہے، تو اس کے مرتب الیہ کی ذمہ داری ثانوی نوعیت کی رہ جاتی ہے، جبکہ پرامیسری نوٹ تیار کرنے والا اوّل مقروض ہوتا ہے، اور وہی اس کو قبول کرنے والے سے خط وکتابت کرتا ہے۔

۲- بل کسی مخصوص رقم کی ادائیگی کا ایک غیر مشروط حکم نامہ ہے، جبکہ نوٹ کسی مخصوص رقم کی ادائیگی کا ایک غیر مشروط وعدہ ہے۔

۳- بل کے لئے قبولیت درکار ہوتی ہے، جبکہ نوٹ کے لئے قبولیت درکار نہیں ہوتی، کیونکہ اِقرارنامہ رقم اَدا کرنے والا خط لکھ کر دیتا ہے۔

۴- غیر ملکی بل کے دو تین سیٹس میں بھی تیار ہوتا ہے، جبکہ اِقرارنامہ کسی سیٹ کی صورت میں تیار نہیں ہوتا۔

۵- بل کو تیار کرنے والوں کی ذمہ داری مشترکہ ہوتی ہے، جبکہ اِقرارنامہ تیار

کرنے والے مشترکہ طور پر یہ اِقرار نامے کے الفاظ کے مطابق مشترکہ یا اِنفرادی طور پر رقم کی ادائیگی کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔

۶- بل کا وسیع پیمانے پر عام لین دین ہوتا ہے، جبکہ اِقرار نامے کا محدود طور پر لین دین ہوتا ہے۔

۷- بل غیر ملکی بھی ہوسکتا ہے، جبکہ اِقرار نامہ صرف ملکی ہی ہوسکتا ہے۔

پرامیسری نوٹ اور چیک میں فرق

۱- پرامیسری نوٹ کسی مخصوص رقم کی ادائیگی کے لئے غیر مشروط وعدہ ہوتا ہے، جبکہ چیک بنک کے نام حکم نامہ ہوتا ہے۔

۲- نوٹ کے صرف دو فریق ہوتے ہیں، اِقرار کرنے والا، اور رقم پانے والا، جبکہ چیک میں تین فریق بھی ہوسکتے ہیں۔

۳- نوٹ میں ادائیگی کے لئے کوئی خاص مدّت مقرر ہوتی ہے، جبکہ چیک ہمیشہ عند الطلب واجب الاداء ہوتا ہے۔

۴- نوٹ کا اِستعمال محدود ہے، جبکہ چیک کا اِستعمال غیر محدود ہے۔

۵- نوٹ کی ادائیگی اسے بنانے والے شخص کو ہی کرنا ہوتی ہے، تاہم اسے بنانے والے اگر مشترکہ کاروبار سے وابستہ ہیں، تو ادائیگی ان کی مشترکہ ذمہ داری ہوتی ہے، جبکہ چیک کی ادائیگی صرف متعلقہ مخصوص بنک اور اس کی مخصوص شاخ سے ہی ہوسکتی ہے۔

کریڈٹ کارڈ (Credit Card)

آج کل تین قسم کے کارڈ رائج ہیں، جن کے نام درج ذیل ہیں:-

۱- کریڈٹ کارڈ

۲- ڈیبٹ کارڈ

۳- چارج کارڈ

① کریڈٹ کارڈ (Credit Card)

اس کارڈ کے حامل کا اِدارے میں کوئی اکاؤنٹ نہیں ہوتا، بلکہ وہ معاہدہ ہی اُدھار پر سودے کا کرتا ہے، اس معاہدے میں اگرچہ اِدارہ ایک متعین مدت فراہم کرتا ہے کہ جس میں اگر حاملِ کارڈ اَدائیگی کردے، تو اس کو سود اَدا نہیں کرنا پڑتا، لیکن اصلاً معاہدہ سود کی بنیاد ہی پر ہوتا ہے، اور اس کی ادائیگی کا وعدہ ہوتا ہے، اس کے علاوہ اس میں تجدیدِ مدت (Rescheduling) کی سہولت بھی موجود ہوتی ہے، جس سے ادائیگی کی مدت بڑھ جاتی ہے، البتہ اس کے ساتھ ساتھ شرحِ سود میں بھی اِضافہ ہوجاتا ہے، اور بعض صورتوں میں اِضافی رقم لی جاتی ہے۔

② ڈیبٹ کارڈ (Debit Card)

اس کارڈ کے حامل کا پہلے سے اِدارے میں اکاؤنٹ موجود ہوتا ہے، جس اِدارے کا اس نے کارڈ حاصل کیا ہے، حاملِ کارڈ یعنی کارڈ ہولڈر اس کارڈ کو جب بھی استعمال کرتا ہے، اِدارہ اس کے اکاؤنٹ میں موجود رقم سے اس کی ادائیگی کردیتا ہے، اس میں کارڈ ہولڈر کو اُدھار کی سہولت حاصل نہیں ہوتی ہے، بلکہ وہ صرف اس وقت تک کارڈ کو اِستعمال کرسکتا ہے، جب تک اس کے اکاؤنٹ میں رقم موجود رہتی ہے۔

اِدارہ اس کارڈ کو جاری کرنے کی فیس وصول کرتا ہے۔

③ چارج کارڈ (Charge Card)

اس کارڈ کے حامل کا پہلے سے اِدارے میں اکاؤنٹ نہیں ہوتا ہے، بلکہ اِدارہ کارڈ ہولڈر کو اُدھار کی سہولت فراہم کرتا ہے، کارڈ ہولڈر کو ایک متعین ایام کی اُدھار کی سہولت میسر ہوتی ہے، جس میں اس کو اِدارے کو اَدائیگی کرنا ضروری ہوتا ہے، اگر اس مدت میں ادائیگی ہوجائے، تو سود نہیں لگتا، البتہ اگر حاملِ کارڈ نے وقت پر اَدائیگی نہ کی، تو پھر اس کو سود کے ساتھ ادائیگی کرنا پڑتی ہے۔

اِدارہ اس کارڈ کو جاری کرنے کی فیس وصول کرتا ہے۔

شرعی اَحکام

ڈیبٹ کارڈ کا شرعی حکم

اس کارڈ کو اِستعمال کرنا بلاشبہ جائز ہے، اور اس کے ذریعے خرید وفروخت کرنا دُرست ہے، کیونکہ اس میں نہ قرض کی صورت ہے، نہ سود کی، البتہ کارڈ ہولڈر کی یہ ذمہ داری ہوگی کہ وہ اس کارڈ کو غیر شرعی اُمور میں اِستعمال نہ کرے۔

چارج کارڈ کا شرعی حکم

اس کارڈ کو مندرجہ ذیل شرائط کے ساتھ اِستعمال کرنا جائز ہے:-

۱- حاملِ کارڈ اس بات کا پورا اِنتظام کرے کہ وہ معین مدّت سے پہلے پہلے ادائیگی کردے اور کسی بھی وقت سود عائد ہونے کا کوئی اِمکان باقی نہ رہے۔

۲- حاملِ کارڈ کی یہ ذمہ داری ہو کہ اس کارڈ کو غیر شرعی اُمور میں اِستعمال نہ کرے۔

۳- اگر ضرورت ڈیبٹ کارڈ سے پوری ہو رہی ہو، تو بہتر ہے کہ اس کارڈ کو اِستعمال نہ کرے۔

کریڈٹ کارڈ کا شرعی حکم

اس کارڈ کا اِستعمال جائز نہیں، اِلَّا یہ کہ ڈیبٹ کارڈ یا چارج کارڈ الگ سے مہیا نہ ہو، اور اس کو ڈیبٹ کارڈ یا چارج کارڈ کی طرح مذکورہ بالا شرائط کے ساتھ اِستعمال کیا جائے۔

ان تمام کارڈز کو کریڈٹ کارڈ کہا جاتا ہے، لیکن اصلاً کریڈٹ کارڈ وہی ہے جس کی تفصیل اُوپر مذکور ہوئی، اور اس کا اِستعمال اصلاً جائز نہیں، البتہ کریڈٹ کارڈ کا اِطلاق مذکورہ بالا دو قسموں پر کیا جائے، تو ان کا اِستعمال جائز ہے۔

اے ٹی ایم کارڈ (Automated Transfer Machine (ATM

یہ رقم نکالنے کا کارڈ ہوتا ہے، اور آج کل بہت عام ہو چکا ہے، اس کے ذریعے بنک سے رقم نکالی جاتی ہے، جیسا کہ ظاہر ہے۔

اس کارڈ کا شرعی حکم یہ ہے کہ اس کارڈ کو اِستعمال کرنے پر اگر متعین رقم مشین کے اِستعمال کی اُجرت کے طور پر اِدارہ وصول کرے، جو مقدارِ رقم سے قطع نظر ہو، تو یہ جائز ہے، لیکن اگر اِدارہ رقم کو بنیاد بنا کر اس پر کچھ وصول کرے، تو یہ جائز نہیں بلکہ سود ہوگا، البتہ اِدارہ کارڈ جاری کرنے کی فیس وصول کر سکتا ہے۔

فی المعايير الشرعية: بطاقة الحسم الفوری (Debit Card) تصدر هذه البطاقة من المؤسسة لمن له رصيد فی حسابه، تخول هذه البطاقة لحاملها السحب او تسديد اثمان السلع والخدمات بقدر رصيده المتاح، ويتم الحسم منه فورًا، ولا تخوله الحصول علی ائتمان، لا يتحمل العميل رسومًا مقابل استخدامه هذه البطاقة غالبًا إلّا فی حال سحب العميل نقدًا أو شراءه عملة أخریٰ عن طريق مؤسسة أخریٰ غير المؤسسة المصدرة للبطاقة، تصدر هذه البطاقة برسم أو بدونه، تتقاضی بعض المؤسسات من قابل البطاقة نسبة من اثمان المشتريات أو الخدمات۔

بطاقة الائتمان والحسم الآجل (Charge Card): هذه البطاقة اداة ائتمان فی حدود سقف معين لفترة محددة وهی اداة وفاء أيضًا، تستعمل هذه البطاقة فی تسديد اثمان السلع والخدمات وفی الحصول علی النقد، لا يتيح

نظام هذه البطاقة تسهيلات ائتمانية متجددة لحاملها حيث يتعين عليه المبادرة بسداد ثمن مشترياته خلال الفترة المحددة عند تسلمه الكشوف المرسلة إليه من المؤسسة، إذا تأخر حامل البطاقة فى تسديد ما عليه بعد الفترة المسموح بها يترتب عليه فوائد ربوية اما المؤسسات فلا تترتب فوائد ربوية، لا تتقاضى المؤسسة المصدرة للبطاقة اية نسبة من حامل البطاقة على المشتريات والخدمات ولكنها تحصل علىٰ نسبة معينة (عمولة) من قابل البطاقة علىٰ مبيعاته أو خدماته التى تمت بالبطاقة۔ تلتزم المؤسسة فى حدود سقف الائتمان (وبالزيادة الموافق عليها) للجهة القابلة للبطاقة بسداد اثمان السلع والخدمات وهذا الإلتزام بتسديد اثمان المبيعات والخدمات شخصى ومباشر بعيدًا عن علاقة الجهة القابلة للبطاقة بحامل البطاقة، للمؤسسة المصدرة للبطاقة حق شخصى ومباشر قبل حامل البطاقة فى استرداد ما دفعته عنه وحقها فى ذلك حق مجرد ومستقل عن العلاقة الناشئة بين حامل البطاقة والجهة القابلة لها بموجب العقد المبرم بينهما۔

بطاقة الائتمان المتجدد (Credit Card): هذه البطاقة اداة ائتمان فى حدود سقف متجدد علىٰ فترات يحددها مصدر البطاقة وهى اداة وفاء أيضًا، يستطيع حاملها تسديد ائتمان السلع والخدمات والسحب نقدًا فى حدود

سقف الائتمان الممنوح، في حالة الشراء للسلع أو الحصول على الخدمات يمنح حاملها فترة سماح يسدد خلالها المستحق عليه بدون فوائد، كما تسمح له تأجيل السداد خلال فترة محددة مع ترتب فوائد عليه، اما في حالة السحب النقدی فلا يمنح حاملها فترة سماح، ينطبق علىٰ هٰذه البطاقة ما جاء في البند ۲/۲هـ و، ز۔

الحكم الشرعي لأنواع البطاقات: بطاقة الحسم الفوری: يجوز للمؤسسات إصدار بطاقة الحسم الفوری ما دام حاملها يسحب من رصيده ولا يترتب على التعامل بها فائدة ربوية۔ بطاقة الائتمان والحسم الآجل: يجوز إصدارها بالشروط الآتية:

الا يشترط علىٰ حامل البطاقة فوائد ربوية في حال تأخره عن سداد المبالغ المستحقة عليه۔

في حالة الزام المؤسسة حامل البطاقة بايداع مبلغ نقدی ضماناً لا يمكن لحامل البطاقة التصرف فيه يجب النص علىٰ انها تستثمره لصالحه علىٰ وجه المضاربة مع اقتسام الربح بينه وبين المؤسسة بحسب النسبة المحددة۔

ان لا يشترط المؤسسة علىٰ حامل البطاقة عدم التعامل بها فيما حرمته الشريعة وانه يحق للمؤسسة سحب البطاقة في تلك الحالة۔

بطاقة الائتمان المتجدد: لا يجوز للمؤسسات إصدار بطاقات الائتمان ذات الدين المتجدد الذی يسدده

حامل البطاقة علیٰ اقساط آجلة بفوائد ربوية۔[1]

بنک ڈرافٹ (Bank Draft)

A bill of exchange payable on demand, usually drawn by one bank on another or by on branch on another, a popular means of transfer of funds.

یہ ایک بل ہے جو طلب کرنے پر واجب الاداء ہوتا ہے، جو بالعموم ایک بنک سے دُوسرے بنک کو یا ایک شاخ سے دُوسری شاخ کو واجب الاداء ہوتی ہے، یہ رُقوم منتقل کرنے کا ایک مقبول عام طریقہ ہے۔[2]

آگروال بنک ڈرافٹ کی یوں تعریف کر رہے ہیں:-

A bank draft is a cheque drawn by one bank upon another bank or its own branch situated at a different place, requiring it to pay a certain sum of money to a specified person or to his order to the bearer. A bank draft may be inland or foreign. Usually persons who have to make payment to distant creditors go to their bank to obtain a bank draft. They have to deposit with the bankers the amount to be remitted a small commissions. Draft is then issued which is sent to the creditor concerned who gets it encashed.

اس تعریف کا حاصل بھی تقریباً وہی ہے، جو اُوپر مذکور ہوا، البتہ اس میں یہ بھی مذکور ہے کہ بنک ڈرافٹ اندرون ملک بھی ہوسکتا ہے، اور بیرون ملک بھی ہوسکتا ہے، اور

---

(۱) المعایير الشرعية، هيئة المحاسبة والمراجعة للمؤسسات المالية الإسلامية ۱۴۲۴ھ مذکورہ تفصیل اگر انگریزی میں جاننا ہے، تو اس کے لئے Sharia Standards کا مطالعہ فرمائیں، جو بہت مفید ہے۔

(۲) Glossary; Banking and finance, English-English-Urdu, Shakil Faruqi Student Edition, State Bank of Pakistan, Institute of Bankers.

اس پر کمیشن بھی وصول کیا جاتا ہے۔[1]

پے آرڈر (Pay Order)

It is a cheque like instruments issued by bank on the request of its customers or in payment of its own expenses or dues, drawn on itself, to pay a specified sum of money to the order of specified person. Payment orders are usually issued by the banks on receipt of full amounts involved, which means that it would not be returned unpaid due to lack of funds, it is also called Bankers Cheques or Cashiers Cheques.

یہ چیک کی طرح آلہ ہے جو بنک سے اس کے گاہکوں کی درخواست پر یا اس کے اپنے اخراجات یا بقایاجات کے لئے خود اس پر جاری کئے جائیں، تاکہ ایک معینہ رقم مذکورہ شخص کو ادا کی جائے، ادائیگی کے احکامات عام طور پر بینکوں کی جانب سے پوری متعلقہ رقم وصول ہوجانے کے بعد ہی جاری کئے جاتے ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ فنڈ کی کمی کے عذر پر بغیر ادا کئے واپس نہ کردیئے جائیں، انہیں بینکاروں کے چیک یا کیشئرز چیک بھی کہا جاتا ہے۔[2]

بنک ڈرافٹ اور پے آرڈر میں شرعی نقطۂ نظر سے کوئی خاص پیچیدگی نہیں، البتہ بنک ان دونوں پر حق الخدمت وصول کرتا ہے، جو شرعاً جائز ہے۔

بانڈ (Bond)

Bond is an interest bearing government or corporate security, obligating the bond issuer under an agreement called bond indenture to pay

(۱) Intrudaction to Economic Principles. Dr. A.N.Agarwal. p:352.

(۲) Glossary; Banking and finance, English-English-Urdu, Shakil Faruqi Student Edition, State Bank of Pakistan, Institute of Bankers Pakistan, Lahore School of Economics.

the bond holder a principal amount on the date of maturity and periodic payment of interest over the life of the bond, bonds are long term debt instrument and are a preferred mode of raising long term funds without selling shares, bon enables the bond issuer to convert non liquid or less liquid assets into marketable instruments, the market value, or the price of the bond in the market differs from the face value or hepar value of the bond at the maturity by a discount factor based primarily on the current interest rate and the bond rating generally, if interest rate rises bond price fall and vice versa.

بانڈ، یہ حکومت یا کسی مشترکہ کمپنی کا ایک سودی تمسک ہے، جو بانڈ کے اجراء کرنے والے کو اس معاہدے کے تحت، جسے بانڈ کا اقرارنامہ کہا جاتا ہے، پابند کرتا ہے کہ وہ حامل بانڈ پختگی کی تاریخ پر اس کی اصل رقم واپس کرے، اور بانڈ کی زندگی تک عرصہ دار سود کی ادائیگی کرے۔ بانڈ قرض حاصل کرنے کا طویل مدتی آلہ ہے، اور حصص کو فروخت کئے بغیر طویل مدتی فنڈ حاصل کرنے کا ایک ترجیحی طریقہ ہے، یہ غیر سیال یا کم سیال اثاثوں کو قابلِ فروخت آلات میں تبدیل کرنے کا ایک ذریعہ بھی ہے، بازار کی مالیت یا بازار میں قیمت میچورٹی کے لحاظ سے اس کی فیس ویلیو سے مختلف ہوتی ہے، اس کی وجہ بٹہ وہ عنصر ہے جو خاص طور پر سود کی موجودہ شرح اور بانڈ کی درجہ بندی پر مبنی ہوتا ہے، عام طور پر اگر سود بڑھ جائے، تو بانڈ کی قیمتیں گرنے لگتی ہیں، یا دُوسری صورت اس کے برعکس ہوتی ہے۔ (1)

(1) Glossary; Banking and finance, English-English-Urdu, Shakil Faruqi Student Edition, State Bank of Pakistan, Institute of Bankers Pakistan, Lahore School of Economics.

مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب بانڈ کی تعریف اور حقیقت یوں بیان فرماتے ہیں:-

السند (Bond) فی الإصطلاح المعاصر وثیقة یصدرها المدیون لمقرضه إعترافًا منه بأنه استقرض من حاملها مبلغًا معلومًا یتلزم بأداءه فی وقت معلوم وإن هٰذه السندات تصدرها عادة لعرضها علی الجمهور لیحصلوا علیها بأداء المبلغ المکتوب علیٰ وجهها حتّٰی یصیروا مقرضین ذٰلك المبلغ لمصدر السند وان هٰذه السندات ربما تصدرها الشرکات المساهمة التجاریة أو الصناعیة حینما تحتاج إلی اقتراض مبالغ کبیرة من المال لإنجاز مشاریعها ولا تجد أفرادًا أو مؤسسات تقرضها الأموال بالحجم المطلوب، فتعرض هٰذه السندات علی الجمهور وربما تصدر هٰذه السندات من قِبل الحکومات التی ترید ان تمول عجز میزانیتها فتقترض من الجمهور وان هٰذه السندات سواء اصدرتها الشرکات او اصدرتها الحکومة إنما تلتزم بأداء فوائد ربویة إلیٰ من یحملها فالسند الذی قیمته الإسمیة مائة روبیة مثلًا تستحق ان یدفع لحاملها مائة وخمس عشرة بعد سنة، ویحق له ان یبیع هٰذا السند فی السوق وإنها تباع وتشتری بثمن یتراضی علیه الفریقان فمن حصل علیٰ هٰذا السند بمائة فإنه یبیعه إلیٰ آخر بمائة وخمسة ویشتریه ذٰلك الآخر بهٰذا الثمن لأنه یرجو أن یحصل علیٰ مائة وخمس عشرة روبیة فی نهایة المدّة۔

وهناك سندات أُخرىٰ تصدر من قِبل الحكومة وتعرض عادة على البنوك والمؤسسات المالية الأُخرىٰ، وتسمى سندات الخزينة ومقصود هٰذه السندات نفس المقصد الذى من اجله تصدر السندات الحكومية الأُخرىٰ، غير ان هٰذه السندات تعرض على البنوك لتشتريها علىٰ أساس المزايدة، فالسند الذى قيمته الف روبية مثلًا يتضمن التزام الحكومة بأداء ألف روبية إلىٰ حامله عند حلول أجله فتجرى فى شراءه المزايدة فيما بين البنوك وتأتى العروض من قبلها الى البنك المركزى فتباع هٰذه السندات إلىٰ من عرضه اكثر، ومعنى بيع هٰذه السندات ان مشتريها اقرض مبلغ الثمن إلى الحكومة واستحق من خلال هٰذا الإقراض أن يحصل علىٰ قيمة السند الإسمية عند حلول الأجل۔[1]

اس عبارت کا حاصل یہ ہے کہ:-

۱- بانڈ آج کل کی اِصطلاح میں اس سند کو کہتے ہیں، جس کو مقروض جاری کرتا ہے اس اعتراف میں کہ اس نے اس کے حامل سے متعین رقم بطور قرض لی ہے۔

۲- یہ بانڈز عام طور پر عوام پر پیش کئے جاتے ہیں، تاکہ عوام ان کو خریدیں اس قیمت پر جو ان پر لکھی ہوئی ہے، تو گویا کہ انہوں نے یہ قیمت جاری کنندہ کو قرض کے طور پر دی۔

۳- یہ بانڈز بسا اوقات کمپنیوں کی طرف سے جاری ہوتے ہیں، جن کو بڑی

(۱) بحوث فى قضايا فقهية معاصرة، العثمانى، (محمد تقى العثمانى) كراتشى، مكتبه دارالعلوم كراتشى، طبع جديد ۱۴۲۶ھ۔

رُقوم کی ضرورت ہوتی ہے۔

۴-بعض اوقات حکومت بھی ان بانڈز کو اپنے بجٹ کے خسارے کو پورا کرنے کے لئے جاری کرتی ہیں۔

۵-بانڈز خواہ کمپنی جاری کرے یا حکومت جاری کرے، ان پر حاملین کو سود دِیا جاتا ہے۔

۶-بانڈز قابلِ تبادلہ آلہ ہے، مارکیٹ میں اس کی خرید وفروخت ہوتی ہے کمی بیشی کے ساتھ۔

۷-حکومت ایک خاص قسم کے بانڈز بھی جاری کرتی ہے، جن کو سندات الخزینہ (Treasury Bills) کہتے ہیں، یہ بانڈز بنکوں اور دیگر مالیاتی اِداروں پر پیش کئے جاتے ہیں، ان کا مقصد بھی وہی ہوتا ہے جو عام بانڈز کا ہوتا ہے، البتہ یہ بنکوں پر پیش کئے جاتے ہیں، اور پھر بنک آپس میں ان کا لین دین کرتے ہیں۔

کمپنیوں کے بانڈز

بانڈ کی تعریف اور حقیقت میں یہ بات ابھی مذکور ہوئی ہے کہ بانڈز کو بعض اوقات کمپنیاں جاری کرتی ہیں، جن کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ کمپنیوں کے پاس سیال اثاثہ کم ہوتا ہے، تو ان کو منصوبوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے رقم کی ضرورت ہُوتی ہے، اور ویسے کوئی ان کو قرض یا رقم دیتا نہیں، تو وہ یہ بانڈز جاری کرکے ان کے ذریعے عوام سے قرض وصول کرتی ہیں۔

کمپنیاں جو بانڈز جاری کرتی ہیں، ان کی بہت ساری قسمیں ہیں، یہاں تفصیل کی گنجائش نہیں۔ تفصیل کے لئے درج ذیل کتابیں ملاحظہ ہوں:-

المعاملات المالية المعاصرة فی الفقه الإسلامی: ڈاکٹر محمد عثمان شبیر

احکام الأسواق المالية: الدکتور صبری ہارون

گلوسری: اسٹیٹ بنک آف پاکستان

قابلِ تحویل بانڈز (Bonds Convertible into Shares)

بانڈز کی دو قسمیں ہیں:-

۱ غیر قابلِ تحویل بانڈز (Non.Convertible into Shares) اور

۲ قابلِ تحویل بانڈز۔

اصل یہ ہے کہ بانڈز قابلِ تحویل نہ ہوں، لیکن بعض اوقات بانڈز قابلِ تحویل بھی ہوتے ہیں، جن کے بارے میں باقاعدہ جاری کرنے کے عقد میں تصریح کی جاتی ہے کہ ان کے حامل کو یہ حق حاصل ہے کہ اتنی مدت کے اندر اندر وہ ان بانڈز کو عام حصص یا حصص ممتاز میں تبدیل کرے، اسی طرح یہ بانڈز دوسری مالی دستاویزات میں بھی تبدیل ہو سکتے ہیں۔

قابلِ تحویل بانڈز کے بارے میں گلوسری اسٹیٹ بنک آف پاکستان میں بہت اچھی بحث ہے، جو درج ذیل ہے:-

A bond that can be converted into a common stock at a conversion ratio specified at the time of bond issue, it has all the factors of a regular hond, namely the par value, the coupon rate, maturity period thc interest paymcnt period, but additionally, the band issuer pays dividend and offers the option to the invcstor to convert the bond into a number of common stocks as per conversion ratio of the conversion price of the stock, as a result the market pricc of the bond is affected both by the interest rate movements as cell stock market movements, the cost of conversion option is usually gauged by the premium paid for the bond in the secondary market trading, convertible bonds proved a potential gain to the investor if the bond price goes up, while at the samc time offcr an attractive bond yicld, specially for corporate bond whose price is likely to materially increase ovcr the maturity period, the market value of thc option attached to

convertible bond is zero or insignificant at the time bond stars selling initially in the secondary market, but the value of the option increases as the bond price clibs up, it is also possible that bond price bay fall instead of rising with disastrous consequences for the option holder, therefore convertible bond can also be risky in addition to being potentially rewarding.

یہ وہ بانڈز ہیں جنہیں عام حصص میں تبدیل کیا جا سکے، اور تبدیل کے اس تناسب سے جس کی صراحت بانڈ کے اِجراء کے وقت کی گئی ہو، اس میں وہ تمام فیچرز ہوتے ہیں، جو کسی باضابطہ بانڈز میں ملتے ہیں، جیسے مساوی مالیت، کوپن شرح، میچر ٹی، عرصہ دار اور سودی ادائیگی، لیکن اس کے علاوہ بانڈ کا جاری کنندہ نفع ادا کرتا ہے، اور سرمایہ کار کو اِختیار دیتا ہے کہ وہ بانڈ کو عام حصص کی ایک تعداد میں تبدیلی کے تناسب سے یا تبدیلی کی قیمت پر بدلوا سکتے ہیں، اس وجہ سے قابلِ تحویل بانڈ کی بازاری قیمت شرحِ سود کے علاوہ اسٹاک مارکیٹ کے اُتار چڑھاؤ سے بھی متأثر ہوتی ہے، تبدیل کے اس اِختیار کی لاگت کا اندازہ اس پریمیم سے کیا جا سکتا ہے جو کہ بانڈ کی ثانوی بازار میں اُجرت پر دینا پڑے، قابلِ تحویل اس کے سرمایہ کار کو ایک اِحتمالی نفع پہنچاتے ہیں، اگر اس کے اسٹاک مارکیٹ کی قیمت بانڈ کی میچر ٹی میں اضافہ ہوا، اور ساتھ ہی ساتھ ایک پُرکشش بانڈ کا نفع بھی، خاص طور پر ان کارپوریشنوں کے ضمن میں جن کے اسٹاک مارکیٹ کی قیمت میں خاطر خواہ اِضافے کا اِمکان ہو، کسی قابلِ تحویل بانڈ سے منسلک اس آپشن کی بازاری قیمت یا تو صفر ہوتی ہے، یا برائے نام، اس کی ثانوی بازار میں تجارت شروع ہوتے وقت آپشن کی مالیت

میں اس کی اسٹاک مارکیٹ کی قیمت بڑھنے پر اضافہ ہونا شروع ہوجاتے ہیں، لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ اسٹاک مارکیٹ کی قیمت کے بجائے اضافے کے کمی ہو، جس کے بانڈ کی مالیت پر تباہ کن اثرات بھی ہوسکتے ہیں، اس لئے قابلِ تحویل بانڈ اِحتمالی طور پر پُرخطر بھی ہوسکتا ہے، یا نفع بخش بھی ہوسکتا ہے۔(۱)

سرکاری بانڈز

بانڈ کی تعریف اور حقیقت میں یہ بات ابھی مذکور ہوئی ہے کہ بانڈز کو بعض اوقات حکومت جاری کرتی ہے، جن کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ حکومت کے پاس سیال اثاثہ کم ہوتا ہے، تو اس کو بجٹ کے خسارے کے لئے رقم کی ضرورت ہوتی ہے، اور ویسے کوئی ان کو قرض یا رقم دیتا نہیں، تو وہ یہ بانڈز جاری کرکے ان کے ذریعے عوام سے قرض وصول کرتی ہے۔

سرکاری بانڈز بھی تقریباً کمپنیوں یا سادہ بانڈز کی طرح ہوتے ہیں، اور ان کے وہی فیچر ہوتے ہیں، جو عام بانڈز کے ہوتے ہیں، البتہ یہ کہ سرکاری بانڈز دُوسرے بانڈز کے مقابلے میں زیادہ قابلِ اِعتماد ہوتے ہیں، اور ان میں رِسک نسبتاً کم ہوتا ہے۔

سرکاری بانڈز کی نمایاں قسمیں

سرکاری بانڈز کی نمایاں قسمیں درج ذیل ہیں:-

۱-سندات الخزینہ (Treasury Bills)

۲-شہادات الخزانہ (Treasary Certificates)

۳-سندات البلدیہ (Minucipal Bonds)

(۱) Glossary; Banking and finance, English-English-Urdu, Shakil Faruqi Student Edition, State Bank of Pakistan, Institute of Bankers Pakistan, Lahore School of Economics.

بانڈز کا حکمِ شرعی

بانڈز کی اور بھی بہت ساری قسمیں ہیں، جن سے یہاں بحث کرنا مقصود نہیں، گزشتہ صفحات میں ہم نے جن کتابوں کا ذِکر کیا ہے، تفصیل کے لئے ان کتابوں کا مطالعہ فرمائیں، تاہم بانڈ خواہ کسی بھی قسم کا ہو، یہ سودی ہوتا ہے، اور اس کا لینا قیمتِ اسمیہ کے علاوہ کمی بیشی کے ساتھ ناجائز ہے، نیز اس پر اِنعام کے نام سے جو اِضافی رقم ملتی ہے، وہ بھی سود ہے، اور ناجائز ہے، جسے حاصل کرنا جائز نہیں۔ یہی جمہور علمائے اُمت کا موقف ہے، اور یہی دُرست موقف ہے، مجمع الفقہ الاسلام جدہ کی قرارداد اور دیگر بعض عبارات ذیل میں ملاحظہ ہوں:-

مجمع الفقه الإسلامي جدة کی قرارداد

ان مجلس مجمع الفقه الإسلامي المنعقد في دورة مؤتمر السادس بجدة في المملكة العربية السعودية من ١٧ إلىٰ ٢٣ شعبان ١٤١٠هـ الموافق ١٤-٢٠ آزار (مارس) ١٩٩٠م۔

بعد اطلاعه على الابحاث والتوصيات والنتائج المقدمة في ندوة الأسواق المالية المنعقدة في الرباط ٢٠-٢٤ ربيع الثاني ١٤١٠هـ، ٢٠-١٠/٢٤/١٩٨٩م بالتعاون بين هٰذا المجمع والمعهد الإسلامي للبحوث والتدريب بالبنك الإسلامي للتنمية وباستضافة وزارة الأوقاف والشؤون الإسلامية بالمملكة الغربية۔

وبعد الاطلاع علىٰ ان السند شهادة يلتزم المصدر بموجبها ان يدفع لحاملها القيمة الإسمية عند الإستحقاق

مع دفع فائدة متفق عليها منسوبة إلى القيمة الإسمية للسند أو ترتيب نفع مشروط سواء كان جوائز توزع بالقرعة أم مبلغًا مقطوعًا ام خصمًا قرر:-

١- ان السندات التى تمثل التزاما بدفع مبلغها مع فائدة منسوبة إليه أو نفع مشروط محرمة شرعًا من حيث الإصدار والشراء والتداول لأنها قروض ربوية سواء كانت الجهة المصدرة لها خاصة أو عامة ترتبط بالدولة ولا اثر تسميتها شهادات أو صكوكا استثمارية أو ادخارية أو تسمية الفائدة الربوية الملتزم بها ربحا او ربعا او عمولة او عائدا۔

٢- كما تحرم ايضًا السندات ذات الجوائز باعتبارها قروضًا اشترط فيها نفع أو زيادة بالنسبة لمجموع المقرضين أو لبعضهم لا على التعيين فضلًا عن شبهة القمار۔

مجمع الفقه الإسلامي جدة (اسلامک فقہ اکیڈمک جدہ) کی اس قرارداد کا حاصل یہ ہے کہ بانڈز خواہ کسی بھی قسم کے ہوں، وہ چونکہ سودی قرضوں کی نمائندگی کرتے ہیں، اس لئے ان کے ساتھ لین دین کرنا، یا ان پر انعام حاصل کرنا بالکل حرام ہے، نیز ان میں بعض صورتوں میں شبہ قمار بھی ہے۔(١)

ذهب غالبية العلماء المعاصرين إلىٰ عدم جواز تعامل بالسندات وشهادات الإستثمار دون تفريق بين أنواعها

(١) مجلة مجمع الفقه الإسلامي الدورة السادسة، العدد السادس، الجزء الثاني ص:١٧٢٥ قرار رقم ٦٢/١١/٦۔

ومن هؤلاء الشيخ الشلتوت، والدكتور عبدالعزيز الخياط والدكتور علي السالوس والدكتور صالح المرزوقي ...... والدكتور يوسف القرضاوي، لأن السند قرض على الشركة والمؤسسة التي اصدرته لأجل فائدة مشروطة وثابتة فهو من ربا النسيئة الذي نزل بحرمته القرآن الكريم ...الخ۔

اکثر علمائے معاصرین کا موقف یہ ہے کہ بانڈز اور سرٹیفکیٹ کے ساتھ لین دین ناجائز ہے، خواہ کسی بھی قسم کے ہوں، ان میں سے شیخ شلتوت، ڈاکٹر محمد یوسف موسیٰ، ڈاکٹر یوسف قرضاوی، ڈاکٹر عبدالعزیز الخیاط، ڈاکٹر علی السالوس، ڈاکٹر صالح المرزوقی بھی ہیں، کیونکہ بانڈ کمپنی یا اِدارے کے ذمہ قرض ہے جس نے اس کو جاری کیا ہے، اور اس پر مشروط نفع ملتا ہے، لہٰذا یہ رِبا النسیئہ میں سے ہے، جس کو قرآنِ کریم نے حرام قرار دِیا ہے۔[1]

ان هذه السندات كلها ربوية من اصلها حيث أن المقرض يلتزم فيها باداء مبلغ القرض وزيادة فلا يخفى حرمة تداولها لأنها تؤدي إلىٰ تعامل ربوي حرام ....الخ۔

یہ سارے بانڈز اَصلاً سودی ہیں، کیونکہ ان میں مقرض یہ اِلتزام کرتا ہے کہ وہ بانڈ کی رقم اور کچھ اِضافہ دے گا، اور اس لین دین کا حرام ہونا ظاہر ہے، کیونکہ یہ ربوی معاملہ ہے۔[2]

---

(۱) المعاملات المالية المعاصرة في الفقه الإسلامي، (شبير) محمد عثماني شبير، اُردن، دار النفائس، طبع ثالث ۱۴۱۹ھ۔

(۲) بحوث في قضايا فقهية معاصرة، العثماني (محمد تقي العثماني) كراتشي، مكتبه دارالعلوم كراتشي، طبع جديد ۱۴۲۶ھ۔

سرٹیفکیٹس

ان سندات القروض صکوک تمثل قروضا تحصل علیها الشرکة من عامة الناس علیٰ اساس الفائدة الربوية المحددة وتکون هٰذه الصکوك فی التعامل المعاصر قابلة للتداول وغیر قابلة للتجزئة۔

وإنما تضطر الشرکات فی بعض الأحیان إلیٰ اصدار هٰذه السندات لأنها قد تحتاج فی اثناء مزوالة اعمالها إلیٰ مبالغ اکثر مما حصلت علیه عن طریق اصدار الأسهم لتزید من قدراتها علیٰ انجاز مشاریعها والتوسع فیها او لتواجه ازمة مالیة طرأت علیها ولا ترغب الشرکة فی عرض اکتتاب بالأسهم الجدیدة علی الجمهور لئلا تتضائل انصبة الشرکاء فتضطر إلیٰ أن تقترض هٰذه المبالغ ممن یمکن الإقتراض منه۔

وفی جانب آخر تکون عند الناس مبالغ افروزوها من حاجاتهم الیومیة ورصدوها لحاجاتهم المتوقعة فی المستقبل وان هٰذه المبالغ فی بیوت أصحابها أو فی حسابهم الجاری فی البنوك فلا یمکن ان تستغل هٰذه المبالغ لصالح الوطنی الا بان تدفع المنتجین أو التجار قرضًا فیستعملونها فی اعمالهم الإنتاجیة أو التجاریة فجاءت فکرة إصدار سندات ......الخ۔

قرضوں کے سرٹیفکیٹس ایسے صکوک ہیں، جو قرضوں کی نمائندگی کرتے ہیں، جن کو کمپنیاں عام لوگوں سے ایک متعین سودی فائدے

کی بنیاد پر حاصل کرتی ہے، یہ صکوک آج کے لین دین میں قابلِ تداول ہیں، یعنی قابلِ خرید وفروخت ہیں، اور قابلِ تجزی نہیں ہیں۔
بعض اوقات کمپنیاں مجبور ہوجاتی ہیں کہ یہ صکوک جاری کریں، کیونکہ اپنے منصوبوں کی تکمیل کی انجام دہی کے سلسلے میں ان کو فنڈ کی ضرورت ہوتی ہے، حصص سے جو فنڈ حاصل ہوتا ہے، وہ ناکافی ہوتا ہے، یا بعض اوقات مالی بحران سے یہ کمپنیاں دوچار ہوجاتی ہیں، اور یہ نہیں چاہتیں کہ مزید حصص کی پیش کش کریں، کیونکہ اس سے شیئر ہولڈرز کے حصص کم ہوجائیں گے، تو وہ یہ طریقہ اِختیار کرتی ہیں۔
دُوسری طرف اکثر لوگوں کے پاس بچتیں ہوتی ہیں، یہ بچتیں یا ان کے گھروں میں رکھی ہوئی ہوتی ہیں، یا پھر کرنٹ اکاؤنٹ میں ہوتی ہیں، لہٰذا ان سے ان کو کچھ نفع نہیں ملتا، البتہ نفع کی صورت یہ ہے کہ وہ یہ بچتیں تاجروں کو یا صنعت کاروں کو دے دیں، اس طریقے سے ان کو بھی نفع حاصل ہوجائے گا، اور تاجروں اور صنعت کاروں کو بھی فائدہ ہوگا، یہیں سے ان سرٹیفکیٹس کا تصور اُجاگر ہوگیا۔

اس کا حاصل یہی نکلتا ہے کہ سرٹیفکیٹس بھی بانڈز کی طرح سودی صکوک ہیں، اور ان کے ذریعے عام لوگوں سے سودی قرضہ وصول کیا جاتا ہے، جس میں کمپنیوں کا بھی فائدہ ہے کہ ان کو ان کے ذریعے سودی قرضہ مل جاتا ہے، اور لوگوں کا بھی فائدہ ہے کہ ان کو اپنی بچتوں پر کچھ نفع مل جاتا ہے۔

اسی لئے مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب ان صکوک کے حکم کے اور ان کے شرعی متبادل کے بارے میں فرماتے ہیں:-

ولکن ھٰذا الطریق مبنی علیٰ اساس القرض الربوی الذی لا تبیحہ الشریعۃ الإسلامیۃ فی حال من الأحوال

ومن هنا أراد بعض المسلمين في البلاد الإسلامية أن يأتوا ببديل لهٰذه السندات في شكل سندات المقارضة (مضاربة) الخ۔

لیکن یہ طریقہ اس سودی قرض پر مبنی ہے، جس کو شریعت جائز قرار نہیں دیتی کسی بھی حال میں، اس لئے بعض مسلمانوں نے بعض بلادِ اسلامیہ میں ان صکوک کے شرعی متبادل کے طور پر ''سندات المقارضہ'' یعنی مضاربہ سرٹیفکیٹس نکالے۔[1]

چنانچہ بانڈز اور سرٹیفکیٹس کا شرعی متبادل یہی صکوکِ مشارکہ اور صکوکِ مضاربہ ہیں، یعنی مشارکہ سرٹیفکیٹس اور مضاربہ سرٹیفکیٹس، جو ان سرٹیفکیٹس کو خریدے گا، گویا کہ وہ حکومت یا کمپنی کے ساتھ شریک ہوگا، یا ربّ المال ہوگا، یعنی یہاں مشارکہ اور مضاربہ کے اَحکام جاری ہوں گے، اور نفع شرعی اُصولوں کے مطابق تقسیم ہوگا۔

ان صکوک پر مجلّہ مجمع الفقہ الاسلامی الدورۃ الرابعۃ، العدد الرابع، الجزء الثالث میں سیر حاصل بحث کی گئی ہے، اور متعدد متبحر علمائے کرام نے اس موضوع پر اپنے اپنے مقالے پیش کئے ہیں، نیز مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب نے اپنی مشہور عربی تصنیف ''بحوث'' میں بھی اس پر بقدرِ ضرورت گفتگو فرمائی ہے، جس کا حوالہ اس باب میں جگہ جگہ حاشیہ میں دیا گیا ہے۔

گورنمنٹ سیکیورٹی سرٹیفکیٹس

ان کو سرکاری تمسکات بھی کہتے ہیں، ان سرکاری تمسکات کے بارے میں مفتی محمد تقی عثمانی صاحب فرماتے ہیں:-

سرکاری تمسکات ان دستاویزات کو کہتے ہیں، جو حکومت وقتاً فوقتاً

---

(۱) مجلة مجمع الفقه الإسلامي، الدورة الرابعة، العدد الرابع، الجزء الثالث، مقالة: الشيخ المفتي محمد عثماني ص:۱۸۵۳۔

عوام سے قرض لینے کے لئے جاری کرتی ہے، جب حکومت کے ذرائع آمدنی (ٹیکس وغیرہ) بجٹ کے لئے ناکافی ہوں، تو حکومت یہ مالیاتی دستاویز عوام سے قرض لینے کے لئے جاری کرتی ہے، مثلاً:

۱- اِنعامی بانڈ:- جس میں ہر بانڈ پر تو نفع نہیں ملتا، تمام بانڈز سے حاصل ہونے والی رُقوم پر مجموعی طور پر نفع ہوتا ہے، جو قرعہ اندازی سے تقسیم ہوتا ہے۔

۲- ڈیفنس سیونگ سرٹیفکیٹس

۳- خاص ڈپازٹ سرٹیفکیٹس

۴- فارن ایکسچینج بیئرر سرٹیفکیٹس:- پہلے عوام کو اپنے پاس فارن ایکسچینج (بیرونی کرنسی) رکھنے کی اجازت نہیں تھی، جس کا نتیجہ یہ تھا کہ جب کسی کو فارن ایکسچینج کی ضرورت پیش آتی تو اس میں بہت سی قانونی مشکلات ہوتی تھیں، اس صورتِ حال کا ایک نقصان یہ تھا کہ لوگ غیرقانونی ذرائع سے فارن ایکسچینج حاصل کرتے اور اپنے پاس رکھتے، دُوسرا نقصان یہ تھا کہ لوگ باہر سے فارن ایکسچینج مثلاً ڈالر لاتے تو حکومت کو نہیں دیتے تھے، جبکہ حکومت کو اس کی ضرورت ہوتی ہے، لہٰذا اس کو قانونی شکل دے کر لوگوں سے فارن ایکسچینج بطورِ قرض لینے کے لئے جو دستاویز حکومت نے جاری کی، اس کو فارن ایکسچینج بیئرر سرٹیفکیٹس (F.E.B.C) کہتے ہیں، اس کی شکل یہ ہے کہ حکومت ڈالر اس وقت کی قیمت کے مطابق پاکستانی روپے کا سرٹیفکیٹس جاری کردیتی ہے، مثلاً اس ڈالر کی قیمت ۲۵ روپے ہے اور باہر سے آنے والا سو ڈالر لے کر آیا، تو حکومت اس سے سو ڈالر لے کر اس کو دو ہزار پانچ سو پاکستانی روپے کا سرٹیفکیٹ جاری کرے

گی، جس کا مطلب یہ ہوگا کہ حکومت حاملِ سرٹیفکیٹ کے لئے پاکستانی ڈھائی ہزار روپے کی مقروض ہے۔

ایف ای بی سی پر سالانہ ۱۲ فیصد اِضافہ ملتا ہے، اور اس کو حامل جب چاہے یہ سرٹیفکیٹ پیش کر کے دوبارہ ڈالر لے سکتا ہے، اور حامل اس سرٹیفکیٹ کو بیچ بھی سکتا ہے۔

یہ تمام سرکاری تمسکات ہیں، ان میں اصل معاملہ تو حکومت اور قرض دہندہ کے درمیان ہوتا ہے، لیکن عوام کی سہولت کے لئے ان کے بیچنے کی بھی گنجائش رکھی گئی ہے، فنانشل مارکیٹ میں ان کی خرید و فروخت ہوتی ہے، حاملِ دستاویز جب اس کی بیع کرے گا، تو اَب دائن نہیں رہے گا، اس کا معاملہ حکومت سے ختم ہو جائے گا اور اَب خریدار دائن ہوگا، اور حکومت کا معاملہ خریدار سے وابستہ ہو جائے گا۔(۱)

موسوعہ میں ہے:-

فی المعنی العام هی مستندات تثبت ملكية معينة أو حقا فی دخل معين تودع لدی بنك كضمانة للحصول علیٰ قرض أوراق مالية تعطی حاملها الحق فی دخل معين ويجری فيها التعامل فی سوق الأوراق المالية (البورصة) وفی السوق الثانوية واهم صفة لهذه الأوراق هی انما قابلة للتبادل التجاری وهی اما سندات ذات فوائد ثابتة أو السهم ممتازة تتضمن الأوراق المالية التی تصدرها الحكومة المركزية والحكومات المحلية الأوراق التی

---

(۱) اسلام اور جدید معیشت وتجارت ص:۷۷۔

یکون عائدها متغیرا مثل الأسهم العادیة۔[1]

Government Securities, which are usually bonds that pay a fixed amount of interest each year gave unlike most commercial securities a guaranteed saftey factor concerning then ultimate repayment. These securities are traded in the Market, and their prices fluctuate in value, depending on trends and condition of the economy.[2]

شیئرز سرٹیفکیٹ

الصك الذی یعطی للمساهم اثباتا لحقه۔

وہ رسید جو شیئر ہولڈر کو دی جاتی ہے، جو اس بات کی دلیل ہوتی ہے کہ کمپنی میں اس کا حق اور حصہ ہے۔

الصك والوثیقة المثبتة الذی یعطی للساهم اثباتا لحقه لأن السهم یعطی للمساهم حقوقا تجاه الشرکة کما یترتب علیه التزمات نحوها۔

وہ رسید ہوتی ہے جو شیئر ہولڈر کا حق ثابت کرتی ہے، کیونکہ شیئر، شیئر ہولڈر کو کمپنی میں کچھ حقوق اور کچھ واجبات دیتا ہے۔[۳]

السهم هو الصك الذی تصدره الشرکة ویُمثل حق المساهم فیها ویتمتع حامله بالحق فی الحصول علیٰ عائد سنوی نتیجة إستثمار رأس ماله۔[۴]

---

(۱) موسوعة المصطلحات الإقتصادیة الإحصائیة، هیکل (الدکتور عبدالعزیز الفهمی هیکل) بیروت، دار النهضة العربیة (ص:۴۳۸)۔

(2) The New Encyclopaedia Britannica v:10, p:595.

(۳) المعاملات المالیة المعاصرة فی الفقه الإسلامی، (شبیر) محمد عثمان شبیر، اُردن، دار النفائس، طبع ثالث ۱۴۱۹ھ۔

(۴) مجلة مجمع الفقه الإسلامی، الدورة السادسة، العدد السادس، الجزء الثانی ص:۱۵۲۵۔

حاصل یہ کہ وہ سرٹیفکیٹ ہے، جو کمپنی کے اثاثے میں ایک خاص تناسب سے شیئر ہولڈر کے حصے کی نمائندگی کرتا ہے۔

اس کی بھی کئی قسمیں ہیں، جن سے بحث کرنے کا یہ مقام نہیں ہے، نیز شیئر سرٹیفکیٹ کے کچھ شرعی اَحکام ہیں، جن میں اس کی خرید وفروخت اور زکوٰۃ وغیرہ کے مسائل شامل ہیں۔[1]

بونس شیئرز

بونس شیئر کے بارے میں مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب فرماتے ہیں:-

Devidend کی تقسیم کے دو طریقے ہوتے ہیں، کبھی تو نقد نفع لوگوں کو فراہم کیا جاتا ہے، اور کبھی اس نفع کے دوبارہ حصص جاری کردیئے جاتے ہیں، اس قسم کے حصے کو "بونس شیئر" (Bonus Share) کہتے ہیں۔

بونس شیئر جاری کرنے سے کمپنی کا سرمایہ بڑھ جاتا ہے، ایسا عموماً اس وقت ہوتا ہے جبکہ کمپنی کی کیش پوزیشن کمزور ہو، یعنی اس کے پاس نقد رقم کم ہو، تو بجائے نقد نفع دینے کے مزید حصص جاری کردیئے جاتے ہیں، کسی حصہ دار کو مثلاً دس روپے دینے کے بجائے دس روپے کا حصہ دے دیا جاتا ہے، لیکن اس کے لئے یہ ضروری ہوگا کہ منظور شدہ سرمائے میں اس کی گنجائش ہو، مثلاً ۸۰ ملین کی اجازت ملی تھی، ان میں سے ۶۰ ملین جاری کئے گئے تھے، ۲۰ ملین کی گنجائش باقی تھی، اگر منظور شدہ سرمائے میں مزید گنجائش نہیں ہے تو دوبارہ درخواست دے کر اِجازت لی جائے گی۔

---

(۱) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: اسلام اور جدید معیشت وتجارت۔

بونس شیئر جاری کرنے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کمپنی کے شیئرز کی بازاری قیمت (Market Value) قیمتِ اسمیہ (Face Vlaue) سے کم نہ ہو، اگر بازار میں قیمت گر گئی ہے، تو اَب بونس شیئر جاری کرنے میں حصہ داران کو نقصان ہے، مثلاً دس روپے کے شیئر کی قیمت بازار میں نو روپے ہے، تو حصہ دار کو دس روپے کی بجائے نو روپے کا شیئر ملے گا، تو اس کو ایک روپیہ کا نقصان ہوا۔ (۱)

تعہدات (Warrants)

تعہدات کی تعریف مجمع الفقہ الاسلامی جدہ میں یوں الفاظ میں کی گئی ہے:-

هو الخيار الذي تبيعه الشركة علىٰ مستثمرين جدد ويسمى Warrants حيث يكون لهم حق شراء مجموعة من اسهم الشركة عند سعر محدد خلال مدة محددة وهو قابل للتاول وربما يمتد لسنوات .... تصدر الشركات انواعا من التعهدات (Warrants) تتضمن الوعد ببيع عدد من أسهم الشركة بسعر محدد خلال فترة محددة أو غير محددة ويستطيع الشركة بهٰذه الطريقة أن تحقق دخلا بدون ان تخاطر بتغير هيكل ملكيتها الذي قد ينتجه ادخال مساهمين جدد وفي نفس الوقت يستطيع المستثمرون المضاربة علىٰ مستقبل الشركة بدون الحاجة إلىٰ مبلغ كبير من المال۔

Warrants اس خیار کو کہتے ہیں کہ جس کو کمپنی نئے سرمایہ کاروں کو بیچتی ہے، اس خیار کی بنیاد پر سرمایہ کاروں کو یہ حق حاصل ہو جاتا ہے

(۱) اسلام اور جدید معیشت وتجارت ص:۶۱۔

کہ وہ کمپنی کے شیئرز خرید لیں، متعین ریٹ پر متعین مدت کے
درمیان، یہ خیار قابلِ تداول (لین دین) ہے، یعنی اس کی خرید و
فروخت ہوتی ہے، اور بسا اوقات یہ خیار کئی سالوں تک ممتد ہوتا ہے
...... کمپنیاں مختلف قسم کے تعہدات جاری کرتی ہیں، جن میں یہ وعدہ
ہوتا ہے کہ حامل کچھ متعین شیئرز متعین قیمت پر متعین مدت تک خرید
لے، اور بعض اوقات مدت کا ذکر نہیں یعنی مدت کی قید نہیں ہوتی۔
تعہدات کے جاری کرنے میں کمپنی کو یہ فائدہ حاصل ہوتا ہے کہ نئے
شیئر ہولڈرز کے آنے سے ملکیت کی حالت میں کمی آنے کا خطرہ ہوتا
ہے اس سے کمپنی محفوظ ہو جاتی ہے، کیونکہ سرمایہ کاروں نے ایک
خاص ریٹ پر شیئرز خریدنے کا خیار خریدا ہے، اور دُوسری طرف
سرمایہ کاروں کو بھی کسی بڑی رقم کے بغیر شیئرز میں سرمایہ کاری کا موقع
مل جاتا ہے۔ (1)

گلوسری اسٹیٹ بنک آف پاکستان میں وارنٹس کی حقیقت ان الفاظ میں بیان کی
گئی ہے:-

Warrants are securities issued with preferred stacks or bond or certificates, that give the holder the right to buy a proportionate amount of common stock at specified price, usually higher than market price at the time of issue of warrants, for a specific period of time, or perpetuity. In this sense, warrants are options to the holder of corporate stocks or bonds.

وارنٹ یہ وہ تمسکات ہوتے ہیں، جو ترجیحی اسٹاک یا بانڈ یا سرٹیفکیٹ
کے ہمراہ جاری کیے جاتے ہیں، جو حامل کو یہ حق دیتے ہیں کہ وہ ایک

(۱) مجلة مجمع الفقه الإسلامي، الدورة السادسة، العدد السادس، الجزء الثاني ص:۱۵۲۵

خاص قیمت پر عام اسٹاک کی ایک متناسب تعداد خرید لے، یہ خاص قیمت وارنٹوں کے اجراء کے وقت کسی خاص عرصے کے لئے یا ہمیشہ کے لئے عموماً بازار کی قیمت سے زیادہ ہوتی ہے، اس مفہوم میں وارنٹ کارپوریٹ اسٹاک یا بانڈ کو حاصل کرنے کے آپشن ہوتے ہیں۔[1]

ان عبارات کا حاصل یہ ہے کہ وارنٹ ایک خیار ہے، جس سے حامل کو یہ حق حاصل ہوجاتا ہے کہ وہ ایک مخصوص مدت یا غیر معین مدت میں ایک خاص ریٹ پر عام اسٹاک (سہم عادی) کمپنی (جاری کنندہ) سے خریدے، یعنی حامل کو یہ اختیار ہوتا ہے کہ وہ اگر اس ریٹ پر اس کمپنی کے عام اسٹاک لینا چاہتا ہے تو لے سکتا ہے۔

نیز وارنٹس قابلِ تداول بھی ہیں، جسے "Negotiable" کہتے ہیں، یعنی ان کی خرید و فروخت ہوتی ہے، مزید تفصیل اور حکم اِن شاء اللہ تعالیٰ خیارات میں آئے گا۔

خیارات(Options)

خیارات کی حقیقت گلوسری میں یوں بیان کی گئی ہے:-

Option is a contract giving the asset holder the right but not the obligation to sell or buy an asset at an agreed price called strike price or exercise price over a short period in future which is of critical importance in the contract, if the contract stipulates a fixed date for transaction in future, it is a European Style option, if the transaction can be done a number of times in future over the contract period it is Bermuda Style option, if the time of transaction is chosen by the holder up to maturity date of the contract if is an American Style option.

(1) Glossary; Banking and Finance, English-English-Urdu, Shakil Faruqi Student Edition, State Bank of Pakistan, Institute of Bankers Pakistan, Lahore School of Economics.

In securities market, this contract could be a call option.

یہ ایک کنٹریکٹ ہے جو اثاثہ بردار کو یہ حق دیتا ہے کہ وہ اثاثے کی خرید و فروخت کر سکے، لیکن مجبور نہیں کرتا، یہ خرید و فروخت مستقبل میں ایک مختصر عرصے کے دوران کی جاسکتی ہے، جو کہ کنٹریکٹ کے لئے نازک اہمیت رکھتا ہے، اور صرف ایک منظور شدہ قیمت پر جسے اختیاری قیمت کہتے ہیں۔

اگر اس کنٹریکٹ میں معاملے کی کوئی آئندہ تاریخ متعین ہو، تو یہ یورپی طرز کا آپشن ہوگا، لیکن اگر کنٹریکٹ کی مدت میں معاملہ بار بار کیا جا سکے، تو یہ برمودہ طرز آپشن ہوگا، اگر معاملے کا وقت کنٹریکٹ کا حامل فریق متعین کرے، لیکن صرف کنٹریکٹ کے عرصے کے اندر اندر، تو یہ امریکی طرز آپشن ہوگا، تمسکات کے بازاروں میں آپشن دو طرح کے ہوتے ہیں، ایک کال آپشن اور دُوسرا پٹ آپشن۔[(1)]

مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب آپشن کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:-

کسی خاص چیز کو خاص قیمت پر بیچنے یا خریدنے کے حق کا نام ''خیارات'' یا "Options" ہے۔ کوئی شخص دُوسرے سے وعدہ کرتا ہے کہ اگر تم چاہو گے تو فلاں چیز اتنی قیمت میں اتنی مدّت تک میں خریدنے کا معاہدہ کرتا ہوں، تم جب چاہو بیچ سکتے ہو، اس کو بیچنے کا آپشن کہتے ہیں۔ آپشن دینے والا یہ حق دینے پر فیس لیتا ہے، آپشن دینے والا اس مدت میں اس چیز کو اسی قیمت پر خریدنے کا پابند ہوتا ہے، لیکن آپشن لینے والا بیچنے کا پابند نہیں ہوتا، اسی طرح اس کے

(1) Glossary; Banking and Finance, English-English-Urdu, Shakil Faruqi Student Edition, State Bank of Pakistan, Institute of Bankers Pakistan, Lahore School of Economics.

برعکس بعض اوقات ایک شخص یہ وعدہ کرتا ہے کہ میں تم سے فلاں چیز فلاں تاریخ تک فلاں نرخ پر بیچنے کی ذمہ داری لیتا ہوں، اس تاریخ تک تم جب چاہو، مجھ سے اس نرخ پر یہ چیز خرید لینا، یہ خریداری کا آپشن ہے۔ آپشن کرنسی پر بھی ہوتا ہے اور اَجناس پر بھی ہوتا ہے، اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ آپشن دینے والا لینے والے کو اس کرنسی یا جنس کی قیمتوں کے اُتار چڑھاؤ سے مطمئن کرتا ہے اور یہ اطمینان دِلانے پر کمیشن لیتا ہے۔ مثلاً ایک شخص نے پچّیس روپے کا ایک ڈالر خریدا، وہ اس کشمکش میں ہے کہ اگر یہ اپنے پاس رکھوں تو اس کی قیمت گرنے کا اِحتمال ہے، اگر ابھی آگے فروخت کردوں، تو ہوسکتا ہے کہ آئندہ اس کی قیمت بڑھ جائے، تو نفع سے محروم رہوں گا۔ اب دُوسرا شخص اس کو اِطمینان دِلاتا ہے کہ ڈالر تم اپنے پاس رکھو، میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تین ماہ تک یہ ڈالر میں پچّیس روپے میں خریدوں گا، اور اس وعدے پر اتنی فیس لوں گا۔ اس کی وجہ سے وہ شخص قیمت گرنے سے مطمئن رہے گا، اگر قیمت بڑھ گئی، تو کسی اور کو فروخت کردے گا، قیمت گرگئی تو آپشن بیچنے والے کو پچّیس روپے میں فروخت کردے گا۔ آپشن کو مستقل مالِ تجارت سمجھا جاتا ہے، اور اس کی آگے بھی بیع ہوجاتی ہے۔

یہ کاروبار دُوسرے ممالک میں بہت وسیع پیمانے پر ہو رہا ہے، اور اس کی صورتیں روز بروز پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتی جارہی ہیں۔ (۱)

آپشن کی چند مشہور اَقسام

آپشن کی مشہور قسمیں تین ہیں:-

(۱) اسلام اور جدید معیشت و تجارت ص:۷۶۔

۱- خیار الطلب (Call Option)
۲- خیار الدفع (Put Option)
۳- خیار المرکب (Stradle Option)

① - خیار الطلب (Call Option)

خیار الطلب سے مراد کسی چیز کو خریدنے کا حق ہے، جس کی مثال اُوپر ڈالر کے ساتھ ہم نے دی۔

② - خیار الدفع (Put Option)

خیار الدفع سے مراد کسی چیز کو بیچنے کا حق ہے، یہ پہلے خیار کی ضد ہے، اس میں بیچنے والے شخص کو تو خیار حاصل ہوتا ہے، لیکن خریدار کے لئے لازم ہوتا ہے کہ وہ اسے خریدے۔ جس کی تفصیل اُوپر گزر گئی۔

③ - خیار المرکب (Stradle Option)

خیار المرکب سے مراد خریدنے اور بیچنے دونوں کا اِختیار ہے، بعض مرتبہ لوگ دونوں اِختیار لے لیتے ہیں۔

مجمع الفقہ الاسلامی میں ایک چوتھی قسم کا بھی ذِکر ہے، جس کو "الخیار الممتد" (Spread Option) کا نام دیا ہے، یہ درحقیقت خیار مرکب ہی ہے، البتہ اس میں خریدنے کا نرخ بیچنے کے نرخ سے زیادہ ہوتا ہے۔

خیارات کی ان اَقسام سے متعلق مجلّہ مجمع الفقہ الاسلامی کی عبارت ملاحظہ ہو:-

عقد خيار الطلب (Call Option)

عقد خيار الدفع (Put Option)

عقد الخيار المركب (Stradle Option)

عقد الخيار الممتد (Spread Option)

الخيار المركب: ويتضمن هذا الخيار حق في البيع وحق

فی الشراء فی ذات الوقت یصدر المستثمر هذا الخیار ثم ینتظر ماذا یحدث فی السوق فإذا وجد الاجدی له البیع مارسه وإذا وجد الاجدی له الشراء مارسه۔
الخیار الممتد: ویتضمن خیار شراء وبیع ای خیارا مرکبا ولٰکن بسعر للشراء یزید علیٰ سعر البیع ...الخ۔(۱)

حکمِ شرعی

یاد رکھنا چاہئے کہ ورانٹس (جو درحقیقت خیارات ہی میں داخل ہیں، لیکن ان کا زیادہ تر تعلق اسٹاک یعنی شیئرز سے ہے، جیسا کہ وہاں ذکر کردہ تفصیلات سے واضح ہے) اورخیارات کی بیع شرعاً جائز نہیں، اوراس کے ناجائز ہونے کے دواَسباب ہیں:-

۱- اس معاملے میں غرر (Uncertainty) ہے، کیونکہ جس کے پاس آپشن ہوتا ہے، اس کے لئے ضروری نہیں کہ وہ اسے استعمال کرکے مطلوبہ چیز خرید لے، یا اسے بیچ دے، گویا مستقبل میں اس عقد کا ہونا ضروری نہیں۔

۲- یہ خیار شریعت کی نگاہ میں مال نہیں، جبکہ بیع ہونے کے لئے ضروری ہے کہ دونوں طرف سے مال کا تبادلہ ہو، گویا اس بیع پر شرعی بیع کی تعریف صادق نہیں آتی، اس لئے یہ بیع جائز نہیں، بیع کی تعریف یہ ہے کہ باہمی رضامندی سے فریقین اپنے اموال کو ایک دُوسرے سے تبدیل کریں۔(۲)

---

(۱) فلیراجع لتفاصیل هذه الخیارات وتفاصیلها: مجلة مجمع الفقه الإسلامی جدة، الدورة السادسة، العدد السادس، الجزء الثانی، هذه النسخة موجودة فی مکتبة جامعة دارالعلوم کراتشی۔
وایضًا تفاصیل هذه الأقسام موجودة فی گلوسری (Glossary) للبنك المرکزی باکستان، علیٰ صفحة: ۴۸۰۔

(۲) اسلامی بنکاری اورغرر (Uncertainty)، ڈاکٹر مولانا اعجاز احمد صمدانی، ادارہ اسلامیات کراچی، لاہور طبع اوّل، ربیع الثانی ۱۴۲۷ھ۔
یہ تالیف درحقیقت موصوف کے دکتوراہ کے مقالے، جس کا موضوع ہے ''غرر''، کا خلاصہ ہے، عوام کی آسانی کے لئے اس مقالے کا خلاصہ مذکورہ نام سے لیا گیا ہے۔

ضمیمہ ۱ : Bai-al-Dain

اس باب کے شروع میں بیع الدین کا مسئلہ ذکر ہوا تھا، اس سے متعلق چونکہ مولانا مفتی محمد تقی عثانی صاحب نے اپنی مشہور انگریزی تصنیف "An Introdcution to Islamic Finance" میں اس کا خلاصہ ذکر کیا ہے، اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس خلاصے کو ان ہی کے الفاظ میں یہاں ضمیمہ ۱ کے طور پر ذکر کیا جائے، تاکہ انگریزی جاننے والے قارئین اس مفید خلاصے سے مستفید ہوں:-

Here comes the question whether or not Bai-al-Dain is allowed in Shariah. Dain means debt and Bai means sale. Bai-al-Dain, therefore connotes the sale of debt. If a person has a debt receivable from a person and he wants to sell it at a discount, as normally happens in the bills of exchange, it is termed in Shariah as Bai-al-Dain. The traditional Muslim jurists (fuqaha) are unanimous on the point that Bai-al-Dain with discount is not allowed in Shariah. The overwhelming majority of the contemporary Muslims scholars of Malaysia have allowed this kind of sale. They normally refer to the ruling of shafiit school wherein it is held that the sale of debt is allowed, but they did not pay attention to the fact that the shafiite jurists have allowed it only in a case where a debt is sold at its par value.

In fact, the prhibition of Bai-al-Dain is a logical consequence of the prohibition of riba, or interes. A debt receivable in monetary terms corresponds to money, and every transaction where money is

exchanged for the same denomination of money, the price must be at par vlaue. Any increase or decrease from one side is tantamount to riba and can never be allowed in shariah.

Some scholars argue hat the permissibility of Bai-al-Dain is restricted to a case where the debt is created through the sale of a commodity and its sale may be taken as the sale of a commodity. The argument, however, is devoid of force, for, once the commodity is sold, its ownership is passed on to the purchaser and it is no longer other than money. Therefore if he sells the debt, it is no more than the sale of money and it cannot be termed by any stretch of imagination as the sale of the commodity.

That is why this view has not been accepted by the overwhelming majority of the contemporary scholars. The Islamic Fiqh Academy of Jeddah, which is the largest representative body of the Sharia scholars and has the representaion of the Muslim countries, including Malaysia, has approved the prohibtion of Bai-al-Dain unanimously without a single dissent.(1)



(1) An introduction to Islamic Fainanc. p:216.

ضمیمہ ۲:
شیئرز اور اسٹاک ایکسچینج میں کاروبار سے متعلق اہم تحقیق

شیئرز سے متعلق چونکہ گزشتہ صفحات میں اِختصار کے ساتھ بحث کی گئی، یہاں اس کی مناسبت سے شیئرز اور اسٹاک ایکسچینج کے کاروبار سے متعلق ایک اہم فتویٰ ذِکر کیا جاتا ہے جو اس سلسلے میں بہت ہی اہم ہے، اور اس پر باقاعدہ اہلِ فتویٰ حضرات کا اِجلاس ہوا ہے، اور اس اِجلاس میں منظور ہوا ہے۔

بسم الله الرحمٰن الرحيم

الحمد لله رب العالمين، والصلٰوة والسلام علىٰ رسوله الكريم، وعلىٰ آله وأصحابه أجمعين، وعلىٰ كل من تبعهم باحسان الىٰ يوم الدّين

آج کل کمپنیوں کے حصص کی بیع وشراء جن طریقوں سے ہوتی ہے، ان کی شرعی حیثیت کے بارے میں بہت سے سوالات پیدا ہوتے رہتے ہیں، اور پوچھے بھی جاتے ہیں، ان کا شرعی حکم معلوم کرنے کے لئے اس طریقِ کار کی صحیح واقفیت ضروری ہے جو اس بیع وشراء میں اختیار کیا جاتا ہے۔ واضح رہے کہ اس وقت گفتگو ان کمپنیوں کے حصص کے بارے میں ہورہی ہے، جن کا کاروبار شرعاً حلال ہے اور ان کے حصص کی خریداری حضرت حکیم الاُمت مولانا تھانوی قدس سرہٗ کے فتویٰ "القصص السني في حصص الكمبني" کی رُو

سے جائز ہے۔

یہ معلومات حاصل کرنے کے لئے دارالعلوم کراچی کے دارالافتاء سے اہلِ علم کی ایک جماعت نے کراچی کے اسٹاک ایکسچینج کا دورہ کیا، ایکسچینج کے ذمہ داروں سے عملی صورتِ حال معلوم کی، اوران کے قواعد وضوابط حاصل کر کے ان کا مطالعہ کیا۔ اس تحقیق کے نتیجے میں جوصورتِ حال واضح ہوئی وہ ذیل میں درج کی جارہی ہے۔

بنیادی طور پر قابلِ تحقیق اُمور مندرجہ ذیل تھے:۔

۱-ڈے ٹریڈنگ، یعنی ایک ہی دن میں حصص خرید کر اسی دن بیچ دینا۔

۲- مستقبل کے سودے(Forward)۔

۳-بدلے کے معاملات۔

ڈے ٹریڈنگ

ڈے ٹریڈنگ کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص ایک ہی دن میں حصص خرید کر اسی دن کسی اور شخص کو وہ حصص بیچ دیتا ہے، یہ ڈے ٹریڈنگ فوری سودوں (Spot Transactions) میں بھی ہوتی ہے، اور مستقبل کے سودوں (Forward Trading) (Forward) میں بھی۔ پہلے ہم فوری سودوں کی تحقیق کرتے ہیں۔

فوری سودے(Spot Trading)

فوری سودوں کا طریقِ کار یہ ہوتا ہے کہ جب کوئی شخص کسی کمپنی کے حصص خریدتا ہے تو اس خریداری کا اندراج فوری طور سے KAT میں ہوجاتا ہے، جو اسٹاک ایکسچینج میں ہونے والے سودوں کا کمپیوٹرائزڈ ریکارڈ ہوتا ہے، اوراسٹاک ایکسچینج ان سودوں میں فریقین کی ذمہ داریوں کی ضمانت دیتا ہے، اس سودے کو حاضر سودا بھی کہا جاتا ہے، فوری سودوں میں ہر سودے کے تین دن بعد خریدار کو طے شدہ قیمت ادا کرنی ہوتی ہے، اور بیچنے والے کو بیچے ہوئے حصص کی ڈیلیوری دینی ہوتی ہے۔ ڈیلیوری کا مطلب حصص کی بیع میں یہ ہوتا ہے

کہ جس کمپنی کے حصص بیچے گئے ہیں اس کمپنی کے ریکارڈ میں سی ڈی سی کے ذریعے ان حصص کی منتقلی خریدار کے نام ہو جاتی ہے۔

فقہی نقطۂ نظر سے یہاں قابلِ غور بات یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کوئی چیز خریدے تو اس کے لئے شرعاً ضروری ہے کہ پہلے اس چیز پر قبضہ کرے، پھر اس کے لئے آگے فروخت کرنا جائز ہوتا ہے، قبضے سے پہلے بیع جائز نہیں۔ اب حصص کی خریداری میں صورتِ حال یہ ہے کہ ڈیلیوری، خریداری کے تین دن بعد ہوتی ہے، سوال یہ ہے کہ خریداری اور ڈیلیوری کے درمیان جو تین دن کی مدّت ہے، کیا خریدار کے لئے جائز ہے کہ اس درمیانی مدّت میں وہ اپنے خریدے ہوئے حصص کسی اور شخص کو فروخت کردے؟

اگر ڈیلیوری کو شرعی قبضہ قرار دیا جائے تو ڈیلیوری سے پہلے فروخت کرنا بیع قبل القبض قرار پائے گا، اور ناجائز ہوگا، لیکن دُوسرا اِحتمال یہ ہے کہ ''ڈیلیوری'' شرعی قبضے سے عبارت نہیں، بلکہ کمپنی میں حصص کے خریدار کے نام پر اِندراج کو ''ڈیلیوری'' کہا جاتا ہے، ورنہ جہاں تک خریدے ہوئے حصص کے جملہ منافع اور نقصانات کا تعلق ہے، وہ خریداری کے متصل بعد خریدار کی طرف منتقل ہوجاتے ہیں، یعنی اگر خریداری اور ڈیلیوری کی درمیانی مدّت میں کمپنی کو کوئی نقصان ہوجائے تو وہ نقصان خریدار ہی برداشت کرتا ہے، اور اگر کمپنی کو نفع ہوجائے تو اس نفع کا فائدہ بھی خریدار ہی کو پہنچتا ہے۔

یہ بات واضح رہنی چاہئے کہ حصص کی بیع کا مطلب کمپنی کے حصصِ مشاعہ کی بیع ہے، لہٰذا یہ ''بیع المشاع'' ہے اور مشاع میں حِسی قبضہ ممکن نہیں ہوتا۔ دُوسری طرف بیع قبل القبض کی ممانعت کی علّت یہ ہے کہ جب تک مشتری مبیع پر قبضہ نہ کرے، یا کم از کم بائع تخلیہ نہ کرے، مبیع بائع ہی کے ضمان میں رہتی ہے، یعنی اگر اس دوران وہ ہلاک ہوجائے تو بیع فسخ ہوجاتی ہے، لہٰذا اگر قبضہ کئے بغیر مشتری نے مبیع کسی اور کو فروخت کردی، بعد میں بائعِ اصلی ہی کے قبضے میں ہلاک ہوگئی تو پہلی بیع فسخ ہوجائے گی، تو اس کے نتیجے میں دُوسری بیع بھی فسخ ہوجائے گی، لہٰذا اس دُوسری بیع میں شروع ہی سے غررِ اِنفساخ پایا جاتا ہے۔

علامہ کاسانی رحمہ اللہ بیع قبل القبض کی ممانعت کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

ولأنہ بیع فیہ غرر الانفساخ بھلاك المعقود علیہ، لأنہ اذا ھلك المعقود علیہ قبل القبض یبطل البیع الأوّل، فینفسخ الثانی۔ (بدائع الصنائع ج:۴ ص:۳۹۴، مؤسسۃ التاریخ العربی)

بیع قبل القبض کی ممانعت کی اس سے زیادہ واضح علّت یہ ہے کہ اس سے ربح مالم یضمن لازم آتا ہے، کیونکہ قبضے سے پہلے مبیع کا ضمان مشتری کی طرف منتقل نہیں ہوتا، اب اگر وہ اسے آگے فروخت کرے اور اس میں نفع کمائے تو یہ ربح مالم یضمن ہوگا، جس کی ممانعت مندرجہ ذیل حدیث میں آئی ہے:-

لا یحل سلف وبیع ولا شرطان فی بیع، ولا ربح مالم تضمن۔ (سنن أبی داؤد ج:۳ ص:۲۸۳، کتاب البیوع، باب فی الرجل یبیع ما لیس عندہ)

جامع ترمذی میں یہ حدیث ان الفاظ سے مروی ہے:-

نھیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن سلف وبیع، وعن شرطین فی بیع وعن ربح مالم یضمن۔ (جامع الترمذی ج:۳ ص:۵۳۵، باب ما جاء فی کراھیۃ بیع ما لیس عندك)

اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے مُلاَّ علی قاری رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:-

یرید بہ الربح الحاصل من بیع ما اشتراہ قبل أن یقبضہ وینتقل من ضمان البائع الیٰ ضمانہ، فان بیعہ فاسد، فی شرح السُنّۃ: قیل: معناہ ان الربح فی کل شیء انما یحل ان لو کان الخسران علیہ، فان لم یکن الخسران علیہ کالبیع قبل القبض اذا تلف فان ضمانہ علی البائع۔

(مرقاۃ المفاتیح ج:٦ ص:۸۹)

اور علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:-

وربح ما لم یضمن، یرید به الحاصل من بیع ما اشتراه قبل أن یقبضه وینتقل من ضمان البائع الیٰ ضمانه، فان بیعه فاسد۔ (شرح الطیبی ج:٦ ص:٨٢).

علامہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:-

(وربح ما لم یضمن) هو ربح مبیع اشتراه فباعه قبل أن ینتقل من ضمان البائع الأوّل الیٰ ضمانه بالقبض۔

(حاشیة السندی علی المجتبی للنسائی ج:٧ ص:٢٩٥)

اور حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری قدس سرہٗ تحریر فرماتے ہیں:-

ولا ربح ما لم تضمن، أی لا یحل ربح شيءٍ لم یدخل فی ضمانه وهو ربح مبیع اشتراه فباعه قبل أن ینتقل عن ضمان البائع الأوّل الیٰ ضمانه بالقبض۔ (بذل المجهود ج:١٥ ص:١٨٠، کتاب البیوع، باب فی الرجل یبیع ما لیس عنده)

حاصل یہ ہے کہ کسی چیز کی بیع قبل القبض اس لئے ناجائز ہوتی ہے کہ قبضے کے بغیر اس کا ضمان مشتری کی طرف منتقل نہیں ہوتا، لہٰذا اگر وہ نفع پر آگے بیچنا چاہتا ہے تو یہ ربح ما لم یضمن میں داخل ہے، نیز جیسا کہ صاحبِ بدائع نے فرمایا، قبضے سے پہلے اگر مبیع ہلاک ہوجائے تو بائع کے ضمان میں ہونے کی بناء پر بیع فسخ ہوجائے گی، اور اس کے نتیجے میں اگلی بیع بھی فسخ ہوگی، لہٰذا اگلی بیع میں شروع ہی سے غررِ انفساخ پایا جاتا ہے۔

لیکن اگر ضمان حسّی اور حقیقی قبضے کے بغیر تخلیہ کے ذریعے مشتری کی طرف منتقل ہوجائے تو پھر چونکہ نہ ربح ما لم یضمن کا اندیشہ ہے، نہ غررِ انفساخ کا، اس لئے مشتری کے لئے اسے آگے بیچنا جائز ہے، اسی لئے فقہائے کرام رحمہم اللہ نے تخلیہ کو قبضہ کے قائم مقام قرار دیا ہے، فتاویٰ عالمگیری میں ہے:-

واجمعوا علیٰ أن التخلیة فی البیع الجائز تکون قبضًا، وفی البیع الفاسد روایتان والصحیح انها قبض .... رجل باع خلًّا فی دنّ فی بیته فخلّی بینه وبین المشتری فختم المشتری علی الدنّ وترکه فی بیت البائع فهلك بعد ذلك فانه یهلك من مال المشتری فی قول محمد، وعلیه الفتویٰ۔

(فتاویٰ عالمگیریة ج:۳ ص:۱٦، کتاب البیوع، باب:۴ فصل:۲)

اب دیکھنا یہ ہے کہ مُشاع کی بیع میں قبضہ کیسے متحقق ہوتا ہے؟ اس کے جواب میں بھی فقہائے کرام نے یہی فرمایا ہے کہ مشاع کی بیع میں تسلیم اور قبض کا تحقق تخلیہ ہی سے ہوتا ہے۔ علامہ سرخسی رحمہ اللہ اجارۃ المشاع (جو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک جائز نہیں) اور بیع المشاع کے درمیان فرق بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:-

وهذا بخلاف البیع، لأن التسلیم هناك بالتخلیة یتم وذلك فی الجزء الشائع یتم۔

(مبسوط السرخسی ج:۱۵ ص:۱۴٦، کتاب الاجارة)

صاحبِ ہدایہ رحمہ اللہ نے بھی اس فرق کو اس طرح بیان فرمایا ہے:-

ولأبی حنیفة انه آجر ما لا یقدر علیٰ تسلیمه فلا یجوز، وهذا لأن تسلیم المشاع وحده لا یتصور، والتخلیة اعتبرت تسلیمًا لوقوعه تمکینًا، وهو الفعل الذی یحصل به التمکن، ولا تمکن فی المشاع، بخلاف البیع لحصول التمکن فیه۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اجارہ میں چونکہ مقصود صرف اِنتفاع ہوتا ہے، مِلک نہیں، اور حصۂ مشاعہ میں تمکین اِنتفاع نہیں ہوسکتی، اس لئے اس میں تخلیہ متصور نہیں ہے، اس کے برخلاف بیع میں مقصود مِلک ہوتی ہے، لہٰذا تخلیہ کے ذریعے اس میں تمکین ہوسکتی ہے، چنانچہ

صاحبِ عنایہ اس کی شرح میں فرماتے ہیں:-

بخلاف البیع فان المقصود به لیس الانتفاع، بل الرقبة، ولهٰذا جاز بیع الجحش فکان التمکن بالتخلیة فیه حاصلًا۔

اور صاحبِ کفایہ اس کو مزید واضح کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:-

ان التخلیة اعتبرت تسلیمًا اذا کان تمکینًا من الانتفاع، وانما یکون تمکینًا اذا حصل بها التمکن، والتمکن لا یحصل به فلم یعتبر فعله تمکینًا بخلاف البیع، لحصول التمکن ثمة من البیع والاعتاق وغیر ذٰلك۔ (فتح القدیر مع العنایة والکفایة ج:۸ ص:۴۱ و ۴۲ باب الاجارة الفاسدة)

صاحبِ کفایہ کی خط کشیدہ عبارت سے یہ بات واضح ہے کہ مشاع میں حسی قبضے کے بغیر تخلیہ قبضے کے قائم مقام ہوجاتا ہے اور مشتری کے لئے اس میں ملک کے تصرفات کرنا جائز ہوجاتا ہے، جن میں اسے آگے فروخت کرنا بھی شامل ہے۔

علامہ طوری رحمہ اللہ نے بھی تکملہ البحر الرائق میں فرق کی وضاحت صاحبِ ہدایہ اور صاحبِ عنایہ کے بیان کے مطابق کی ہے۔

(تکملة البحر ج:۸ ص:۳۶، باب الاجارة الفاسدة)

ان تصریحات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مشاع کی بیع میں حسی قبضہ تو ممکن نہیں ہوتا، لیکن تخلیہ اور تمکین سے قبضے کا مقصود حاصل ہوجاتا ہے، اور مشتری کے لئے اس تخلیہ یا تمکین کے بعد اسی مُشاع کو آگے فروخت کرنا بھی جائز ہوجاتا ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ حصص کی بیع میں بائع کی طرف سے تمکین اور تخلیہ کا تحقق ہوجاتا ہے یا نہیں؟

اگرچہ اسٹاک ایکسچینج کے ذمہ دار اور اس میں کام کرنے والے اس بات پر متفق نظر آئے کہ سودا ہوتے ہی بیچے ہوئے شیئرز کے حقوق اور ذمہ داریاں خریدار کی طرف منتقل

ہو جاتی ہیں، گویا شیئرز خریدار کے ضمان میں آجاتے ہیں (اور اس لحاظ سے اگر خریدار انہیں آگے بیچے تو "ربح مالم یضمن" لازم نہیں آتا) لیکن اسٹاک ایکسچینج کے قواعد وضوابط کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ قبضۂ شرعی کا تحقق ڈیلیوری سے پہلے نہیں ہوتا، جس کے دلائل مندرجہ ذیل ہیں:-

۱- یہ بات فقہِ اسلامی میں طے شدہ ہے کہ "قبض کل شیء بحسبه" یعنی ہر چیز کا قبضہ اس شئ کی نوعیت کے لحاظ سے عرفاً مختلف ہوتا ہے، شیئرز کے بارے میں عرفِ عام یہی ہے کہ سودے کے وقت محض اسٹاک ایکسچینج کے فوری اندراج کو قبضہ نہیں کہا جاتا، بلکہ کہا جاتا ہے کہ "ڈیلیوری" تین دن بعد ہوگی، ڈیلیوری کے معنی ہی قبضہ دینے کے ہیں، لہٰذا عرف نے اسی کو قبضہ قرار دیا ہے۔

۲- اسٹاک ایکسچینج میں "بیع مالا یملك الانسان" (Short Sale) کا رواج عام ہے، جب ہم نے اسٹاک ایکسچینج کا دورہ کیا، اس وقت ہمیں یہ بتایا گیا کہ حاضر سودوں یعنی فوری سودوں میں شارٹ سیل ممنوع کردی گئی ہے، لیکن قواعد وضوابط سے پتہ چلتا ہے اور بعد میں اسٹاک ایکسچینج کے صدر صاحب نے بھی اس کی تصدیق کی کہ جو چیز منع کی گئی ہے وہ بلینک سیل (Blank Sale) ہے، یعنی ایسی بیع جس میں بائع کے پاس نہ تو ملکیت میں شیئرز ہوں، اور نہ اس نے شیئرز کی خریداری کے لئے کسی سے قرض کا معاہدہ کر رکھا ہو، لیکن حاضر سودوں میں شارٹ سیل کی اس شرط کے ساتھ اجازت دے دی گئی ہے کہ بیچنے والا خریدار کو بتادے کہ وہ شارٹ سیل کر رہا ہے اور یہ کہ اس نے وقت پر شیئرز کی ڈیلیوری کے لئے کسی سے قرض لینے کا انتظام کر رکھا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حاضر سودوں میں شارٹ سیل کا امکان موجود ہے، اور اگر بالفرض قواعد کے لحاظ سے شارٹ سیل منع بھی ہو تو اس بات کی گارنٹی نہیں ہے کہ وہ اس قاعدے کی خلاف ورزی نہیں کر رہا۔

اب ظاہر ہے کہ اگر کوئی شخص شارٹ سیل کر رہا ہے، یعنی شیئرز اس کی ملکیت میں نہیں ہیں، پھر بھی بیچ رہا ہے تو نہ صرف یہ کہ "بیع مالا یملك" ہونے کی بناء پر یہ بیع شرعاً

باطل ہے، بلکہ اس سے یہ بھی واضح ہوا کہ جو حضرات یہ کہتے ہیں کہ سودا ہوتے ہی شیئرز کے حقوق و التزامات خریدار کی طرف منتقل ہوجاتے ہیں یا خریدار کے ضمان (Risk) میں آجاتے ہیں، وہ یہ بات شرعی مفہوم میں نہیں کہتے، کیونکہ یہ بات وہ شارٹ سیل کی صورت میں بھی کہتے ہیں، حالانکہ شرعی مفہوم میں شارٹ سیل کی صورت میں ضمان منتقل ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، جب شیئرز بائع ہی کی ملکیت میں نہیں ہیں تو وہ خریدار کو تمکین یا تخلیہ کیسے کرسکتا ہے؟ اور اس سے شرعی مفہوم میں ضمان کیسے منتقل ہوسکتا ہے؟

۳- کراچی اسٹاک ایکسچینج کی طرف سے ہمیں جو قواعد و ضوابط فراہم کئے گئے، ان میں حاضر سودوں کے قواعد و ضوابط (Rules For Ready Delivery Contracts) کی پہلی دفعہ میں یہ کہا گیا ہے کہ تمام حاضر سودوں کا تصفیہ آئندہ ہفتے میں پیر کے دن ہونا ضروری ہے، یعنی پیر کے دن بائع شیئرز کی ڈیلیوری دے گا، اور خریدار اس کی قیمت بائع کو اَدا کرے گا، لیکن اسی دفعہ کی شق بی میں یہ صراحت ہے کہ اگر بائع نے مقرّرہ وقت تک ڈیلیوری نہ دی تو خریدار کو حق ہوگا کہ کسی کمپنی کے جتنے شیئرز اس نے بائع سے خریدے تھے، وہ بازار سے خرید لے (جس کو اسٹاک ایکسچینج کی اصطلاح میں "Buy In" کہا جاتا ہے) اور شق سی میں کہا گیا ہے کہ ایسی صورت میں اگر خریدار کو بازار سے خریداری کرنے میں کوئی نقصان ہو (مثلاً وہ شیئرز بازار سے زیادہ قیمت میں ملیں) تو بائع کا فرض ہوگا کہ وہ خریدار کے نقصان (Damages) کی تلافی کرے۔

یہ قاعدہ واضح طور پر اس بات کا اعتراف ہے کہ سودے کے وقت قبضہ نہیں ہوا تھا، کیونکہ بائع کی طرف سے ڈیلیوری نہ دینا، دو ہی صورتوں میں ممکن ہے، یا تو بائع نے شارٹ سیل کی تھی، یعنی شیئرز کے ملکیت میں ہونے کے بغیر فروخت کردیئے تھے، اس صورت کا بطلان اُوپر نمبر ۲ میں گزر چکا ہے، یا پھر اس نے شارٹ سیل نہ کی تھی، مگر خریدار سے سودا کرنے کے بعد اس کی رائے بدل گئی اور اس نے وہ خود رکھنے یا کسی اور کو بیچ دینے کا فیصلہ کرلیا، جب اس کے لئے رائے بدل کر شیئرز کو خود رکھ لینا یا کسی اور کو بیچنا ممکن ہے تو

یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ سودے کے وقت اس نے خریدار کو تمکین کردی ہے یا اس کے حق میں تخلیہ کردیا ہے؟ نیز اس صورت میں اسٹاک ایکسچینج کے قواعد یہ نہیں کہتے کہ جو شیئرز فروخت کئے گئے تھے بائع کو ان کی ڈیلیوری دینے پر مجبور کیا جائے، بلکہ خریدار کو یہ حق دیتے ہیں کہ وہ بائع کو ڈیلیوری پر مجبور کرنے کے بجائے بازار سے اسی کمپنی کے اسی مقدار میں دُوسرے شیئرز خرید لے، اور اس خریداری میں اسے کوئی نقصان ہو تو بائع کو اس کی تلافی پر مجبور کرے، جس کا حاصل یہ ہے کہ پہلی بیع یک طرفہ طور پر فسخ کرے، اور کسی تیسرے شخص سے نئی بیع کرے۔

۴- اسٹاک ایکسچینج کے حضرات یہ بھی کہتے ہیں کہ حاضر سودوں کے علاوہ فارورڈ سودوں میں بھی حقوق والتزامات فوراً منتقل ہوجاتے ہیں، صرف کمپنی کے ریکارڈ میں نام کی منتقلی حاضر سودوں کے مقابلے میں زیادہ تاخیر سے ہوتی ہے، حالانکہ فارورڈ سودوں میں شارٹ سیل کا رواج حاضر سودوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے، اس سے پتہ چلا کہ یہ حضرات حقوق والتزامات کی جس منتقلی کا ذکر کررہے ہیں وہ شرعی مفہوم میں ضمان کی منتقلی نہیں ہے۔ اور اس سارے مجموعے سے جو بات واضح ہورہی ہے، وہ یہ ہے کہ جس چیز کو اسٹاک ایکسچینج کی اصطلاح میں حاضر سودا کہا جارہا ہے، اس میں سودے کے وقت شرعی مفہوم میں قبضہ متحقق نہیں ہوتا، اور جو حضرات یہ کہتے ہیں کہ سودا ہوتے ہی تمام حقوق و التزامات خریدار کی طرف منتقل ہوجاتے ہیں، وہ اس معنی میں کہتے ہیں کہ اسٹاک ایکسچینج معاملے کو اِنتہاء تک پہنچانے کا ذمہ دار ہے، اور شیئرز کی قیمت بڑھے یا گھٹے، بائع اسی قیمت پر شیئرز کی ڈیلیوری کرنے کا، اور خریدار وہی قیمت ادا کرنے کا پابند ہے، اور اگر کوئی فریق اپنی یہ ذمہ داری پوری نہ کرے اور خریدار کی عدم ادائیگی کی صورت میں بائع کو بازار میں شیئرز فروخت کرنے (Sale Out) میں اور بائع کے قبضہ نہ دینے کی صورت میں خریدار کو بازار سے شیئرز خریدنے میں جو نقصان ہو، دُوسرا فریق اس کی تلافی کا ذمہ دار ہے۔

مذکورہ بالا دلائل کی روشنی میں شرعی حکم یہ ہے کہ شیئرز کے خریدار کے لئے اس

وقت تک شیئرز کو آگے بیچنا جائز نہیں ہے جب تک کہ ڈیلیوری نہ مل جائے۔ اگر بیچنے والے نے شارٹ سیل کی ہے یعنی شیئرز ملک میں لائے بغیر فروخت کئے ہیں تو یہ بیع ہی باطل ہے، اور اگر شیئرز بائع کی ملک میں تھے، اور عقدِ بیع کے ارکان متحقق ہو گئے ہیں تو یہ بیع دُرست ہے، (اسے بیع الکالیٔ بالکالیٔ اس لئے نہیں کہا جا سکتا کہ کمپنی کے شیئرز بائع کی ملکیت میں ہیں اور عین ہیں دین نہیں) لیکن خریدار کے لئے آگے بیع کرنا اسی وقت جائز ہوگا جب اسے باقاعدہ ڈیلیوری مل جائے، لہٰذا اس وقت جس طرح ڈے ٹریڈنگ ہو رہی ہے (جس میں ڈیلیوری سے پہلے شیئرز آگے بیچ دیئے جاتے ہیں) وہ شرعاً جائز نہیں ہے۔

مستقبل کے سودے (Futures)

مذکورہ بالا تفصیل حاضر سودوں کے بارے میں تھی، جنھیں "Spot Sales" یا "Ready Contracts" کہا جاتا ہے۔ جب حاضر سودوں میں صورتِ حال یہ ہے تو مستقبل کے سودوں میں جنھیں Forward یا Future کہا جاتا ہے۔ بطریقِ اَولیٰ یہ حکم ہوگا کہ ڈیلیوری کے بغیر شیئرز کو آگے بیچنا جائز نہیں، اس لئے کہ ان سودوں میں شارٹ سیل کا رواج حاضر سودوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے، اور شارٹ سیل پر جو پابندیاں حاضر سودوں میں ہوتی ہیں، مستقبل کے سودوں میں اتنی پابندیاں نہیں ہیں۔

اسٹاک ایکسچینج کے دورے کے دوران ہمیں یہ بھی بتایا گیا کہ حاضر سودوں اور مستقبل کے سودوں میں اس کے سوا کوئی فرق نہیں ہے کہ حاضر سودوں میں ڈیلیوری جلدی ہو جاتی ہے، اور مستقبل کے سودوں میں دیر سے ہوتی ہے، لیکن خریدے ہوئے شیئرز کے حقوق والتزامات فوراً منتقل ہو جاتے ہیں، لیکن ان حضرات کا یہ بیان اس بات کی دلیل ہے کہ حقوق والتزامات کی منتقلی کا لفظ وہ شرعی مفہوم میں استعمال نہیں کر رہے، بلکہ اس معنی میں استعمال کر رہے ہیں کہ شیئرز کی قیمت ڈیلیوری سے پہلے بڑھے یا گھٹے، ہر صورت میں بائع طے شدہ قیمت پر ڈیلیوری دینے اور خریدار طے شدہ قیمت ادا کرنے کا پابند ہوتا ہے۔

اس صورتِ حال کے پیشِ نظر مستقبل کے سودوں (Forward Sale) یا Future Sale کا حکم یہ ہے کہ:-

۱-اگر بیچنے والے کی ملکیت میں شیئرز نہیں ہیں اور وہ شارٹ سیل یا بلینک سیل کر رہا ہے تو یہ بیع مالا یملک ہونے کی وجہ سے ناجائز اور باطل ہے۔

۲-اگر بیچنے والے کی ملکیت میں شیئرز ہیں اور وہ ان کی ڈیلیوری بھی لے چکا ہے، اور آئندہ کی تاریخ کے لئے آج ہی ایجاب وقبول کے ذریعے بیع کی تکمیل کر رہا ہے، جسے (Forward Sale) کہا جاتا ہے، یعنی بیع آج ہی مکمل ہوگئی ہے، لیکن وہ بیع آئندہ تاریخ کے لئے ہے، تو یہ بیع مضاف الی المستقبل ہونے کی بناء پر ناجائز ہے۔

۳-اگر بیچنے والے کی ملکیت اور قبضے میں شیئرز ہیں (یعنی وہ ان کی ڈیلیوری لے چکا ہے) اور بیع آئندہ تاریخ کے لئے نہیں، بلکہ آج ہی کی تاریخ کے لئے ہوئی ہے، البتہ قیمت اُدھار رکھی گئی ہے کہ خریدار قیمت آئندہ کسی تاریخ پر ادا کرے گا، تو اس صورت میں شیئرز کی ڈیلیوری خریدار کو دینی ہوگی، اور قیمت کی وصولی کے لئے ڈیلیوری دیئے بغیر شیئرز اپنے قبضے میں رکھنا جائز نہیں ہوگا، کیونکہ یہ بیع مؤجل ہے، اور بیع مؤجل میں حبس المبیع لاستیفاء الثمن جائز نہیں ہے۔

فتاویٰ عالمگیریہ میں ہے:-

> قال أصحابنا رحمهم الله تعالیٰ للبائع حق حبس المبیع لاستیفاء الثمن اذا کان حالًا کذا فی المحیط، وان کان مؤجّلًا فلیس للبائع أن یحبس المبیع قبل حلول الأجل ولا بعده، کذا فی المبسوط۔

(فتاویٰ عالگمیریة ج:۳ ص:۱۵، باب:۴ من کتاب البیوع)

۴-اگر بیچنے والے کی ملکیت اور قبضے میں شیئرز ہیں، اور وہ آج کی تاریخ ہی کے لئے خریدار کو بیچ رہا ہے، اور ان کی ڈیلیوری بھی خریدار کو دیتا ہے، لیکن قیمت، آئندہ تاریخ

کے لئے اُدھار رکھی گئی ہے اور خریدار کو ڈیلیوری دینے کے بعد پھر وہی شیئرز (جو خریدار کے نام منتقل ہو چکے ہیں) اپنے پاس گروی رکھ لیتا ہے تو یہ صورت جائز ہے۔

علامہ حصکفی رحمہ اللہ، الدرالمختار میں فرماتے ہیں:-

ولو كان ذلك الشيء الذي قال له المشتري: أمسكه، هو المبيع الذي اشتراه بعينه لو بعد قبضه، لأنه حينئذ يصلح أن يكون رهنًا بثمنه، ولو قبله لا يكون رهنًا، لأنه محبوس بالثمن۔

علامہ ابنِ عابدین شامی رحمہ اللہ اس کے تحت فرماتے ہیں:-

قوله: لأنه حينئذ يصلح ... الخ أي لتعيين ملكه فيه، حتّى لو هلك يهلك على المشتري، ولا ينفسخ العقد ط قوله "لأنه محبوس بالثمن" أي وضمانه يخالف ضمان الرهن، فلا يكون مضمونًا بضمانين مختلفين .... الخ۔

(ردّ المحتار، كتاب الرهن ج:٦ ص:٤٩٧)

صورت نمبر ۳ اور صورت نمبر ۴ کا فرق بھی علامہ ابنِ عابدین رحمہ اللہ کی اس عبارت میں موجود ہے، اس کی مزید وضاحت بندہ کی کتاب "بحوث في قضايا فقهية معاصرة" (ص:۱۶ تا ۱۸، طبع دارالقلم دمشق) میں دیکھی جا سکتی ہے۔

۵- پانچویں صورت یہ ممکن ہے کہ بیچنے والے کی ملک اور قبضے میں شیئرز ہیں، اور وہ بیع ابھی نہیں کرتا، بلکہ ایک خاص قیمت پر آئندہ بیچنے کا وعدہ کرتا ہے، اور خریدار آئندہ اس قیمت پر خریدنے کا صرف وعدہ کرتا ہے، بیع ابھی مکمل نہیں ہوتی، علمائے معاصرین کی ایک بڑی جماعت (جس میں مجمع الفقه الاسلامي جدة بھی داخل ہے) دوطرفہ وعد ملزم کو بھی عقد کے حکم میں قرار دے کر اسے ناجائز قرار دیتی ہے، اور جن فقہاء نے بعض معاملات (مثلاً بیع بالوفاء) میں وعد ملزم کو جائز قرار دیا ہے، وہ بھی اسے حاجتِ عامہ سے

مشروط مانتے ہیں، چنانچہ فتاویٰ قاضی خان میں ہے:۔

لأن المواعدة قد تكون لازمة فتجعل لازمة لحاجة الناس۔ (الفتاویٰ الخانیة ج:۲ ص:۱۶۵)

مذکورہ صورت میں کوئی ایسی حاجت نظر نہیں آتی جس کی وجہ سے کوئی حرجِ عام لازم آئے، بلکہ اسٹاک ایکسچینج میں سٹہ بازی کے رُجحان کو روکنے کے لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ''وعدہ'' غیر ملزم ہی رہے، لہٰذا اگر دونوں فریق وعد غیر ملزم (Non-Binding Promise) کرلیں تو یہ جائز ہے، اس صورت میں اگر کوئی فریق وعدے کو پورا نہ کرے تو وہ دیانۃً تو گناہگار ہوگا، لیکن قضاءً اُسے مجبور نہ کیا جاسکے گا۔

بدلہ کے معاملات

اسٹاک ایکسچینج میں بدلہ کے معاملات اس طرح ہوتے ہیں کہ بعض اوقات ایک شخص بہت سے حصص خرید لیتا ہے، مگر قیمت ادا کرنے کے لئے اس کے پاس رقم نہیں ہوتی، ایسی صورت میں وہ خریدے ہوئے حصص کسی تیسرے شخص کو اس شرط کے ساتھ بیچ دیتا ہے کہ وہ ایک طے شدہ مدّت کے بعد خریدار سے وہی حصص زیادہ قیمت پر خرید لے گا، مثلاً الف نے ب سے یکم اپریل کو ایک لاکھ روپے کے دس ہزار حصص خریدے، لیکن اس کے پاس ایک لاکھ روپے نہیں ہیں، لہٰذا وہ یہ دس ہزار حصص ج کو اس شرط کے ساتھ بیچتا ہے کہ ۱۳/اپریل کو وہ یہی حصص ایک لاکھ دو ہزار روپے میں واپس خرید لے گا۔

اس طریقِ کار میں شرعی اعتبار سے دو خرابیاں ہیں، ایک یہ کہ عموماً بدلے کا یہ معاملہ ڈیلیوری سے پہلے کیا جاتا ہے، جس کے بارے میں پیچھے بیان کیا جاچکا ہے کہ وہ بیع قبل القبض ہونے کی بناء پر ناجائز ہے۔ دُوسرے ج کو جو شیئرز بیچے جارہے ہیں وہ زیادہ قیمت پر واپس خریدنے کی شرط کے ساتھ بیچے جارہے ہیں، یہ شرط فاسد ہے، جو بیع کو فاسد کردیتی ہے، اور درحقیقت اس کا مقصد ایک لاکھ روپے لے کر ایک لاکھ دو ہزار روپے

واپس کرنا ہے جو سود کی ایک شکل ہے، جس کے لئے اس بیع فاسد کو بہانہ بنایا گیا ہے، اس لئے بدلہ کے یہ معاملات بھی شرعاً ناجائز ہیں۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم وعلمہٗ اَتم واَحکم

بندہ محمد تقی عثمانی عفی عنہ

جامعہ دار العلوم کراچی ۱۴

۲۱ر صفر المظفر ۱۴۲۶ھ مطابق ۲؍اپریل ۲۰۰۵ء



اِختتامیہ

اللہ جل شانہٗ کے فضل وکرم اور اس کی توفیق سے ''زر'' (Money) کے مختلف پہلوؤں سے متعلق حتی المقدور اس مقالے میں بحث کی گئی، زمانے کی ترقی اور معاشی دائرے کے وسیع ہونے کی وجہ سے ''زر'' کا مفہوم بھی بہت وسیع ہوگیا، پہلے زمانے میں زیادہ تر زر کا اِطلاق صرف سونے یا چاندی یا دِرہم ودِینار پر ہوتا تھا، اور اس کے ساتھ فلوس بھی زر کی کیٹگری میں شمار ہوتے تھے، لیکن تجارتی اور معاشی ترقی نے زر کی نئی شکلیں متعارف (Intruduced) کرائی، جن میں کریڈٹ منی کی مختلف قسمیں سامنے وجود میں آگئیں، اور ان قسموں کے ساتھ لین دین ہونے لگا، جس کی تفصیل آخری باب میں گزر گئی۔

اس مقالے کے مباحث میں سب سے زیادہ قابلِ توجہ اور حاملِ اہمیت مسائل میں سے ''زر کی حقیقت'' (The Nature of Money) ہے، کیونکہ موجودہ بینکنگ اور مالیاتی سسٹم میں زر ہی کو آلہ تجارت (Tradable) قرار دیا گیا ہے، زر کے اس خلافِ فطرت استعمال نے مختلف قسم کی معاشی اور شرعی مفاسد پیدا کیے، جن میں سب سے بنیادی خرابی سود کی ہے۔

مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب فرماتے ہیں:-

One of the most important characteristics of islamic financing is that it is an asset-backed financing. The conventional / capitalist concept of financing is that the banks and financial institution deal in money and monetary papers only. That is why they are forbidden, in most countries, from

trading in goods and making inventories. Islam, on the other hand, does not cecognize money as a subject-matter of trade..... In conventional financing, the financier gives money to his client as an interest-bearing loan, after which he has no concern as to how the money is used by the client.(1)

اِمام غزالی رحمہ اللہ نے زَر کو خلافِ فطرت اِستعمال کرنے کو ظلم قرار دیا ہے:-

اور جس نے بھی دَراہم ودَنانیر میں سود کا معاملہ کیا تو اس نے نعمتِ خداوندی کی ناشکری کی اور ظلم کیا، کیونکہ ان دونوں کی تخلیق اپنے لئے نہیں بلکہ غیر کے لئے ہے، کیونکہ یہ دونوں مقصود بالذات نہیں، چنانچہ جب کوئی شخص ان دونوں میں تجارت کرے گا، تو اس نے ان دونوں کو اس حکمت سے ہٹایا، جس کے لئے ان کی تخلیق ہوئی تھی:-

"إذ طلب النقد لغير ما وضع له ظلم"

کیونکہ زَر کو ایسی چیز کے لئے لینا جس کے لئے یہ پیدا نہیں ہوا ہے، ظلم ہے۔(۲)

گویا زَر کے ساتھ عام اشیاء سا سلوک کرنا، اور اس کو محلِ تجارت (Tradable) بنا دینا ظلم ہے، زَر کے معاملے میں اِنصاف یہی ہے کہ جس مقصود کے لئے اس کی تخلیق ہوئی ہے، اسی مقصود میں اس کو اِستعمال کیا جائے۔

اسی طرح اہم مسائل میں سے "نوٹ کی شرعی حیثیت" ہے، جس میں علماء کا اِختلاف ہے، لیکن راجح قول یہی ہے کہ یہ بذاتِ خود ثمنِ عرفی (Comstomary Price) ہے۔

---

(1) An Introduction to Islamic Finance. p:20.

(۲) إحياء علوم الدين، الغزالي (الإمام ابو حامد محمد بن محمد الغزالي م ۵۰۵ھ) بيروت، لبنان، دارالمعرفة (۴/۹۱)-

نیز اہم مسائل میں سے زَر کا باہمی تبادلہ، اور زَرِ اعتباری کی چند قسمیں مثلاً: چیک، بل آف ایکسچینج، بانڈز اور مختلف قسم کے سرٹیفکیٹس ہیں، جن پر آٹھویں باب میں الحمدللہ سیر حاصل بحث کی گئی، اگرچہ ان آلات میں سے ہر آلہ ایسا ہے، جس کی مختلف اقسام، ان کی تعریفات، حقائق، شرائط اور اَحکام پر مستقل مقالہ تیار ہوسکتا ہے، مثلاً بانڈز کی بے شمار قسمیں ہیں، اور ان کے بے شمار متعلقات ہیں، اسی طرح شیئر سرٹیفکیٹ پر مستقل اور ضخیم مقالہ تیار ہوسکتا ہے، چنانچہ مجمع الفقہ الاسلامی جدہ کے مجلّات (جن میں سے بعض کا حوالہ گزشتہ مباحث میں دیا گیا ہے) سندات اور سہم (Shares) پر باقاعدہ مقالے لکھے گئے ہیں۔

نیز مقالے کے اُصول کے مطابق ہم نے اصل باب میں ذکر کردہ عنوانات سے متعلق موقوف علیہ مباحث بھی اختصاراً ذِکر کیے ہیں، مثلاً بیعِ صَرف، بیع الدین اور حوالہ وغیرہ کے مسائل، کیونکہ ان پر زر کے بہت سارے مسائل موقوف ہیں۔

اور آخر میں اور اسی طرح درمیان میں بعض جگہ ضمائم (Appendices) اور مختلف فوائد بھی ذِکر کیے ہیں، کیونکہ ان کی وہاں پر ضرورت محسوس کی گئی ہے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ ربّ العالمین، اللہ تعالیٰ اس حقیر کوشش کو شرفِ قبولیت عطا فرمائیں، اور ہر کام اور عمل میں خلوص عطا فرمائیں، آمین۔



مراجع ومصادر

(Biblography)

الف

❋ احکام الأوراق النقدیة الجعید (ستر بن ثواب الجعید) الطائف، مکتبة الصدیق، طبع اول

❋ اسلام اور جدید معیشت و تجارت، ادارة المعارف کراچی ۱۴، طبع اوّل ۱۴۱۹ھ

❋ اعلام الموقعین عن رب العالمین، ابن قیّم الجوزیة (علّامة شمس الدین ابو عبدالله محمد بن ابی بکر المعروف بابن الجوزیة، المتوفّٰی ۷۵۱ھ) مصر، ادارة الطباعة المنیریة

❋ إحیاء علوم الدّین، الغزالی (الإمام ابو حامد محمد بن محمد الغزالی م ۵۰۵ھ) بیروت، لبنان، دارالمعرفة

❋ إقتصادیات النقود، متولی (الدکتور أبوبکر الصدیق عمر متولی) قاهرة، مکتبة وهبة، طبع اول ۱۴۰۳ھ

❋ أحکام القرآن، ابن العربی (أبوبکر محمد بن عبدالله المعروف بابن العربی، متوفّٰی ۵۴۳ھ) بیروت، دار المعرفة، طبع سوم ۱۳۹۲ھ

❋ ابن ماجة والحاکم

❋ إمداد الفتاویٰ، تهانوی (حضرت مولانا اشرف علی تهانویؒ) کراچی، مکتبه دارالعلوم کراچی ۱۴

❋ ابحاث هیئة کبار العلماء بالمملکة العربیة السعودیة، طبع اول ۱۴۰۹ھ

* اقرب الموارد، الشرتونی (علّامة سعید الخوری الشرتونی) لبنان، دار الاسوة للطباعة والنشر، طبع اول ۱۳۷۴ھ
* ابو داود فی کتاب البیوع، باب ۱۲، ۱۷، الترمذی فی کتاب البیوع، باب ۴۲-۴۴۔
* إعلاء السنن، العثمانی (علّامه ظفر احمد العثمانی) کراتشی، إدارة القرآن والعلوم الإسلامية
* احسن الفتاویٰ، لدھیانوی (مفتی رشید احمد صاحب) کراچی، ایچ ایم سعید، پاکستان چوک، طبع اول ۱۴۱۵ھ
* البلاغ، شمارہ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۲ھ دارالعلوم کراتشی ۱۴
* ایضاح المسالك، الونشریسی (ابو العباس احمد بن یحییٰ) متحدہ عرب إمارات، رباط، التراث الإسلامی، طبع اول ۱۹۸۰ء
* الانصاف، المرداوی (علاء الدین ابی الحسن علی بن سلیمان) طبع اول ۱۳۷۶ھ
* اوجز المسالك، الكاندھلوی (شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا) ملتان، ادارہ تالیفات اشرفیہ

ب

* بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع، الكاسانی (العلّامة علاء الدین ابوبکر الكاسانی) کراچی ایچ ایم سعد، طبع اول ۱۳۲۸ھ
* بخاری، کتاب الطّلاق
* البحر الرّائق شرح کنز الدّقائق، ابن نجیم (الشیخ العلّامة زین الدین بن ابراهیم متوفّی ۹۷۰ھ) بیروت، دار الکتب العلمیة، طبع اول ۱۴۱۸ھ
* بلوغ الامانی علی الفتح الربانی، الساعاتی (احمد عبدالرحمٰن البنا) مصر، مطبعة الفتح الربانی، طبع اول ۱۳۵۶ھ
* بهجة المشتاق بحواله احکام الأوراق النقدية للجعيد
* بهشتی زیور التهانوی (مولانا اشرف علی) کراچی، دار الاشاعت، آرام باغ

* البنك اللاربوی فی الإسلام، السید محمد باقر الصدر، بیروت، دارالتعارف، طبع ششم، ۱۴۰۰ھ
* البلاغ، شمارہ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۲ھ دارالعلوم کراچی ۱۴
* بحوث فی قضایا فقهیة معاصرة، العثمانی (محمد تقی العثمانی) کراتشی، مکتبه دارالعلوم کراتشی، طبع جدید ۱۴۲۶ھ
* بحوث فی الربا، الإمام ابو زهرة، بیروت، دار الفکر العربی۔

ت

* تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق، الزیلعی (الإمام فخرالدین عثمان بن علی الزیلعی الحنفی) بیروت، دار الکتب العلمیة، طبع اول ۲۰۰۰ء "یعنی إذا وجد معدن ذهب أو فضة وهو المراد بالنقد أو حدید ...الخ۔"
* تحفة المحتاج، الهیتمی (العلّامة ابن الحجر الهیتمی الشافعی)
* تحریر الفاظ التنبیه، النووی (محی الدین یحیٰی بن شرف النووی) دمشق، دارالقلم، طبع اول ۱۴۰۸ھ
* تعارف زَر و بنکاری، شیخ مبارک علی، ریسرچ سکالر اوسلو یونیورسٹی، ناروے، رهبر پبلشرز کراچی، طبع اول ۱۹۹۱ء
* تطور النقود فی ضوء الشریعة الإسلامیة، الحسنی (الدکتور احمد حسن احمد الحسنی) جدة، دار المدنی، طبع اول ۱۴۱۰ھ
* تکملة فتح الملهم شرح صحیح مسلم (جسٹس مفتی محمد تقی عثمانی) کراچی، مکتبه دارالعلوم کراچی ۱۴ طبع اول ۱۴۰۵ھ
* تلخیص الحبیر، العسقلانی (علّامة ابن حجر العسقلانی المتوفّٰی ۸۵۲ م) الریاض، مکتبة نزار مصطفی الباز، طبع اول ۱۴۱۷ھ
* تهذیب الأسماء واللغات، النووی (ابو زکریا محی الدین بن شرف النووی المتوفّٰی ۶۷۶ھ) مصر، ادارة الطباعة المنیریة

* تنویر الابصار متن الدر المختار، التمرتاشی (محمد بن عبدالله بن احمد الخطیب التمرتاشی الغزی المتوفّٰی ۹۳۹ھ) بیروت، دار إحیاء التراث العربی، طبع اول ۱۴۱۹ھ
* تحفة الفقهاء، السمرقندی (علّامة علاء الدین المتوفّٰی ۵۳۹ھ) دمشق، مطبعة جامعة دمشق، طبع اول ۱۳۷۷ھ
* تنبیه الرقود علی مسائل النقود، ضمن رسائل ابن عابدین، لاهور، پاکستان، سهیل اکیڈمی ۱۹۷۶ء
* تحفة المحتاج مع حاشیة الشروانی، الهیتمی (علّامة احمد بن حجر الهیتمی الشافعی)
* تدریب الراوی للسیوطی ص:۲۵ طبع المدینة المنوّرة

ج

* جدید فقهی مباحث، قاسمی (مولانا مجاهد الاسلام قاسمی) کراچی، إدارة القرآن والعلوم الإسلامیة، جلد دوم
* جهاد فی رفع بلو الربا، الشیخ (محمد خاطر محمد الشیخ) مصر، مطابع الاهرام التجاریة، القاهرة
* جریدة البلاد السعودیة، العدد:۲۹۱۷ (۱۳۷۸/۶/۲۲ھ)
* جامع الاصول، ابن الأثیر الجزری (الإمام مجدالدین ابی السعادات المبارك بن محمد المتوفّٰی ۶۰۶ھ) حلوان، مکتبة الحلوانی، طبع ۱۳۸۹ ھ

ح

* حواشی الشروانی بن قاسم العبادی
* الحاوی للفتاویٰ، السیوطی (علّامة جلال الدین عبدالرحمٰن بن ابی بکر السیوطی المتوفّٰی ۹۱۱ھ) بیروت، المکتبة العصریة، طبع اول ۱۴۱۱ھ
* حاشیة الدسوقی

* حاشیۃ جامع الاسرار فی المنار للنسفی للکاکی، الافغانی (فضل الرحمٰن عبدالغفور الأفغانی)
* حکمۃ التشریع الإسلامی فی تحریم الربا، ڈاکٹر یوسف حامد العالم، دار جامعۃ ام درمان الإسلامیۃ، طبع اول ۱۴۰۳ھ

خ

* الخرشی علی سیدی خلیل، الخرشی (محمد الخرشی المالکی) بیروت، دار الصادر
* الخیار واثرہ فی العقود، ابو غدۃ (الدکتور عبدالستار ابو غدۃ) الکویت، مطبعۃ مقھوی، طبع دوم ۱۴۰۵ھ

د

* الدر المختار للحصکفی شرح تنویر الابصار للتمرتاشی ومتن رد المحتار لابن عابدین المعروف بالشامی
* دائرۃ معارف القرآن، وجدی (محمد فرید وجدی) مطبعۃ دائرۃ معارف القرآن ۱۳۵۷ھ
* الدرایۃ فی تخریج احادیث الھدایۃ، العسقلانی (العلّامۃ ابن حجر العسقلانی المتوفّٰی ۸۵۲ھ) پنجاب، شیخوپورہ، المکتبۃ الاثریہ، پاکستان

ر

* الربا خطرہ وسبیل الخلاص منہ، الحماد (الدکتور حمد بن عبدالعزیز الحماد)، مصر، مطبعۃ المدنی، طبع اول ۱۴۰۴ھ
* رد المحتار الشامی (محمد امین بن عابدین الشامی م ۱۲۵۲ھ) مطبع مذکورہ، طبع اول ۱۴۱۹ھ
* روضۃ الطالبین، النووی (علّامۃ محی الدین بن شرف النووی) بیروت، المکتب الإسلامی، طبع م ۱۴۰۵ھ
* رسالۃ بحث ونظر ص:۱۱۵، شمارہ اپریل، مئی، جون، ۱۹۹۰ء

ز

* زَر اور بنکاری، شیخ عطاء اللہ، لاهور، کشمیر بازار، طبع اول ۱۹۵۴ء
* زاد المحتاج شرح المنهاج، الکوهجی (الشیخ عبدالله بن الشیخ حسن الحسن الکوهجی) قطر، طبع اول ۱۴۰۲ھ

س

* السیاسیة النقدیة والمصرفیة فی الإسلام، الترکمانی (الدکتور عدنان خالد الترکمانی)، بیروت، مؤسسة الرسالة، طبع اول ۱۴۰۹ھ
* سود کی متبادل اساس، شیخ محمود احمد، ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور، طبع اول ۱۹۸۶ء
* سورة البقرة آیت:۲۷۶
* سنن ابی داود
* سورة الشعراء آیت: ۱۸۱
* سورة هود آیت:۸۵
* سورة التطفیف
* سونا چاندی اور ان کے زیورات کے اسلامی احکام، مؤلفہ ڈاکٹر مفتی عبدالواحد سے لئے گئے ھیں، دارالافتاء جامعہ مدنیہ، کریم پارک، راوی روڈ، لاهور پاکستان
* سنن ابی داود، السحستانی (سلیمان بن الاشعث بن اسحاق السجستانی) البیوع

ش

* شرح الصاوی للشیخ محمد ابراهیم المبارك، بحواله احکام الأوارق النقدیة والتجاریة للجعید
* شرح الحافظ ابن القیم علیٰ سنن ابی داود مع عون المعبود، بیروت، دار الکتب العلمیة

* شرح منح الجليل (علّامة محمد عليش)
* الشرح الصغير على اقرب المسالك إلىٰ مذهب الإمام مالك، الدردير (العلّامة ابو البركات احمد بن محمد بن احمد الدردير) مصر، دار المعارف
* شرح المجلة، الاتاسي (العلّامة محمد خالد الاتاسي) پاکستان، کوئٹه، مکتبه اسلاميه

ص

* صحيح مسلم، القشيرى (ابو الحسين مسلم بن الحجاج القشيرى) باب المساقاة
* صحيح البخارى، البخارى (ابو عبدالله محمد بن اسماعيل البخارى) کتاب المساقاة

ط

* الطبرانى الكبير، الطبرانى (سليمان بن احمد م ٣٦٠هـ)

ع

* عقد الجواهر الثمينة، ابن شاس (جلال الدين عبدالله بن نجم ابن شاس المتوفّى ٦١٦هـ) دار الغرب الإسلامى، طبع اول ۱۴۱۵هـ
* عزيز الفتاوىٰ، مفتى عزيزالرحمٰن صاحب، كراچى، دار الاشاعت كراچى، طبع اول ص: ٦٣٦
* عطر الهداية، لكهنوى (بحر العلوم مولانا فتح محمد صاحب لكهنوى) مكتبه نشر القرآن ديوبند، يوپى، هندوستان
* عقود التوريد والمناقصة، مخطوطه، جامعه دارالعلوم كراچى
* العقود الدرية فى تنقيح الفتاوىٰ الحامدية، شامى (علّامة محمد امين المعروف بابن عابدين) بيروت، دارالمعرفة، طبع دوم

ف

* فتاوىٰ رشيديه، مولانا مفتى رشيد احمد گنگوهى

* فتاویٰ رضویہ، بریلوی (مولوی احمد رضا خان بریلوی) کراچی، مدینہ پبلشنگ کمپنی، ایم اے جناح روڈ کراچی

* فتح القدیر شرح الهدایة، ابن الهمام (الإمام محمد بن عبدالواحد بن الهمام) کوئٹه، مکتبه رشیدیه

* فتوح البلدان، البلاذری، (احمد بن یحیی البلاذری) القاهرة، مکتبة النهضة المصریة

* الفقه الإسلامی وادلته، الزحیلی (الدکتور وهبه الزحیلی) بیروت، دار الفکر

* الفتاویٰ السعدیة، السعدی (الشیخ عبدالرحمٰن الناصر السعدی) السعودیة، الریاض، مکتبةُ المعارف، طبع دوم ۱۹۸۲ء

* الفتاویٰ العالمگیریة، جماعة من العلماء الکبار، کوئٹه، مکتبه رشیدیه، طبع دوم، ۱۴۰۲ھ

* الفتاویٰ الخانیة علیٰ هامش العالمگیریة

* الفروع لابن مفلح

* فقهی مقالات، عثمانی (جسٹس مفتی محمد تقی عثمانی) کراچی، میمن اسلامك پبلشرز کراچی ۱۹۹۴ء

ق

* القاموس الفقهی لغة واصطلاحا، سعدی ابو حبیب

* القوانین الفقهیة، الجزی (ابو القاسم محمد بن محمد احمد الجزی المالکی متوفّٰی ۷۴۱ھ) بیروت، دار القلم، طبع اول ۱۹۷۷ء

* قرارات، قرار ۴۱/۴ جدة، السعودیة العربیة

* القاموس الإقتصادی، النجفی (حسن النجفی) بغداد، مدیریة مطبعة الإدارة المحلیة ۱۹۷۷م

ك

* کشف الخفاء، الجراحی (اسماعیل بن محمد العجلونی الجراحی م ۱۱۶۳ھ) بیروت، مؤسسة الرسالة، طبع سوم ۱۴۰۳ھ (۱۶۳/۲)

❊ کنز الدقائق مع البحر، النسفی (الإمام ابو البرکات عبداللہ بن احمد بن محمود المعروف بحافظ الدین النسفی المتوفّٰی ۷۱۰ھ) بیروت، دار الکتب العلمیة، طبع اول ۱۴۱۸ھ

❊ کتاب معاشیات، پروفیسر محمد منظور علی، طبع ۱۹۸۲ء علمی کتاب خانہ

❊ کاغذی نوٹ اور کرنسی کا حکم، عثمانی (جسٹس مفتی محمد تقی عثمانی) کراچی، میمن اسلامک پبلشرز، طبع اول ۱۹۹۳ء

❊ کتاب سود کی متبادل اساس، شیخ محمود احمد، ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور، طبع اول ۱۹۸۶ء

❊ کنز العمال، المتقی (علاء الدین علی المتقی الهندی) عدد الحدیث ۴۲۶۹

❊ کفل الفقیه الفاهم فی احکام القرطاس والدراهم، بریلوی (مولوی احمد رضا خان بریلوی) لاهور، شبیر برادرز، اردو بازار لاهور

❊ کتاب الروایتین والوجهین لابی یعلی

❊ کشاف القناع، البهوتی (العلّامة منصور بن یونس المتوفّٰی ۱۰۵۱ھ) السعودیة العربیة، مطبعة الحکومة بمکة ۱۳۹۴ھ

❊ کتاب الکافی فی فقه اهل المدینة المالکی، القرطبی (ابو عمر یوسف بن عبداللہ بن محمد بن عبدالبر النمر القرطبی) السعودیة، الریاض، مکتبة الریاض الحدیثیة، طبع دوم ۱۴۰۰ھ

❊ الکافی، ابن قدامة المقدسی، بیروت، المکتب الإسلامی، طبع سوم ۱۴۰۲ھ (۱۲۵/۲)

❊ کشف القناع عن متن الاقناع، البهوتی (منصور بن یونس البهوتی المتوفّٰی ۱۰۴۲ھ) مکة المکرمة، مکتبة الحکومة ۱۳۹۴ھ

ل

❊ لسان العرب، ابن المنظور متوفّٰی ۷۱۱ھ، بیروت دار إحیاء التراث العربی، طبع اول ۱۴۰۸ھ

م

- مجمع الزوائد، الهيتمي (الحافظ نور الدين علي بن ابي بكر الهيتمي م ۸۰۷ھ) بیروت، لبنان، دار الکتاب، طبع دوم ۱۹۶۷ء
- مجلة مجمع الفقه الإسلامي، العدد السابع، ۲/۲۱۷، قرار رقم ۶۶/۲/۷ فقرہ۳، بحوالہ "بحوث" فی قضایا فقهية معاصرة المجلد الثاني
- مجلة مجمع الفقه الإسلامي الدورة السادسة، العدد السادس، الجزء الثاني ص:۷۲۵، قرار رقم ۶۲/۱۱/۷
- المغني والشرح الكبير، ابن القدامة (عبدالله بن قدامة) السعودية، مكتبة الرياض، ۱۴۰۳ھ
- مجموع الفتاوىٰ ابن تيمية (شيخ الإسلام احمد بن تيمية) السعودية، مطابع الرياض، طبع اول ۱۳۸۳ھ
- مقدمة في النقود والبنوك، الدكتور محمد زكي شافعي، بيروت، دار النهضة العربية، طبع هفتم
- المؤطا للإمام محمد رحمه الله، باب الرجل يكون له العطايا أو الدَّين على الرجل فيبيعه
- المعايير الشرعية ص:۱۵، ۱۴۲۱ھ هيئة المحاسبة والمراجعة، بحرين
- مجموعة الفتاوىٰ ابن تيمية (شيخ الإسلام احمد بن تيمية) السعودية، مطابع الرياض، طبع اول ۱۳۸۲ھ
- مغني المحتاج، الشربيني (الشيخ محمد الشربيني الخطيب) بيروت، دار إحياء التراث العربي
- المدونة الكبرىٰ، الاصبحي (الإمام مالك بن انس الاصبحي المتوفّٰى ۱۷۹ھ) بيروت، دار الكتب العلمية، طبع اول ۱۴۱۵ھ
- المجموع شرح المهذب، النووي (الإمام ابو زكريا محي الدين بن شرف النووي) بيروت، دار الفكر

* المعیار المعرب، الونشریسی (احمد بن یحیٰی المتوفّٰی ۹۱۴ھ) بیروت، دار الغرب الإسلامی ۱۴۰۱ھ
* مجمع الانہر فی شرح ملتقی الابحر، الشیخی زادہ (العلّامة عبدالرحمٰن بن محمد بن سلمان المتوفّٰی ۱۰۷۸ھ) بیروت، دار الکتب العلمیة، طبع اول ۱۴۱۹ھ (۱۶۱/۳)
* مجلة مجمع الفقه الإسلامی، الدورة الخامسة، العدد الخامس، الجزء الثالث ۱۴۰۹ھ
* المتطلبات الشرعیة لصیغة المرابحة للآمر بالشراء، بحرین (۱۶)
* معاشیات، حبیب الرحمٰن، مکتبہ فریدی، اردو کالج اسپتال روڈ، طبع اول ۱۹۵۳ء
* معاشیات، پروفیسر محمد منظور علی، لاہور، علمی کتب خانہ، حصہ دوم ص:۱۲۷
* معاشیات کے ابتدائی اصول، لاہور، قومی کتب خانہ، طبع سوم ۱۹۵۴ء ص:۲۶۴
* المعاملات المالیة المعاصرة فی الفقه الإسلامی، الدکتور محمد عثمان شبیر، اردن، دار النفائس، طبع سوم ۱۴۱۹ھ
* مسلم، کتاب المساقاة
* مصنَّف عبدالرزاق
* المبسوط، السرخسی (شمس الدین السرخسی) بیروت، دار المعرفة، ۱۴۱۴ھ
* مجموعة الفتاویٰ، لکھنوی (مولانا عبدالحی) کراچی، ایچ ایم سعید، پاکستان چوک
* مجلة البحوث الإسلامیة، العدد الاول من المجلد الاول
* مسئلہ سود (ص:۱۵) ادارۃ المعارف کراچی طبع جدید ۱۳۹۹ھ
* مستدرک حاکم، الحاکم، (محمد بن عبدالله الحاکم م ۴۰۵ھ) بیروت، دار الکتب العلامیة ۱۴۱۱ھ
* مسند احمد بن حنبل
* مباحث العلة فی القیاس عند الاصولیین، الهیتی (عبدالحکیم عبدالرحمٰن السعد السعدی الهیتی العراقی) بیروت، لبنان، دار البشائر الإسلامیة، طبع اول ۱۴۰۶ھ
* المقدمات الممهدات؛ ابن رشد المالکی (ابو الولید محمد بن احمد القرطبی م۵۲۰ھ)

* المحلی، ابن حزم (ابو محمد علی بن احمد بن سعید ابن حزم، م ۴۵٦ھـ) (۴٦۸/۸) ادارة الطباعة المنيرية، مصر، طبع اول ۱۳۵۰ھ
* المغرب في ترتيب المعرب، المطرزی (ابو الفتح ناصر الدين عبدالسيد بن علی المطرزی المتوفّٰی ٦۱٦ھ) بيروت، دار الكتب العربی
* موسوعة المصطلحات الإقتصادية والإحصائية، هيكل (الدكتور عبدالعزيز فهمی هيكل) بيروت، دار النهضة العربية ۱۹۸۰م

ن

* نصب الراية، الزيلعی (العلّامة جمال الدين ابو محمد عبدالله الزيلعی الحنفی المتوفّٰی ۷٦۲ھ) لبنان، مؤسسة الريان، طبع اول ۱۴۱۸ھ
* النقود الائتمانية، العمر (ابراهم بن صالح العمر) بيروت، دار العاصمة ۱۴۱۲ھ
* نسمات الاسحار على المنار، الشامی (علّامة ابن عابدين الشامی) کراچی، ادارة القرآن والعلوم الإسلامية، طبع سوم ۱۴۱۸ھ
* نيل الاوطار، الشوكانی (محمد بن علی بن محمد الشوكانی، م ۱۲۵۵ھ)
* نهاية المحتاج إلى شرح المنهاج، الرملی (شمس الدين محمد بن ابی العباس الرملی المتوفّٰی ۱۰۰۴ھ) بيروت، إحياء التراث العربی

ه

* الهداية مع الفتح، المرغينانی (شيخ الإسلام برهان الدين ابو الحسن ابوبكر المرغينانی المتوفّٰی ۵۹۳ھ) کوئٹہ، پاکستان، مکتبہ رشیدیہ

English Books

A

- An Introduction to Islamic Finance

E

- Encyclopaedia of Britannica V:3, p:722

F

- Footnotes on Introduction to Economics Principles

G

- Glossary; Banking and Finance, Englihs-English-Urdu, Shakil Faruqi Student Edition, State Bank of Pakistan, Institute of Bankers Pakistan, Lahore School of Economics

H

- The Historic Judgment on Interest, Usmani, (Justice Muhammad Taqi Usmani) Karachi, Idartul-Ma'arif, 1st edition, 2000 A.D

I

- Introduction to Economics Principles, Dr. A. N. Agarawal, Kitab Mahal, 1983

M

- Modern Economics Theory, Dewett, Kewal, Krishan, India Delhi, Eighteen revised edition, 1983, p:409

N

* The New Encyclopaedia Britannica v:10, p:595

S

* Shari'a Standards 1423 AH. 2002, Accounting and Auditing Organization for Islamic Financial Institutions

T

* The Theory of Money and Credit. Mises, Ludwig Von Mises

تکافل کی
شرعی حیثیت

مروجہ انشورنس کا جائز متبادل

ڈاکٹر مولانا عصمت اللہ صاحب

تقریظ
حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مدظلہم



پاک قطر فیملی اور جنرل تکافل

ادارۃ المعارف کراچی ۱۴